ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ



# مسائلِ نو

ادارہ معارف اسلامیہ کیمبل پور

(۳)

# مسائلِ نو

("جہانِ نو" کا تازہ ایڈیشن جس میں صرف چار پرانے اور تیرہ نئے مضامین ہیں)

---

:- غلام جیلانی برق :-

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ——— پشاور ——— حیدرآباد ——— کراچی

سلسلہ مطبوعات ۳۰۲

طابع ------ شیخ نیاز احمد

مطبع ------ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ------ 8.00 روپے

طبع چہارم ------ ۱۹۶۴ء

طبع اوّل — طبع دوم — طبع سوم

۱۹۴۹ء — ۱۹۵۱ء — ۱۹۵۳ء

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز کشمیری بازار لاہور

# شکریہ

ادارہ معارفِ اسلامیہ کیمبلپور کے سلسلے میں یہ حضرات خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔

۱۔ بانیٔ ادارہ ......... سیّد خالد محمود۔ سی۔ ایس۔ پی

۲۔ موجودہ سرپرست ...... میجر محمّد اشرف۔ ڈپٹی کمشنر۔ کیمبلپور

۳۔ صدر ......... پرنسپل اشفاق علیخاں۔

۴۔ مالی معاونین ... ۱۔ سیٹھ عزیز داؤد۔ مالک لارنس پور مِل۔

(۲) سیٹھ محمد داؤد خان۔ حضرو۔

(۳) ڈسٹرکٹ کونسل ۔ اٹک

۔ کنوینر ۔

اس میں یہ لوگ صدیوں رہیں گے وہاں ٹھنڈک اور ٹھنڈا پانی نہیں ملے گا۔ صرف کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہوگی۔ یہ ہے بداعمالی کی سزا انہیں خیال ہی نہیں تھا کہ حساب ہوگا۔ اس لیے انھوں نے ہماری ہدایات کو توڑا۔ ہم نے ہر چیز کو لکھ رکھا ہے۔

اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اس سزا میں ہر روز اضافہ ہی ہوگا۔ صرف اہلِ تقویٰ جیتیں گے۔ اُن کے لیے وہاں انگور اور دیگر اثمار کے باغات ہیں۔ ہم عمر حسینائیں ہیں اور چھلکتے ہوئے جام۔

(نبا - ۲۱-۳۲)

"وہاں صرف اہلِ تقویٰ جیتیں گے"، ذرا اپنے نصاب کو دیکھ کر بتایئے کہ کون سی کتاب درسِ تقویٰ دیتی ہے؟

ہنگامۂ شور اسو برس سے ہنگامہ بپا ہے کہ نظامِ تعلیم کو درست کرو۔ لیکن یہ کسی نے نہ بتایا کہ خرابی کہاں ہے؟ بیسیوں کمیشن بیٹھے۔ انھوں نے چند سطحی اور بے نتیجہ سفارشات کیں۔ ان پر عمل ہوا لیکن ہماری دانشگاہوں کی پیداوار اور زیادہ نالائق اور بدکار بنتی گئی اس لیے کہ کمیشن کے ممبران بنیادی حقائق سے ناآشنا تھے۔

(۱) کہ حیات میں تسلسل ہے۔

(۲) کہ یہ زندگی عارضی ہے اور اگلی زندگی ابدی ولافانی۔

(۳) کہ وہ زندگی صرف پاکیزگی و تقویٰ سے سنورتی ہے

ان کمیشنوں کے اکثر ممبر برطانوی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے۔ جن کی نظر آسمان سے پرے۔ لحد سے آگے اور سطح سے نیچے دیکھ ہی نہیں سکتی تھی

# حرفِ اوّل

"مسائلِ نو" "جہانِ نو" کا تازہ عنوان ہے۔ ظہورِ پاکستان کے وقت ہمارے ملی مسائل کچھ اور تھے اور اب کچھ اور۔ اُس وقت کے مسائل پر میں نے نو مضامین لکھے تھے۔ جن کے مجموعے کا نام "جہانِ نو" رکھا تھا۔ آج سولہ برس کے بعد ہمارے مسائل کی نوعیت بدل گئی ہے۔ چنانچہ جب تازہ ایڈیشن نکالنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو میں نے "جہانِ نو" کے پانچ مضامین جو اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ کتاب سے خارج کر دیئے اور تیرہ نئے مضامین داخل کر دیئے۔ اِس اہم اضافے کی وجہ سے اِسکا عنوان بھی بدل دیا گیا ہے۔

پاکستان مختلف مسائل سے دوچار ہے۔ مثلاً

۱۔ طلبہ کی بے راہ روی
۲۔ ہمارے حکام، وزرا، اساتذہ اور لیڈروں کا مذہب سے فرار۔
۳۔ عیاشی - بادہ نوشی۔
۴۔ کشمیر
۵۔ فولاد
۶۔ بے اثر نصابِ تعلیم۔
۷۔ قومی زبان۔
۸۔ رسم الخط۔
۹۔ محرّم میں شیعہ و سُنّی تصادم۔

۱۰۔ دنیا سے دِل سے بے اعتنائی۔

وغیرہ وغیرہ

یہ وہ مسائل ہیں۔ جن پر ہمارے اربابِ فکر و نظر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ میں نے اِن مسائل کے متعلق کیا سوچا۔ اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

برق

کیمبلپور ۳/اپریل سنہ ۱۹۶۴ء

# الفہرس

صفحہ نمبر

# مکھی کی کتاب

اپنے آپ کو عقلمند اور دوسروں کو احمق سمجھنے کا مرض اس قدر ہمہ گیر ہے کہ جسے دیکھو دنیا کے ہر فرد، ہر نظام اور حکومت کے ہر شعبے پہ تنقید کر رہا ہے میرا حجام جب میری حجامت بناتا ہے تو صدر سے لے کر اردلی تک کے بیسیوں عیب گن ڈالتا ہے۔ میرے ایک دوست کا تکیہ کلام ہی گدھا ہے۔ کسی کا ذکر آجائے۔ ارشاد ہوتا ہے "اجی وہ تو گدھا ہے۔" دنیائے انسانی میں کچھ مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً سقراط، ارسطو، افلاطون، لقمان وغیرہ جنھیں ہر شخص عقلمند سمجھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اپنی عقل کا سکہ منوانے کے لئے سقراط بننا پڑتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ سقراط بننا آسان نہیں۔

## مکھی کی کتاب حشرات

یہ مرض صرف انسانوں ہی میں نہیں، بلکہ حیوانات و طیور میں بھی پایا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک مکھی کو خیال آیا کہ باغوں کی متعفن فضا میں یہ تتلیاں اور بھونرے خواہ مخواہ خراب ہو رہے ہیں۔ ایک کتاب لکھ کر انہیں بدروؤں اور بیت الخلاؤں میں بلایا جائے۔ چنانچہ اس نے کئی سو صفحات کی ایک کتاب لکھی۔ جس میں مسائل ذیل پہ تفصیلی بحث تھی۔

(۱) کہ باغوں میں ہر طرف تعفن پھیلا ہوا ہے جو صحت کے لیے مضر ہے۔

۲۔ کہ قصاب کی دوکان کا ماحول ازبس حسین، حیات پرور اور راحت افزا ہے

۳۔ کہ غلاظت میں وٹامنز کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔

۴۔ کہ قصاب خانہ، بدر رو اور غلاظت خانہ اصل دنیا ہے اور باقی سب کچھ محض بیکار۔

مکھی نے اس کتاب کے لاکھوں نسخے باغوں میں مفت تقسیم کیے، اس کتاب کی خاطر جابجا لائبریریاں کھولیں۔ سفری کتب خانوں کا انتظام کیا، ہر طرف مبلغ بھیجے اور پوسٹر چھاپے۔ پہلے تو بھونروں اور تتلیوں نے اس کتاب کا مضحکہ اڑایا لیکن رفتہ رفتہ اثر ہونے لگا کچھ نوجوان بھونرے شہروں میں آکر بدررو کا جائزہ لینے لگے۔ بدبو کی لپیٹ سے پریشان ہو کر بھاگ گئے اور پھر لوٹ آتے رفتہ رفتہ چند بھونروں نے بھی بدررو کی خوبیوں اور چمن کی خرابیوں پہ تقریریں شروع کر دیں اور دس پندرہ برس میں تمام بھونرے اور تتلیاں گندی نالیوں میں آکر غلاظت چاٹنے لگے۔

**مقامِ فکر** ذرا سوچئے کہ کیا وہ کتابیں جو گذشتہ سو سال سے آپ کو مدارس میں پڑھائی جا رہی ہیں، کسی ایسی ہی مکھی کی لکھی ہوئی تو نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ صدیوں سے یورپ اسیرِ ہوا و ہوس اور رہینِ نادنوش ہے۔ وہاں اخلاقی و روحانی اقدار کا کوئی تصور تک موجود نہیں۔ غریب اقوام کو لوٹنا۔ دن بھر تنورِ شکم تاپنا اور شام کو جنسی کیفیتوں میں ڈوب جانا ان کی زندگی ہے۔ خدا اور آخرت سے بے خبر، حرام و حلال سے ناآشنا۔ اور

پست لذتوں کے دل دادہ۔ یُوں سمجھئے کہ یُورپ ایک بدرَرو ہے جس میں وہاں کے لوگ مکھیوں کی طرح غلاظت چاٹ رہے ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ گناہ کی راہوں پہ اب وہ اتنے دُور جا چکے ہیں کہ ان کا رجوع اللہ کی طرف ناممکن ہوگیا ہے۔ دوسری طرف اُن کا مدِ مقابل یعنی مسلمان روحانی اقدار کا شدت و مد سے قائل ہے اور یہ نظریاتی اختلاف بار بار سیاسی تصادم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تو اُنھوں نے ایک نہیں بلکہ ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اس موضوع پر لکھیں۔

(۱) کہ زندگی کا انجام موت ہے اور آگے کچھ بھی نہیں۔

(۲) کہ مذہب ایک داستانِ پارینہ ہے جو عصرِ رواں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

(۳) کہ ایشیا کی اخلاقی و روحانی اقدار کمتر از افیوں نہیں۔

(۴) کہ کھانا، پینا، ناچنا اور عیش اڑانا اصل زندگی ہے۔

(۵) کہ مذہب اور سیاست کا دائرۂ کار جُدا جُدا ہے۔

(۶) کہ وطن اساسِ قومیت ہے اور تصوّرِ ملّت یعنی پان اسلامزم ایک سُرخ خطرہ ہے۔

(۷) کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک ہے۔ وہ کھیتی باڑی میں لگے رہیں اور خام مال ہمیں بھیجتے رہیں اور لوہے کی مصنوعات اُن کی خدمت میں ہم پیش کرتے رہیں گے۔

(۸) کہ انگریزی اُمّ الالسنہ اور سرچشمۂ تہذیب ہے۔

(۹) کہ انگریزی خط نہایت ترقی یافتہ خط ہے اسے اختیار کرنا اور قرآنی خط

سے جان چھڑانا ترقی کے لیے لازمی ہے۔

(۱۰)، کہ نپولین، نیلسن، ملٹن، ہیگن، نیوٹن وغیرہ محسنینِ انسانیت تھے اور باقی یہ سینا و رومی و فارابی وغیرہ تاریکی میں بھٹکنے والے اندھے۔

(۱۱)۔ کہ یورپ کے در و دیوار باغ و راغ اور بجور و طیور بے حد حسین ہیں اور یہ دجلہ و فرات اور سیحوں و جیحوں گندے نالے۔ لگو پرندوں کا بادشاہ ہے اور یہ بلبل، چکور، تیتر اور مور سب کے سب بیکار و بے ہودہ ہیں۔

یہ کتابیں پڑھنے کے بعد ہم یورپ میں گئے، شروع شروع میں تو وہاں کی عریانی، فحاشی اور عیاشی سے قدرے بدکے۔ لیکن بہت جلد ان اثرات کو قبول کر لیا۔ واپس آ کر انہی باتوں کا پرچار شروع کر دیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے فوج در فوج ایسے گریجوایٹ نکل رہے ہیں۔

۱۔ جو خدا اور رسول سے بیزار مے و نغمہ کے پرستار اور زنجیرِ شِشکم میں گرفتار ہیں۔

(۲)، جو تمام بلند اخلاقی و روحانی اقدار کے منکر ہیں۔

(۳)، جو اپنی تاریخ، روایات، اسلافِ ماضی، حال، مستقبل و منزل سے اصلاً بے خبر ہیں

(۴)، جو اپنوں سے متنفر اور یورپ کی ہر چیز کے گرویدہ ہیں۔

(۵)، جو اپنی زبان، اپنے ادب، بلکہ قرآنی خط تک کے دشمن ہیں۔

(۶)، جن کے ہاں زندگی کی سب سے بڑی قدر شراب پینا اور نامحرم نیم عریاں عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنا ہے۔

آج یورپ بے حد خوش ہے کہ آخر اُس نے اپنے اُس حریف کو پچھاڑ

ہی دیا جس سے وہ پچھلے چودہ سو برس میں ہزار بار پٹ چکا تھا۔

**علم کیسا علم؟** علم کے بغیر تو چارہ نہیں۔ لیکن علم کی بھی سینکڑوں شاخیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم پاکستانیوں کو کس قسم کا علم چاہیے۔ اس کا جواب بڑا واضح ہے کہ اسلام ہماری دنیا و آخرت ہر دو کو سنوارنا چاہتا ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً

(اے رب! ہماری دنیا و آخرت ہر دو کو بہتر بنا)

اِس لیے ہمارے لیے وہی علم کارآمد ہو سکتا ہے جو ہمیں دنیا و عقبیٰ دونوں میں سرخرو بنائے۔ دنیوی علوم میں سائنس کا مقام سب سے پہلے ہے کہ اس کے بغیر ہم کائنات کے لامحدود خزائنِ قوت مثلاً فولاد، بجلی، پٹرول، ایٹم وغیرہ سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ اِس کے بعد دیگر علوم مثلاً فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کا درجہ آتا ہے۔ ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں سارا زور دنیوی علوم پر دیا جاتا ہے اور اس زندگی کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی جاتی جو لحد سے شروع ہوتی ہے اور جس کا کوئی انجام نہیں۔

اسلام زندگی کو غیر فانی سمجھتا ہے زندگی چند برس کے لیے کرۂ خاک پر آتی۔ اور پھر اثیری بلندیوں کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اثیر کی وسیع دنیاؤں میں کروڑوں منطقات ہیں۔ کچھ حسین، رنگین، دلنواز و دلفریب اور کچھ غلیظ، تاریک، ہولناک و آتشیں۔ ان میں حیات کا قیام حسبِ اعمال ہو گا، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آتا ہے۔

”جہنم بدکاروں کی گھات میں ہے، وہ خدائی باغیوں کی قیام گاہ ہے

اس میں یہ لوگ صدیوں رہیں گے وہاں ٹھنڈک اور ٹھنڈا پانی نہیں ملے گا۔ صرف کھولتا ہوا پانی اور پیپ ہوگی۔ یہ ہے بداعمالی کی سزا انہیں خیال ہی نہیں تھا کہ حساب ہوگا۔ اس لیے انھوں نے ہماری ہدایات کو توڑا۔ ہم نے ہر چیز کو لکھ رکھا ہے

اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اس سزا میں ہر لحظہ اضافہ ہی ہوگا۔ صرف اہل تقویٰ جیتیں گے۔ اُن کے لیے وہاں انگور اور دیگر اثمار کے باغات ہیں۔ ہم عمر حسینائیں ہیں اور چھلکتے ہوئے جام۔

(نبا۔ ۲۱-۳۲)

"وہاں صرف اہل تقویٰ جیتیں گے"۔ ذرا اپنے نصاب کو دیکھ کر بتایئے کہ کون سی کتاب درس تقویٰ دیتی ہے۔؟

ہنگامہ و شور | سو برس سے ہنگامہ بپا ہے کہ نظام تعلیم کو درست کرو۔ لیکن یہ کسی نے بتایا کہ خرابی کہاں ہے؟ بیسیوں کمیشن بیٹھے۔ انھوں نے چند سطحی اور بے نتیجہ سفارشات کیں۔ ان پر عمل ہوا لیکن ہماری دانشگاہوں کی پیداوار اور زیادہ نالائق اور بدکار بنتی گئی اس لیے کہ کمیشن کے ممبران بنیادی حقائق سے ناآشنا تھے

(۱) کہ حیات میں تسلسل ہے۔

(۲) کہ یہ زندگی عارضی ہے اور اگلی زندگی ابدی ولافانی۔

(۳) کہ وہ زندگی صرف پاکیزگی و تقویٰ سے سنورتی ہے

ان کمیشنوں کے اکثر ممبر برطانوی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے جن کی نظر آسمان سے پرے۔ لہٰذا سے آگے اور سطح سے نیچے دیکھ ہی نہیں سکتی تھی

تھی :- اسلامی تعلیمات سے محض ناآشنا اور دل کی عظیم و جلیل دنیا سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کی بلا جانے کہ مسلمان کیا ہوتا ہے اور کیسے بنتا ہے؟ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمارے کارپردازانِ تعلیم بھی اسلام کے عظیم پیغام اور اس کے مقاصد سے لاعلم تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا نصاب از آغاز تا انجام بے مقصد رہا۔ ہماری مختصر دنیوی زندگی کے لیے تو وہ کسی حد تک مفید تھا لیکن ابدی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اگر آج ہماری درسگاہیں بدکردار ٹیڈیوں کم علم و بے عمل اساتذہ سے لبریز ہیں تو قصور کس کا؟ اسی نصاب کا ہے جو اس قدر مُردہ و بے رُوح ہے کہ پہلی جماعت سے ایم اے تک کی تمام کتابوں کا مجموعی اثر گلستان سعدی کی ایک حکایت جتنا بھی نہیں۔

آج اس زمانے میں، کہ دنیا کا ہر شہر بین الاقوامی کاروانوں کی گذرگاہ بنا ہوا ہے یورپ کے لوگ دھن جمع کرنے کیلئے ہر چار سُو دوڑ بھاگ رہے ہیں، اور اپنا فلسفہ پھیلا رہے ہیں اُن کا رُوح کش لٹریچر ہر گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ ان کی تقلید میں جابجا رقص گاہیں۔ تھیٹر خانے اور شراب خانے کھل چکے ہیں اور روحانی و اخلاقی اقدار پر زمین و آسمان سے آگ برسائی جارہی ہے۔ پاکستانی نوجوان کو مسلمان بنانا اور پھر صراطِ مستقیم پہ ثابت رکھنا بڑا ہی مشکل امر ہے۔ اس مقصد کے لیے حکومت محکمہ تعلیم، یونیورسٹیوں اور اساتذہ کو مل کر سوچنا ہوگا ورنہ یہ موجودہ روز افزاں اخلاقی انحطاط ہمیں ایک دن آزادی سے بھی محروم کر دے گا۔ یاد رکھئے قدرت گناہ کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

دَ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (قرآن) ہم بدکار دلوں سے لازماً انتقام لیتے ہیں

اگر محکمہ تعلیم اور یونیورسٹیوں کی موجودہ بے خبری و بے اعتنائی۔ اساتذہ کی کم عملی و بے عملی اور طلبہ کی بدردی کا یہی عالم رہا تو ہم دنیا اور آخرت ہر دو میں رُسوا و ذلیل ہو جائیں گے اور حکومت کو خدا اور مستقبل کے مورخ کے سامنے جواب دینا پڑیگا۔

نصاب کی اہمیت | ہمارے دیہات میں یہ کہانی مشہور ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے نے کہا "تمھارا کان کتا لے گیا ہے" وہ فوراً اٹھ اٹھا کر کتے کے پیچھے بھاگ نکلا اور کان کو چھونے کی تکلیف ہی گوارہ نہ کی۔ یہ کوئی لطیفہ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ بقول سعدی "گوش گذشتہ اثرے دارد" کان سے گذری ہوئی ہر بات دماغ کو متاثر کرتی ہے جو لوگ دوسری شادی کر لیتے ہیں وہ عموماً اپنی اولاد سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ پہلی اولاد سے کوئی قصور ہو جاتا ہے بلکہ یہ کہ نئی بیوی خاوند کے کان بھرتی رہتی ہے اور شوہر لاکھ حکیم و فلسفی ہو ان اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

ہٹلر اپنی کتاب "مائین کیمف" میں لکھتا ہے کہ ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ دنیا اسے سچ سمجھنے پہ مجبور ہو جائے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ نے کہا کہ جمہوریت ایک مقدس نظام حکومت ہے اور ہٹلر دشمنِ جمہوریت ہے۔ ہٹلر نے کہا کہ جمہوریت دراصل چوروں اور ڈاکوؤں کی منڈلی ہے جو غریب ایشیا اور افریقہ کو لوٹ رہی ہے۔ آدھی دنیا ہٹلر پہ ایمان لے آئی اور آدھی چرچل پر۔ پراپیگنڈہ حقیقتاً ایک نہایت خوفناک حربہ ہے جس کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً اخبارات۔ رسائل۔ سینما۔ ریڈیو۔ تقاریر وغیرہ ان تمام

میں مؤثر ترین نصابِ تعلیم ہے جو نئی نسل کے دل و دماغ میں گھر بنا لیتا اور زندگی کو ایک خاص ڈگر پہ ڈال دیتا ہے۔

انگریز بڑی ہی ہوشیار قوم ہے۔ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد اگر اسے خطرہ تھا تو صرف مسلمان سے اس لیے اس نے یہاں ایک ایسا نصابِ تعلیم نافذ کیا جس کا لازمی نتیجہ مذہب سے نفرت اپنی تہذیب و روایات سے بیزاری روحانی و اخلاقی اقدار سے بےخبری عظیم اسلاف سے بےتعلقی اور حیات کی لامقصدی تھا چنانچہ گزشتہ سو سال میں ہماری یونیورسٹیوں سے رشوت خور بابو، مغرور و متکبر افسر اور عیش پسند جنٹلمین تو کروڑں کی تعداد میں پیدا ہوئے لیکن ایک بھی ابنِ حنبل یا ابن قیم پیدا نہ ہو سکا

**ایک سوال** سوال یہ ہے کہ کیا انگریز کے جانے کے بعد ہمارے نصاب میں کوئی خاص تبدیلی ہوئی ہے؟ جواب ہے،

"بالکل نہیں یا بہت کم"۔

مولوی صاحب کے گھوڑے کے ساتھ پنڈت جی کی بہلی اب بھی اسی طرح رواں ہے۔ گلہری، بکرا اور مکھی بدستور ہماری نظموں کے موضوع ہیں ہمارا نصاب تعلیم ہمارے عظیم اسلاف کے ذکر سے اسی طرح خالی ہے۔

**نصاب دینیات** اشک شوئی کے لیے پہلی آٹھ جماعتوں میں دینیات کی چند ایسی کتابیں رکھ دی گئی ہیں جو نماز وضو کے مسائل تو بتاتی ہیں لیکن خدا و رسول سے شیفتگی پیدا کرنے کی اہلیت قطعاً نہیں رکھتیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ کتابیں چند ایسے پیشہ ور نصاب نویسوں سے لکھوائی گئی ہیں جو سوز و گداز، بصیرت، نظر اور دانش اعلےٰ کی نعمت سے محروم تھے اور ان کا مقصد نسلِ نو کو اقدارِ عالیہ کا درس دینا نہیں تھا

بلکہ ایک عرضی نویس کی طرح لکھائی کی اُجرت ٹٹورنا تھا۔ بس دانشور اقوام نصاب وضع کرنے سے پہلے سوچتی ہیں۔ کہ نئی نسل کو کیا بنانا ہے؟ کہاں لے جانا ہے؟ اور اس میں کون سی صفات پیدا کرنا ہیں؟ اس مقصد کے لیے وہ بلند پایہ اہلِ قلم کی خدمات مستعار لیتی ہیں۔ ہر سبق بلکہ ہر سطر کے اثر کا اندازہ لگاتی ہیں اور ہر پانچ برس کے بعد نتائج کا جائزہ لے کر نصاب میں مناسب ترمیم کرتی ہیں۔ کیا ہمارے ہاں بھی کوئی ایسا نظام موجود ہے؟ قطعاً نہیں، چند سال پہلے کی بات ہے کہ ایک خاص جماعت کے لیے نصاب سازی کا کام میرے حوالے ہوا۔ اجرت تھی پندرہ سو روپیہ۔ لاہور کے چند پیشہ وروں پیچھے پڑے کہ یہ کام انھیں مل گیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے رقم کا افسوس نہیں کہ میں طبعاً فقیر ہوں اور دنیوی مال و متاع سے گریزاں۔ بلکہ افسوس اس امر کا ہے کہ لاکھوں نوجوانوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کا ایک زرّیں موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

**تحریر میں اثر** آپ نے حصولِ پاکستان کے سلسلے میں سینکڑوں تقاریر سنی ہوں گی آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جو اثر حضرت قائدِ اعظم کے الفاظ میں تھا اس کا عشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ملتا کیوں؟ اس لیے کہ قائدِ اعظم میں خلوص تھا، تڑپ تھی، بلکہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ جو الفاظ میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اگر سینہ ایمان و عشق کی حرارت سے خالی ہو تو الفاظ بے اثر بے نتیجہ اور بے جان ہوتے ہیں۔ رومی گذشتہ آٹھ صدیوں سے دنیائے اسلام پہ اثر انداز ہے۔ اقبال نے دس کروڑ اسلامیانِ ہند کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی دوسری طرف ہزار دل ایسے اہلِ قلم بھی ہیں جنھوں نے زندگی بھر قلم چلایا لیکن کسی ایک فرد کو بھی متاثر نہ سکے۔ الفاظ محض خول ہیں جن میں اثر حرارت

یا زندگی صاحب الفاظ کے سینے سے منتقل ہوتی ہے۔ انگریز سے پہلے ہم ایسی کتابیں پڑھتے تھے جن کے لکھنے والے سعدی۔ جامی۔ خاقانی۔ رازی۔ ابنِ یمین حافظ اور رومی جیسے لوگ تھے۔ بادہ عشق سے سرشار۔ حسن و جمال کے پیکر۔ جلالِ خداوندی کے مظہر، عابد، زاہد، عظیم و توانا۔ ان کے الفاظ میں بجلیاں تھیں جو رگ و پے میں سرور و مستی کی لہر دوڑا دیتی تھیں۔ لیکن اب نصاب لکھنے والے ایرے غیرے اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے والے نتھو خیرے۔ جذبات عالیہ سے وہ خالی اور فکر و بصیرت سے یہ محروم۔ ہر دو انسان کی منزل اور مقصدِ حیات سے ناآشنا۔ فرمایئے ایسی مُردہ کتابوں سے وہ شاہین بچے کیسے پیدا ہوں گے جن کی پرواز لامکان تک ہو جو اپنے عزمِ بلند، ایمانِ محکم اور عشق جہاں آرا سے ساری کائنات کو متاثر کریں اور انسان کو حیوانی پستیوں سے اٹھا کر الوہیت کے سپہر بریں تک پہنچا سکیں۔

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے

قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں۔ اقبالؔ

**سیدھی سی بات** بات سیدھی سی ہے کہ ہم نے اس دنیا میں بھی ایک باعزت زندگی گذارنا ہے اور اگلی دنیا میں بھی۔ عزت اور قوت مترادف الفاظ ہیں ایک کمزور قوم کبھی معزز نہیں ہو سکتی۔ نسلِ انسانی کے لاکھوں سالہ تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ علم ایک مہیب قوت ہے جو بطنِ زمین سے فولاد اور پٹرول کے ذخائر نکال سکتی ہے۔ یہ معادن ایک حد تک ہماری بقا کی ضامن ہیں۔ انہی سے ہم خدا و رسول کے باغیوں اور اپنے دشمنوں کا منہ توڑ سکتے ہیں قرآن کریم میں اللہ نے فولاد کو خدا و رسول کی حمایت کا وسیلہ قرار دیا ہے

وَاَنزَلنَا الحدید فیہ باسٌ شدیدٌ ومنافعُ الناس ولیعلمَ اللہ مَن ینصرہٗ ورسلہٗ بالغیب .... (حدید)

(ہم نے فولاد پیدا کیا جس میں بڑی ہیبت ہے اور دنیائے انسانی کے لیے بے شمار فوائد ہیں ہم یہ دیکھنا چاہتے کہ کون لوگ فولاد سے مسلح ہو کر بن دیکھے خدا اور رسول کی مدد کرتے ہیں۔)

علم کے علاوہ بھی چند چیزیں ایسی ہیں جو انسان کو عزت، عظمت اور طاقت بخشتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سچ قوت ہے اور جھوٹ ضعف۔ دیانت، شجاعت عفت اور ہمت قوت ہیں اور خیانت، بزدلی، بے حیائی اور دوں ہمتی ضعف، وفا، ایثار، اتفاق، اتحاد انکسار اور ایمان قوت ہیں اور بے وفائی خود غرضی بخل انتشار، نخوت اور لاایمانی ضعف۔ ان تمام طاقتوں سے بڑی ایک اور قوت ہے، جو خدا و جبریل پر بھی کمند پھینک سکتی اور ارض و سما کی تمام طاقتوں کو تعاون پر مجبور کر سکتی ہے اس کا نام عشق ہے جو صرف اللہ کی عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔ کس قدر عظیم و مہیب ہیں وہ اقوام جو علم و عشق ہر دو کی مالک ہیں۔

آج اقوام یورپ کے پاس علم تو ہے لیکن عشق نہیں۔ نتیجۃً ان کا علم کائنات اور خود ان کے لیے ایک لعنت بنا ہوا ہے یہ لوگ سخت مضطرب اور ناآسودہ ہیں اور ایک دوسرے کو فنا کرنے کے لیے نہایت مہلک اسلحہ تیار کر رہے ہیں نوعِ انسانی کی طویل تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جو لوگ دولت عشق کھو بیٹھے وہ مٹ گئے۔

وَالعصرِ اِنَّ الانسانَ لفی خسرٍ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ..... (قرآن)

(تاریخ عالم شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ خسارے میں رہا۔ ہاں وہ لوگ بچ گئے جن کے سینوں میں عشق و ایمان کے چراغ جل رہے تھے جن کے اعمال پاکیزہ تھے اور جو دنیا کو سچائی اور استقامت کا درس دیا کرتے تھے

**پاکستان کی مشکلات** اس وقت پاکستان مختلف مشکلات میں مبتلا ہے۔ مسئلہ کشمیر لاینحل پڑا ہے۔ نہرو ہمیں ہڑپ کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے ہمارے حلیف نہرو سے ملے ہوئے ہیں ہم امریکہ کی آغوش میں گھسیں تو خروشیف (روس کا وزیر اعظم) دھمکاتا ہے۔ روس کا رخ کریں تو لندن سے واشنگٹن تک ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے ان تمام مشکلات کا واحد حل اللہ سے رابطہ ہے۔ اگر اللہ ہمارا ہو جائے تو پھر ہم اس قدر قوی، پُرہیبت اور عظیم بن جائیں گے کہ ہماری للکار سے بھارت پہ لرزہ طاری ہو جائیگا اور ہماری ایک ضرب سے بُتکدہ ہند پاش پاش ہو جائے گا۔ اگر ہم عشق کی قوت سے محروم رہے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے اللہ ساتھ نہ ہو تو کوئی قدم سیدھا نہیں پڑتا، کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی اور کوئی تیر نشانے پہ نہیں بیٹھتا۔ عشق بڑی چیز ہے بہت بڑی قوت ہے۔ اک بے نظیر وسیلہ عظمت ہے اور کائنات کی سب سے بڑی دولت ہے اس لیے اے خدا اور رسول کا نام لینے والو!

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ..... (الدہر)

(صبح و شام اللہ کو پکارا اور رات کو سجدوں میں گرو اور اس کی حمد و ثنا کے گیت گاؤ)

**کامیاب نصاب** | ہمارے لیے وہی نصاب کارآمد ہو سکتا ہے جو:-

۱- ہمارے علم میں اضافہ کرے۔

۲- اخلاقِ عالیہ کا درس دے۔

۳- اللہ سے ہمارا رابطہ استوار کرے۔

۴- اور اس کے لکھنے والے صاحبِ فکر و نظر ہوں۔

ہم تشکیلِ سیرت اور تخلیقِ عشق کا کام اردو سے لے سکتے ہیں جو جماعتِ اوّل سے ایف اے تک لازمی ہے اردو کے نصاب میں کچھ اس قسم کی چیزیں ہونی چاہییں

۱- گلستان کی طرز پر اخلاقی کہانیاں۔

۲- آیات، احادیث، اور حکایاتِ رومی کا سلیس ترجمہ۔

۳- صحابہ و صحابیات کے واقعاتِ زندگی

۴- اپنے عظیم سپہ سالاروں، فرمانرواؤں، فلسفیوں، فقیہوں، اماموں، ججوں اور عالموں کے حالات۔

۵- آسان زبان میں اسلامی افکار و نظریات۔

۶- حکماء، اولیا و انبیاء کے اقوال و حالات۔

۷- اوامر و نواہی کی تفصیل۔

۸- غزوات و فتوحات۔

۹- بنیادی عقائد کی تفصیل۔

۱۰- بدکاری کے نتائج پہ تاریخی و الہامی شہادت۔

۱۱- خوفِ خدا، تقویٰ و عبادت کا بار بار درس۔

۱۲- اخلاقی صفات پر دل نشین انداز میں بحث وقِس علیٰ ھٰذا!

ہمارے موجودہ نصاب میں یہ چیزیں موجود نہیں اِس لیے اس سے نہ ہماری دنیا سنورتی ہے نہ عقبیٰ اور ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص یہی ہے کہ ہمارا نصاب بے مقصد ہے۔

خداوندانِ تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ فوراً اِس طرف متوجہ ہوں اور ایسے لوگوں کی تلاش کریں جو نصاب کو بامقصد بنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

خطرہ | لیکن خطرہ یہ ہے کہ ہمارے یہ دو ہزار تنخواہ پانے والے ڈائریکٹر ایک غریب مدرس کی بات قطعاً نہیں سُنیں گے اور اس عظیم قوم کے بچوں کو گلہری، مکھی اور مکڑے کی کہانیاں پڑھا پڑھا کر تباہ کرتے رہیں گے۔ اگر آپ نے ان بچوں کو اپنی تہذیب، ثقافت، روایات، تاریخ کا دلدادہ نہ بنایا، راہ و منزل سے آگاہ نہ کیا خدا و رسول سے ان کا ناطہ نہ جوڑا تو یہ لازماً ٹیڈی بن جائیں گے اور وطن کی مقدس زمین کو گناہ سے بھر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ عیاش و بدکار اقوام زندہ رہنے کا حق کھو دیتی ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (طلاق)

ترجمہ:- ایسی کتنی ہی بستیاں تھیں جنھوں نے خدا و انبیاء سے منہ موڑ لیا ہم نے ان کا شدید محاسبہ کیا انھیں خوفناک سزا دی۔ ان کے اعمال باعثِ وبال بنے ان کا انجام بڑا ہی عبرتناک تھا ایک اور خوفناک عذاب (بعد از مرگ) ان کا منتظر ہے۔ اے اہلِ دانش اللہ سے ڈرو۔

# کیا اسلام عصر حاضر کا ساتھ دے سکتا ہے؟

بعض حلقوں سے دمادم یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اسلام کو عصر حاضر کے سانچوں میں ڈھال کر "ماڈرن" بناؤ دو باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں

اوّل یہ کہ ان حضرات کے ہاں اسلام کا تصور کیا ہے ؟

دوم کہ اسلامی تعلیمات میں کون سی چیز عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی اسلامی تعلیمات کا مقصد انسان کی دونوں دنیائیں سنوارنا ہے اور اس سلسلے میں جو ہدایات نافذ کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) سچ بولو (۲) مال حرام سے بچو (۳) چوری، ظلم، زنا، غیبت، خیانت، غرور، بدگوئی اور بدخلقی سے احتراز کرو (۴) حِلم، عفو، خدمت خلق اور انکسار کو اپنا شیوہ بناؤ (۵) اپنی صفوں میں اتحاد رکھو (۶) اپنے اعدا کے لیے اسلحہ قوت و ہیبت فراہم کرو (۷) تمام کائنات کو علم کے زور سے مسخر کرو (۸) اگر علم کی تلاش میں چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔

ان ہدایات کو دوبار پڑھیے اور فرمائیے کہ کون سی چیز عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی؟ کیا اس دور میں کوئی ایسا معاشرہ کہیں موجود ہے جس کی بقا کے لیے دیانت کی جگہ خیانت، عدل کے بجائے ظلم اور سچ کی جگہ جھوٹ ضروری ہو یا جو لاعلمی، بدخلقی، تکبر، جہالت اور عیاشی سے پروان چڑھ سکتا ہو البتہ چند

چیزیں ایسی ہیں جو آدم جدید کے ہاں محل نظر اوّل ہیں۔

**چور اور زانی کی سزا** چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا اور زنا کی سزا سو دُرے ہیں اعتراض یہ ہے کہ یہ بہت سخت ہیں اور انھیں ذہن جدید کبھی قبول نہیں کر سکتا اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہاتھ کاٹنا چوری کی انتہائی سزا ہے اِس سے نیچے بھی کئی سزائیں ہو سکتی ہیں مثلاً جرمانہ، قید یا دُرے۔ عدالت نے جرم کی نوعیت دیکھ کر سزا دینا ہے۔ اگر کوئی لڑکا دوسرے لڑکے کی پنسل چرا لے تو اسے زیادہ سے زیادہ دو آنہ جرمانہ یا ایک چپت کی سزا دی جا سکتی ہے اِس کا ہاتھ کاٹنا سراسر ظلم اور خلاف انصاف ہوگا۔ اسلام کی بنیاد ہی عدل و احسان پہ رکھی گئی ہے اس لیے سزا نوعیت جُرم کے مطابق ہوگی۔ قرآن نے انتہائی سزا مقرّر کرنے کے بعد سزاؤں کا معاملہ عدالت کی دانش و خرد پہ چھوڑ دیا ہے اور یہ بات آج دنیا کی ہر عدالت میں ہو رہی ہے کہ ایک جُرم کی سزا ضابطۂ فوجداری میں سات برس قید لکھی ہوئی ہے۔ لیکن عدالت جتنی چاہے دیتی ہے۔

یوں تو جرائم کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے مثلاً۔ مار پیٹ، دھوکہ، قمار بازی، شراب نوشی، اغلام، رشوت، خیانت وغیرہ لیکن قرآن حکیم میں صرف پانچ جرائم کی سزا درج ہے۔ قتل کی موت، چوری کی قطع دست، زنا کے سو دُرّے اور بغاوت کی جلاوطنی سولی قتل یا قطع دست دیا اور باقی تمام جرائم کی سزا انسانی اجتہاد پہ چھوڑ دی ہے یہی حال چوری کا ہے چوری ہزاروں طرح کی ہو سکتی ہے ہلکی معمولی خاصی، سنگین، خوفناک، ہولناک، بھیانک نہایت سنگین اور انتہائی بھیانک ان کے لیے سزا تجویز کرنا عدالت کا کام ہے۔ عدالت پہ صرف ایک ہی پابندی

ہئے کہ وہ انتہائی سزا سے آگے نہ جائے یعنی چور کو نہ آگ میں پھینکے نہ پھانسی دے۔

**قطع دست بُری** آدم جدید کہتا ہے کہ قطع دست کی سزا بہت سخت ہے اور خلاف انصاف ہے۔ بہت اچھا! فرض کیجئے کہ ایک غنڈہ پہلے آپ کی کار اور بندوق چراتا ہے اور پھر شہر سے دُور کاروں اور ٹرکوں کو لُوٹنا شروع کر دیتا ہے سینکڑوں وارداتوں کے بعد گرفتار ہوتا ہے چھ برس کے لیئے جیل میں پھینک دیا جاتا ہے باہر آتا ہے پھر وہی کام شروع کر دیتا ہے کئی وارداتوں کے بعد پھر پکڑا جاتا ہے اِس مرتبہ اسے چالیس دُرّوں، سات سال قید اور پچاس ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ملتی ہے سزا کاٹنے کے بعد اس کی وارداتوں کی نوعیت شدید تر ہو جاتی ہے وہ بڑے بڑے بنک لوٹتا ہے اور گلیوں سے بچے اٹھا کر دور بیچ آتا ہے کیا ایسے سیاہ کار ظالم اور سنگدل ڈاکو کا دوسری یا تیسری مرتبہ ہاتھ کاٹ دینا ظلم ہے؟ اس سزا کو وہی شخص ظلم قرار دے سکتا ہے جو چور کا یار غار اور مالِ غنیمت میں برابر کا حصہ دار ہو۔

**زنا کی سزا** زنا کی انتہائی سزا سو دُرّے ہے بشرطیکہ موقع کے چار گواہ موجود ہوں یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی غنڈہ کسی گھر میں مسلح ساتھیوں کے ساتھ داخل ہو کر کسی لڑکی کی عصمت تمام اہل خانہ کے سامنے لوٹ لے کیا اس غنڈے کو سو دُرّے لگانا ظلم ہے؟ ضروری نہیں زنا کی ہر واردات چار گواہوں کے سامنے ہو۔ ہو سکتا ہے گواہ صرف شوہر ہو۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے کہ ایک شوہر سفر سے گھر آیا دبے پاؤں خواب گاہ میں جا پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا ایک دوست بیگم صاحبہ کے ساتھ ہم بستر ہے۔ اس طرح کے حالات میں عدالت قید و بند

کی سزا تو دے سکتی ہے لیکن انتہائی سزا نافذ نہیں کر سکتی کیونکہ گواہوں کی تعداد کم ہے

**صلوٰۃ و عبادت** | نئی نسل کہتی ہے کہ دنیا کی دیگر اقوام شب و روز کام کر رہی ہیں اور ہم اوقات کا ایک حصہ نمازیں گنوا دیتے ہیں۔ حساب یوں لگاتی ہے کہ اگر ہر آدمی ہر روز پانچ نمازوں پر دو گھنٹے صرف کرے تو ستر کروڑ مسلمانوں کے ایک ارب چالیس کروڑ گھنٹے ضائع ہو جائیں گے اگر ایک آدمی ایک گھنٹہ میں اوسطاً چار آنے کما سکتا ہے تو ساری قوم کو روزانہ ۳۵ کروڑ مہینہ میں ساڑھے دس ارب اور سال میں بارہ کھرب ساٹھ ارب روپے کا نقصان ہوگا۔

جواباً اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اوّل تو یہ حساب اور یہ انداز فکر ہی غلط ہے۔ اگر گھرانے کی آمدنی دو سو روپیہ ماہوار ہے تو نماز چھوڑنے سے اس میں اضافہ نہیں ہوگا اور نہ نماز پڑھنے سے کوئی کمی ہوگی۔ دوم۔ اسلام کا مقصد شکم پرست جہاں اور سود خور دھوتی پرشاد نہیں۔ بلکہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا ہے۔

۱۔ جو دنیا کو امن و سلام کا پیام دے۔

۲۔ اللہ کے بندوں کو اللہ سے ملائے۔

۳۔ گناہ کے خلاف جنگ کرے۔

۴۔ قناعت، صبر، تقوٰی، محبت، ایثار، رحم، عدل، احسان اور دیگر فضائل عالیہ کا درس دے۔

۵۔ کاروانِ حیات کو منزل کا پتہ بتائے۔

۶۔ ایک ایسا معاشرہ پیدا کرے جو حرص، عیاشی، بدکاری، ستم، حسد، نفاق، دروغ، فریب اور بددیانتی وغیرہ کی آلائشوں سے منزہ ہو۔

۷۔ اور انسانوں کو اس قوت وعظمت کی خبر دے جو اللہ سے رابطہ پیدا کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

اس خدامست وخود آگاہ قوم کو سیم وزر سے کیا تعلق اس کے ہاں ترقی کا پیمانہ اسبابِ عیش کی فراوانی نہیں بلکہ تطہیر وتزکیۂ دل ہے اس کی سرمستیاں نادنوش میں نہیں بلکہ ذکر وفکر میں ہیں اسلام اس کا ساز ہے اور عشق اس کا سوز یہ صاحبِ سپاہ بھی ہے اور صاحبِ نگاہ بھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں علم اور دوسرے میں قلم ہوتا ہے اس کا سر خاک پر اور افلاک پر ہوتا ہے۔ یہ خاکی بھی ہے اور نوری بھی بندہ بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ ایں جہانی بھی ہے اور آں جہانی بھی۔ اس کی خودی خدائی ہے اور بے خودی جہاں آگاہی۔ ایسی عظیم وجلیل مخلوق کے متعلق یہ سوچنا کہ چند لمحات کے لیے اللہ کے تصور میں ڈوب جانے سے اتنے روپوں اور اتنے آنوں کا خسارہ ہوگا اس کے مذاق کی انتہائی توہین ہے۔

نماز خدا اور بندے کے درمیان ایک نوری رابطہ ہے جب انسان جبینِ نیاز خاک پہ رکھ کر رب العرش کو پکارتا ہے تو وہاں سے نور وسرور کی شبنم خیابانِ دل پہ ٹپکتی ہے اور کیف ومستی کی ایک دنیا بسا جاتی ہے عبادت اعترافِ عبودیت اور ترکِ عبادت اللہ سے استغناء بغاوت ہے۔ یہ ایک عظیم لذت ومسرت اور رب العرش سے سلسلۂ مودت ومحبت ہے دنیادار بندہ زر ہے اور عابد ندیم خدائے اکبر جہاں اگر کسی فرد کو صدر پاکستان کا قرب حاصل ہو جائے تو اس میں احساس بزرگی وعظمت پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ تو کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جو ندیم خدا بن جائے۔ حقیقتاً کائنات

میں اس سے بڑی رفعت و عزت موجود ہی نہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ جنگ احزاب میں کفار کے عظیم لشکر کو آندھی نے تباہ کر دیا تھا جنگ بدر میں چھ تلواریں ایک ہزار تلواروں پر غالب آگئی تھیں شام و ایران کے میدانوں میں صحابہ کی مختصر سی فوج نے قیصر و کسریٰ کی مہیب عساکر کو پیہم شکستیں دی تھیں کسی کے ایک اشارے سے قلزم کا بطن چاک ہو گیا تھا اور کوہ طور جھک کر بنی اسرائیل کے سروں پر آگیا تھا۔ ذرا سوچئے یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہوا۔ جواب ایک اور صرف ایک ہے کہ وہ جلیل و جمیل لوگ اللہ کے پرستار تھے اللہ ان کے ساتھ تھا اللہ کے لاتعداد فرشتے ان کے معاون تھے جب چاہتے تھے آندھیوں طوفانوں اور بجلیوں تک کو اپنی مدد کے بلا لیتے تھے۔

عبادت کے دو اور فائدے بھی ہیں۔

اول یہ کہ انسان بیمار نہیں ہوتا اور اگر پہلے سے بیمار ہو تو صحت ہو جاتی ہے۔ سائنس کو بالآخر یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ذکر و فکر کی سرخوشی (مستی) سے خون کی تمام غلاظتیں جل جاتی ہیں اور تمام جراثیم امراض ہلاک ہو جاتے ہیں، یہ میرا ہزار بار کا تجربہ و مشاہدہ ہے اور رب عظیم شاہد ہے کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔

دوم۔ عبادت سے سکون و سرور کی لہر روح میں دوڑ جاتی ہے جسے رفتہ رفتہ رنگ استقلال مل جاتا ہے۔ مجنوں زندگی بھر لیلیٰ کے تصور میں غرق رہا یہی تصور اس کی زندگی اور سب سے بڑی لذت تھی جو لوگ اللہ کو دل میں بسا لیتے ہیں اور خود اس کی ذات جمیل میں بس جاتے ہیں، وہ ایک ایسی لذت میں کھو جاتے ہیں کہ جہان ہست و بود کا کوئی سانحہ انہیں پریشان نہیں کر سکتا۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ٥

(ترجمہ، لوگو یہ بات کان کھول کر سُن لو کہ سکون و اطمینان صرف اللہ کی یاد سے ملتا ہے)

آج دنیا اور خصوصاً یورپ ترک عبادت کی وجہ سے سکون دل کی نعمت سے محروم ہے ہر چند وہاں کاریں بھی ہیں اور کوٹھیاں بھی۔ شراب و کباب بھی ہے اور چنگ و رباب بھی دولت کے انبار بھی ہیں اور حسن و عشق کی بہاریں بھی، لیکن وہ لوگ انتہائی اضطراب کا شکار ہیں اور ان کی روح کسی گمشدہ دولت کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ سکون ایک خاص قسم کے نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص کا مقصد روپیہ جمع کرنا ہے گن گن کر رکھنا ہزار کو لاکھ اور لاکھ کو کروڑ بنانا ہو وہ لالچ کے بھڑکتے ہوئے الاؤ میں جلتا رہتا ہے اسی طرح جو شخص حسینوں کا شکار کھیل رہا ہو وہ کبھی آتشِ فراق میں جلتا ہے اور کبھی آتشِ رقابت میں۔ لیکن جو شخص اللہ کے دامن سے وابستہ ہو۔ اسے کائنات کی کوئی چیز اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی اور اس کی دنیائے دل اس شاداب چمن کی طرح بن جاتی ہے جس میں چار سو قافلہائے حسن و بہار خیمہ آرا ہوں۔

**مخصوص عظمت** اسلام میں اعاظم رجال کا ایک خاص طبقہ نظر آتا ہے جو کہیں اور نہیں ملتا۔ اور وہ ہے جماعت اولیاء اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے اسلام نگر الکاہل کے بعید ترین جزائر تک جا پہنچا تھا آج سے ایک ہزار سال پہلے خیبر سے لاہور تک ایک بھی کلمہ گو موجود نہیں تھا اور آج ایک بھی کافر نہیں ملتا یہ کس کا اعجاز ہے صرف چند خرقہ پوشوں کا جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت بابا فرید گنج شکر اور حضرت سلطان باہو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ممالک سپاہ سے فتح ہوتے ہیں اور دل نگاہ سے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپاہ کی تیغ بازی وہ نگاہ کی تیغ بازی (اقبال)

قلعوں کا فتح کرنا آسان ہے لیکن دلوں کی تسخیر آسان نہیں اس کے لیے داتا کی نگاہ اور اجمیری کا غمزۂ سرکش چاہیے۔ اگر دل صرف علم سے مسخر ہو سکتے تو ابوالکلام آزاد سارے ہندوستان کو حلقہ بگوش اسلام بنا جاتے۔ لیکن وہ اپنی بہتّر سالہ زندگی میں کسی ایک فرد کا عقیدہ بھی نہ بدل سکے اور دوسری طرف یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک دن کئی ہزار ہندو خواجہ اجمیری کو صرف دیکھ مسلمان ہو گئے تھے۔ نگاہوں میں یہ ساحری اداؤں میں یہ دلبری اور حُسن میں یہ رعنائی صرف عبادت سے پیدا ہوتی ہے۔

عبادت ہماری قوت، ہماری عظمت، ہمارا حسن ہماری پناہ گاہ اور ہمارا حصار ہے اگر اسلام عبادت کو لازمی قرار نہ دیتا تو واللہ نظام ایک پیکرِ بے رُوح بن کر رہ جاتا۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ دنیا کے تمام کام چھوڑ کر گوشۂ عبادت میں جا بیٹھو بلکہ یہ ہے کہ سرورِ دو عالم صلعم اور صحابہ اکرام کی طرح دنیا بھر کے کام کرو، روزی کماؤ، پڑھو، پڑھاؤ ملک کا انتظام کرو، گھر بناؤ، نکاح کرو، کاریں خریدو، محل بناؤ جو چاہو کرو لیکن اللہ کو دیدۂ دل سے اوجھل نہ ہونے دو۔ ہر روز پانچ وقت اس کے حضور میں جاؤ اور اس کے تصور میں ڈوب کر اسے پکارو بس اتنا سا عمل تمھاری شخصیت کو پُرکشش تمھارے چہرں کو حسین تمھاری نگاہوں کو سحرکار، تمھاری حیات کو پرسکون اور تمھارے مستقبل کو درخشاں بنا دے گا اور بعد از مرگ تمھیں جوارِ یزداں میں پہنچا دے گا۔

آج یورپ کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ سلطنت، سیاست، تدبر، تمول، علم قوت وغیرہ وغیرہ لیکن بایں ہمہ وہ سکون و اطمینان کی دولت سے محروم ہے وہ وہ موتی کی

جنگوں کا شکار ہو چکا ہے اور اب اس کے سر پر تیسری جنگ کی تلوار لٹک رہی ہے وہاں عورتوں کی آزادی و بے راہ روی کی وجہ سے ہر گھر برباد اور ہر نوجوان آوارہ و ناشاد ہے تاجر حریص، حاکم عیاش اور عوام اس حد تک نامطمئن ہیں کہ جب تک خواب آور گولیاں نہ کھائیں ان میں سے اکثر کو نیند ہی نہیں آتی۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ ان کا رشتہ اللہ سے منقطع ہو چکا ہے اور اب یورپ ایک ایسے کھڈ کے دہانے پر کھڑا ہے جس کی تہہ میں سُرخ لاوا کھول رہا ہے۔

عبادت کو اسلام سے خارج کرنے کا مشورہ وہی دے سکتا ہے جو حقائق بالا سے بے خبر اور عبادت کے عظیم اثرات سے ناآشنا ہو۔

روزہ | صوم کے فوائد سے آپ آگاہ ہیں۔

۱۔ اِس سے صحت بہتر ہوتی ہے۔

۲۔ جفاکشی کی عادت پڑتی ہے جو قومی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔

۳۔ تمام عادات مثلاً مے نوشی، تمباکو، چرس وغیرہ سے نجات مل جاتی ہے۔

۴۔ بدگوئی، غیبت، دنگہ فساد، اور گالی گلوچ سے بھی جان چھوٹ جاتی ہے۔

اور اس طرح صائم تقویٰ و پاکیزگی کی ایک خاص سطح پر جا پہنچتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں تقویٰ بہت بڑی قوت ہے۔

مت بھولیئے کہ کائنات کی مہیب طاقتیں دو ہیں علم جس سے ہم ساری کائنات مسخر کر سکتے ہیں اور تقویٰ یعنی اللہ سے رابطہ عبادت۔

صوم میں رعایت | قرآن کریم نے صائم کو تین رعایات عطا کی ہیں۔

۱۔ کہ اگر تم سفر میں ہو۔

۲- یا بیمار ہو تو روزہ نہ رکھو اور بعد میں اِس گنتی کو پُورا کرو۔

۳- اگر روزے میں تمہیں کوئی دقت محسوس ہوتی ہو مثلاً پیری کی وجہ سے شاق گذرتا ہو یا جُون کی دوپہر کو سڑک کھودنے پر مجبور ہو یا اپنے فرائض کو ادا نہیں کر سکتے تو ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دو لیکن یاد رکھو روزہ فدیہ سے بہتر ہے۔

**صدقہ و زکوٰۃ** جسم کی نشوونما صحت مند غذا سے ہوتی ہے اور روح کی بالیدگی نیکی سے نیکیوں میں صدقہ و عبادت کو ایک مقامِ بلند حاصل ہے۔ ایک چور دوسروں سے ان کی کمائی چھینتا ہے اور اسی لیے گردن زدنی ہے۔ لیکن ایک نیک انسان اپنی کمائی سے غربا و مساکین کو پالتا ہے اور اس لیے خدا و خلق کا محبوب بن جاتا ہے۔ رُوح کو جو سُرور و کیف دینے سے ملتا ہے وہ لینے میں کہاں، دنیا کے بیشتر ادارے صدقہ و خیرات سے چل رہے ہیں۔ مثلاً علیگڑھ یونیورسٹی، اردو کالج کراچی، دیال سنگھ کالج، تمام اسلامیہ کالج اور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں، بےشمار شفاخانے اور کتب خانے، ظاہر ہے کہ ایسا مفید حکم عصرِ رواں کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

**حج** رہا حج، یعنی بیت اللہ الحرام کی زیارت تو اس کے فوائد اس قدر واضح ہیں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تمام مسلمانانِ عالم کا ایک مرکز پر ایک لباس میں ہر سال جمع ہونا وحدتِ ملّی کا عدیم المثال مظاہرہ ہے۔ کعبہ میں پہنچتے ہی اس مردِ جلیل کی داستان دماغ میں گھومنے لگتی ہے جسے نمرود نے آگ میں پھینک دیا تھا جس نے خواب میں اشارہ پاکر بیٹے کے گلے پر چھری چلادی تھی جس کے مقدس ہاتھوں نے کعبہ تعمیر کیا تھا، جس کی پُشت سے انبیا کا وہ عظیم سلسلہ شروع ہوا جس کی آخری کڑی حضور پُرنور صلعم تھے۔

بیت اللہ الحرام کا ماحول اس قدر مؤثر ہے کہ جو شخص وہاں جاتا ہے اس کی دنیا ہی

بدل جاتی ہے وہ خدا و انبیاء سے یوں منسلک ہو جاتا ہے کہ زندگی کی کوئی ترغیب یا ترہیب اسے اپنے مسلک سے نہیں ہٹا سکتی۔

لباس وغیرہ | اسلام نے لباس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ صرف اتنا ہی کہا ہے کہ لباس انسان کی زینت ہے اسے صاف و پاک رکھو شلوار پہنو یا پتلون، سر پر کلاہ ہو یا ہیٹ، اسلام کو کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ کوئی چیز عبادت میں مخل نہ ہو عورتوں کا لباس ایسا ہونا چاہیئے کہ ہاتھ پاؤں اور چہرے کے سوا کوئی اور حصۂ جسم عریاں نہ ہو۔ وہ گھروں سے باہر جائیں تو اپنی تمام آرائش و زینت کو ایک بڑی چادر (برقعہ وغیرہ) سے ڈھانپ لیں نامحرم سے بات کرتے وقت نگاہ نیچے رکھیں۔

ریش | قرآن عظیم نے بالوں کو جزوِ مذہب نہیں بنایا۔ داڑھی ہر زمانے میں وقار و بزرگی کا نشان رہی ہے۔ تمام انبیاء و اولیاء داڑھی رکھتے تھے اگر کوئی شخص حضور صلعم کے تتبع میں داڑھی رکھتا ہو تو اسے مبارک ہو اور اگر کوئی نہیں رکھتا تو ہم اسے ناقص الاسلام نہیں کہہ سکتے اسلام چند اخلاقی و روحانی اقدار کا نام ہے۔ کسی فرد میں یہ اقدار موجود ہیں تو مسلم ہے خواہ وہ باریش ہو یا بے ریش۔

تفاصیل بالا سے یہ حقیقت آپ پر کھل گئی ہوگی کہ اسلام کی بلند تعلیمات ہر دور میں انسانی فوز و فلاح کی ضامن ہیں اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل گویا خدائے علیم و خبیر کو حکمت و دانش پر نکتہ چینی کرنا ہے۔

# انگریزی اور ملّتِ پاکستان

(صدرِ پاکستان نے ۱۹۵۸ء میں ایک تعلیمی کمیشن بنایا تھا۔ اس کمیشن نے سفارش کی ہے کہ انگریزی زبان کو مزید پندرہ برس کے لیے اعلیٰ درسگاہوں اور دفاترِ حکومت میں رائج رکھا جائے میرے ناقص نقطہ نگاہ سے یہ سفارش بوجہ ذیل ایک المِ حادثہ ہے)

جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ماں کے دودھ کے ساتھ ماں کی زبان بھی اِس کی رُوح میں تحلیل ہونے لگتی ہے۔ بڑا ہو کر وہ اِسی زبان میں بولتا اور گاتا ہے۔ ادبِ عالیہ دراصل رُوح کی آواز ہے، جو گیتوں اور نثر پاروں میں ڈھل جاتی ہے اگر کسی قوم کی دانش گاہوں میں اس کی مادری زبان ذریعہ تعلیم نہ ہو تو اُس کی رُوح بے آواز رہ جاتی ہے۔ اور اس کا ادب اوّل تو معرضِ وجود میں آتا ہی نہیں۔ اور اگر آئے بھی تو بے جان و بے رواں ہوتا ہے۔ جس طرح آم اور لیچی کے درخت ایک خاص ماحول میں پرورش پاتے ہیں اسی طرح ایک قوم کا ادب اس کی زبان کی آغوش ہی میں جوان ہو سکتا ہے، ادب روح کی تخلیق ہے، اور روح مادری زبان ہی میں بول سکتی ہے۔ اگر اقبالؒ انگریزی میں شعر کہتے، تو شاید اُن کی طرف ایک دل بھی متوجہ نہ ہوتا، لیکن جب ان کی عظیم رُوح اردو اشعار میں ڈھل کر سامنے آئی تو دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ میں نور و سرور کی ایک دنیا بسا گئی، اگر حسرتؔ، تاثیرؔ، پطرسؔ، جوشؔ، نیازؔ وغیرہ انگریزی

میں لکھتے تو تمسخر بن کر رہ جاتے۔ اگر آج ہمارے ادب میں کچھ جان ہے تو انہی حضرات کی مساعی کا نتیجہ ہے یہ لوگ یونیورسٹیوں کی نیج نہیں۔ بلکہ رائج نظام تعلیم کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھے۔ ان لوگوں نے اپنی روح کو ناطق و گویا رکھنے کے لیے ایک ایسی زبان میں مہارت پیدا کی جس کی حیثیت ملکی درس گاہوں میں ہیچ سے زیادہ نہیں تھی۔

کون نہیں جانتا کہ جسمانی دھندوں سے فراغت پانے کے بعد وہ روحی تقاضوں کی تسکین کا بھی سامان کرے۔ ہلکی پھلکی کتابیں پڑھے، بہت کے گائے ہوئے گیت سنے، ملکی ادب میں اپنی قوم کے ذہن و کردار کی تصویر دیکھے اور اپنے ادیبوں کی لکھی ہوئی کہانیوں میں اپنی داستان پڑھے۔ کیا یہ چیز انگریزی میں ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں آخر ایک ایسا ادیب تو ہندوستان میں پیدا ہوتا جس کی تخلیقات کو ہماری روح قبول کرتی، ایسا کوئی نہیں اور نہ آئندہ کوئی ہوگا۔

اپنے دیہات میں گھومیے۔ آپ کو گھر گھر ماہیے، ڈھولے، ہیر۔ بلھے شاہ اور باہو کی کافیوں کا چرچا ملے گا، یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان شاعروں کی روح انگریزی زبان کی کال کوٹھڑیوں میں مقید نہیں تھی، یہ لوگ وارداتِ دل اپنی ماں کی پیاری زبان میں سناتے رہے اور دل کی بات دل ہی میں جا ٹھہرتی ہے۔ بقولِ جگر ؎

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

ان گیتوں میں کہیں وصل و انتظار کی داستانیں ہیں کہیں قدیم روایات کی کہانی، کہیں جانِ کائنات کے سامنے بے تاب روح کی گڑگڑاہٹ اور کہیں پاکیزہ

وبلند اقدار آدمیت کی تفصیل یہ گیت کانوں تک پہنچتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں اور ہماری روح میں یوں جذب ہو جاتے ہیں، جیسے برسات کی ہواؤں میں نم۔ یہی ہمارا سرمایہ ہے اور اسی پر ہم نازاں ہیں۔

**انگریزی زبان کی افادیت** انگریزی زبان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جو علوم و فنون سے مالا مال ہے۔ ان علوم تک پہنچنے کے راستے دو ہی ہیں۔ کہ یا تو ہم انگریزی پڑھیں، اور یا ان علوم کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ تعلیمی کمیشن نے پہلا راستہ اختیار کیا ہے اور دوسرے کے متعلق اتنا بھی نہیں بتایا۔ کہ تصنیف و ترجمہ کے ادارے کب بنیں گے؟ کون بنائے گا؟ اور اس کی رفتارِ کار کیا ہوگی۔

اگر حکومت آج اعلان کر دے، کہ سائنس، تاریخ، فلسفہ، تنقید، آئین، قانون شہریت، اقتصادیات و دیگر علوم کی دس دس کتابیں ترجمہ کرنے کے لیے سو آدمی مطلوب ہیں۔ جنہیں پانچ روپیہ فی صفحہ کے حساب سے معاوضہ دیا جائے گا، تو پانچ پانچ سو صفحات کی سو کتابیں سو دنوں میں ترجمہ ہو جائیں۔ میں نے ابن القفطی کی مشہور عربی کتاب تاریخ الحکماء جو چھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اسی دنوں میں ترجمہ کر ڈالی تھی، پانسو صفحات کی ایک کتاب کے ترجمہ و طباعت پر اندازاً پانچ ہزار خرچ آتا ہے۔ اگر طباعت و اشاعت کا کام بھی حکومت ہی کو کرنا پڑے۔ تو ایک لاکھ میں بیس (20)، دس لاکھ میں (10) دو سو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اگر رقم دگنی کر دی جائے تو ایک برس میں چار سو اور دس برس میں چار ہزار کتابیں ترجمہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ کام کرنے ہی سے ہوگا۔

روسی ۱۹۱۸ء تک اور چینی ۱۹۵۰ء تک جہالت میں رسوائے عالم تھے، آج علوم و فنون کے امام مانے جاتے ہیں، یہ لوگ اپنے بچوں کو سائنسی علوم انگریزی میں نہیں پڑھاتے

اُن بلند ہمتوں نے مختلف یورپی زبانوں کا سائنسی ادب اپنی زبانوں میں منتقل کر لیا ہے۔ کیا ہم یہ کام نہیں کر سکتے؟ دو منٹ کے لیے تسلیم کیجیے کہ اُردو کا دامن سائنسی علوم سے خالی ہے اس لیے سرِدست اس میں سائنسی علوم کی تدریس اعلیٰ پیمانے پر نہیں ہو سکتی، لیکن قوم کو یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے۔

۱۔ کہ بی۔ اے میں تاریخ، شہریت اور جغرافیہ جیسے مضامین کو انگریزی میں کیوں پڑھایا جا رہا ہے؟ اگر مقصد یہ ہو کہ بچے انگریزی میں زیادہ ماہر ہو جائیں، تو میں پوچھتا ہوں کہ ہم نے گذشتہ ڈیڑھ سو برس میں ایسے ماہرین کتنے پیدا کیے ہیں؟ ماضی کو جانے دیجیے، یہ فرمائیے کہ اس وقت اس زبان کو صحیح لکھنے والے کتنے ہیں؟ شاید ایک سو بھی نہ ہوں۔ اگر ہوں بھی تو ہمارے کس کام؟ کیا قوم کے ہزار ہا بچوں کو محض اس لیے انگریزی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے کہ شاید ہر سال دو چار اچھے مقرر پیدا ہوں جائیں یہ مقصد تو کوئی مقصد نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ بین الاقوامی حلقوں مثلاً اقوام متحدہ وغیرہ میں انگریزی کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے، تو میں عرض کروں گا، کہ جب انہی اداروں میں دیگر تمام نمائندے اپنی اپنی زبانوں میں خطاب کرتے ہیں، تو ہماری راہ میں کونسی رکاوٹ ہے۔

۲۔ یہ کیوں ہے کہ ہر کالج کا پرنسپل اسناد و انعامات کے جلسے میں انگریزی میں رپورٹ پڑھتا ہے؟ پرنسپل پاکستانی، طلبہ پاکستانی، مہمان پاکستانی اور تقریریں انگریزی میں۔

۳۔ یہ کیوں ہے کہ پاکستان کے تمام دفاتر انگریزی میں خط و کتابت کر رہے ہیں حکام ماتحتوں سے یہی زبان بول رہے ہیں۔ نوٹنگ اور ڈرافٹنگ سب اسی زبان میں ہو رہا ہے۔ اگر انگلستان میں یہی حرکت کوئی انگریز کر بیٹھے۔ یعنی کوئی حکم۔ اُردو، چینی

رُدمی یا فارسی میں جاری کردے تو قوم اُسے اٹھا کر دوبارہ انگلستان میں پھینک دے۔

انٹرویو: انٹرویو کا مقصد تو یہ ہے کہ امیدوار کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے، کہ امیدوار سے اس کی اپنی زبان میں سوال پوچھے جائیں۔ اگر ہم ایک جرمن سے پشتو میں گفتگو شروع کر دیں تو ظاہر ہے کہ وہ منہ تکتا رہ جائے گا۔ ہمارے ملک میں یہ حادثہ ہر امیدوار کے ساتھ ہو رہا ہے۔ سروس کمیشن اور دیگر بورڈز میں بڑے بڑے انگریزی دان بیٹھ جاتے ہیں جب ایک امیدوار ڈرتے کانپتے سامنے آتا ہے تو انگریزی میں اُلجھے ہوئے سوالات اس سے پوچھے جاتے ہیں امیدوار کی نس نس سے پسینہ پھوٹ نکلتا ہے، اُس کی سانس تیز ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے، وہ دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کتنے ہی ایسے جوہرِ قابل ہیں جو ان انٹرویوز کا شکار ہو کر رہ گئے اور نااہل منتخب ہو گئے۔

میں خود کئی مرتبہ اس حادثے سے دوچار ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بورڈ کے سامنے گیا، تو ایک ممبر نے میری اپنی کتاب "قرآن" کے متعلق انگریزی میں سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ اس کتاب میں کافی سائنسی نظریات بیان ہوئے ہیں۔ میں ٹھہرا آرٹس کا طالب علم، سائنسی اصطلاحات سے ناآشنا چنانچہ میں اپنی اِس تخلیق کے متعلق بورڈ کو مطمئن نہ کر سکا اور اُس نے مجھے نالائق سمجھ کر مسترد کر دیا۔

میرے ایک دوست جو ایم۔ اے عربی فرسٹ کلاس اور ایم۔ اے اسلامیات سیکنڈ کلاس ہونے کے علاوہ مدارسِ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ اور عربی کے لکچرر بننا چاہتے تھے۔ چار مرتبہ انٹرویو میں محض اس لیے ناکام رہے ہیں کہ وہ رواں انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ حالانکہ ایم۔ اے تک عربی اردو میں پڑھائی جاتی ہے۔ اور انگریزی

کسی منزل پر بھی ذریعہ تعلیم نہیں۔ تو صورتِ حال یوں ہوتی، کہ فوج میں کوئی افسر بیٹھا ہو یا کالج میں کوئی لیکچرار، ایکسائز کا کوئی انسپکٹر درکار ہو یا کسی دفتر میں کوئی اکاؤنٹنٹ۔ اگر امیدوار انگریزی بول سکتا ہے تو بہت اچھا ہے ورنہ نالائق۔

اقدار: اسلام دو قسم کی اقدار کا قائل ہے ایک وہ جو حالاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہیں۔ مثلاً نظامِ سلطنت کیسا ہو، شخصی یا جمہوری، وزرا منتخب ہوں یا نامزد عدلیہ کی تشکیل کیسی ہو۔ ریل اور ڈاک کے قوانین کیا ہوں۔ لباس کیسا پہنا جائے، سر کے بال کس وضع کے ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اور دوسرے وہ جو محکم، اٹل اور ناقابلِ بدل ہیں مثلاً عدل، حیا، عفت، احسان، رحم، ایثار، حصولِ علم، تنظیم، ایمان، توحید، محبت وغیرہ۔ یہی وہ اقدار ہیں، جن کے زوال سے قومیں تباہ ہوتی رہیں، اور جن کی بقا حیاتِ ملی کی ضامن ہے۔ ان کی اقدار کی تفصیل یا تو عربی و فارسی میں ملتی ہے یا اردو میں، اردو سے رشتہ منقطع ہونے کے بعد ان اقدار کو زندہ رکھنا مشکل ہے۔

ہر زبان کا ادب قومی کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ جہاں جہاں یہ ادب پہنچتا ہے۔ اس قوم کے افکار، نظریات اور اقدارِ حیات کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ ان افکار و اقدار میں کچھ اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بری، برے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اچھی اقدار اپنی زبان میں دیں۔ اگر اجنبی افکار کا زہر ہمارے معاشرہ کے رگ و پے میں داخل ہوتا رہا اور اس کا علاج نہ کیا گیا تو دیر و زود ہمیں اس کے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

اب مغرب سے یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ مذہب کو زمین سے اور خدا کو آسمان سے نکال دو، زن و مرد کے میل ملاپ پر سے پابندیاں اٹھا دو۔ پیٹ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے گرد گھومتے رہو جنسیت بلند ترین جذبہ ہے، اس کی

خاطر سب کچھ کر گزرو، بھینس اُسی کی ہے جس کے پاس لاٹھی ہے۔ انسان کی فوقیت رنگ و نسل کی وجہ سے ہے، سب سے بڑا قبیلہ وطن ہے جتنے وطن اتنی ہی قومیں ہیں ۔

کیا کوئی مخلص پاکستانی یہ برداشت کر سکتا ہے۔ کہ نوجوانانِ پاکستان افکار و نظریات کی اِن تُند آندھیوں میں تنکوں کی طرح اڑتے پھریں؟ کچھ فرائڈ کی گود میں چلے جائیں، کچھ کارل مارکس کے گرد جمع ہو جائیں۔ کچھ یورپ کی عیش کوشی کو اپنا دین بنا بیٹھیں اور اقبالؔ اور قائداعظم کی عظیم روحیں تڑپتی رہ جائیں۔

آج ہر دوسرے یا تیسرے پاکستانی گریجویٹ کی کیفیت یہ ہے کہ اسلام کی اقدارِ عالیہ سے ناآشنا ہے۔ حیاتِ بعد الموت کا منکر ہے۔ قرآن کو دورِ جدید کے تقاضوں کے لیے ناکافی سمجھتا ہے، ان میں سے بعض خدا کے انکاری ہیں، اور انسانیتِ کبریٰ کے تصوّر تک سے بیگانہ ہیں۔ اگر اس صورتِ حال کا جلد علاج نہ کیا گیا۔ تو ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا اور ہمارا کارواں ایک بے مقصد و بے منزل بھیڑ بن کر رہ جائے گا۔

**دروغ گوئی** | انگریزی بڑی ٹیڑھی زبان ہے۔ اس کے محاورات لاتعداد اور الجھے ہوئے ہیں۔ مترادفات میں تمیز بہت مشکل ہے۔ ہزار میں سے بمشکل ایک یا دو طلبا ایسے نکلتے ہیں جو اس زبان کو کسی حد تک صحیح بول یا لکھ سکتے ہوں۔ پھر ہمارے ہاں انگریزی زدہ حکام کی دماغی کیفیت یہ ہے کہ اپنے ماتحتوں اور دوستوں سے انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ مخاطب احتراماً انگریزی میں جواب دینے کی کوشش کرتا ہے اور جہاں زبان ساتھ نہیں دیتی وہاں جھوٹ بول کر جان چھڑا لیتا ہے، فرض کیجئے کہ ایک کلرک کے کولھے میں درد ہو رہا ہے اور وہ اپنی کرسی پر بیٹھا کراہ رہا ہے، اوپر سے افسر آ جاتا ہے اُسے دیکھ کر پوچھتا ہے "WHAT IS WRONG WITH YOU" اب کلرک نہ کولھے کی انگریزی جانتا ہے

نہ سمجھ سکے گی، اس لیے وہ "NO-THING SIR" کہہ کر جان چھڑا لیتا ہے۔ یہ حادثہ کلرکوں ہی کو پیش نہیں آتا بلکہ ہر روز ہزارہا ملازمین اس مصیبت کا شکار بنتے ہیں اور یوں اچھے خاصے شریف آدمیوں کو بلا وجہ جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور جھوٹ دیگر تمام قبائح مثلاً۔ منافقت، وعدہ شکنی، خیانت، بددیانتی وغیرہ کے دروازے کھول دیتا ہے۔

مسخرا پن: چھوٹے بڑوں کی نقل اتارتے ہیں۔ جب بڑے لوگ اٹھتے۔ بیٹھتے۔ انگریزی بولتے اور اس پر اتراتے ہیں تو چھوٹوں میں بھی بڑا بننے کا شوق پیدا ہوتا ہے ماقی الضمیر کو مکمل طور پر ادا نہیں کر سکتے اس لیے ایک فقرہ اردو کا اور دوسرا انگریزی کا بولتے ہیں، ان کی زبان کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔

میرا GUESS یہ ہے کہ سمٹ کانفرس میں ..... DISARMAMENT اور کنٹرول آن اٹامک انرجی کے علاوہ انڈو چائنا ڈسپیوٹ اور ڈی ٹرینیشن آف کمیونسٹک سنیفر بھی انڈر ڈسکشن آئیں گے AND MY OPINION IS THAT ایسٹ اور ویسٹ میں کلیش INEVITABLE ہے۔"

یہ ہے وہ زبان جو پاکستانی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہر مقام پر ہر وقت بول رہے ہیں، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ایک سٹیج ہے۔ جس پر ہم لوگ مسخروں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔

اصل اور نقل: معتبر راوی کا بیان ہے، کہ موجودہ حکومت کے ایک سیکرٹری کراچی سے سوار ہوئے، اس ڈبے میں ایک انگریز بھی سفر کر رہا تھا۔ ٹرین چل پڑی تو سیکرٹری اور انگریز میں یہ گفتگو ہوئی۔

سیکرٹری:- شاداو صاحب! کیہہ حال اے — بال بچے راضی نی —

انگریز۔ "SORRY , I DONT FOLLOW YOU"

سیکریٹری:۔ ہیں پچھلا ہاں، تیرا گھر کیتھے ہے۔ گھر۔ گھر۔

انگریز:۔ ہمارا گھر لنکا شائیر

سیکرٹری:۔ بیوی نال ای، کہ چھڑا چھانڈا ای۔

انگریز۔ بیوی لوگ ادھر ولایت میں ہونا مانگتا۔

اس نہج پر گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ کوئی بڑا اسٹیشن آگیا۔ جہاں اس سیکرٹری کے کچھ ماتحت افسر پلیٹ فارم پر انتظار کر رہے تھے۔ سیکرٹری نے سر باہر نکالا، ان سے انگریزی میں چند ایک باتیں کیں۔ جب گاڑی چل پڑی تو اپنی سیٹ پر واپس آگیا، اس اثنا میں انگریز کا پارہ کافی چڑھ چکا تھا، اس نے غصے سے پوچھا۔

انگریز:۔ جب آپ اتنی اچھی انگریزی بول سکتے ہیں تو اتنی دیر تک مجھے کیوں، خراب کرتے رہے؟

سیکرٹری:۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا تھا، کہ آپ پاکستان میں ہیں، اور آپ کا یہ فرض ہے، کہ اس ملک کے باسیوں سے ان کی زبان میں گفتگو کریں، ولایت میں آپ اصل ہوتے ہیں اور ہم نقل۔ ہمیں بھی یہ موقعہ ملنا چاہیے، کہ کسی وقت ہم اصل کا پارٹ ادا کر رہے ہوں اور آپ نقل کا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے، کہ آپ ولایت میں بھی اصل ہوں اور پاکستان میں بھی۔ اور ہم دونوں جگہ نقل ہی رہیں۔

انگریز:۔ اس نادر خیالی سے بہت متاثر ہوا۔

یہ کتنا بڑا قومی حادثہ ہے کہ ہم ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ مسخرے اور نقال کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ہماری نہ کوئی زبان ہے نہ کوئی لٹریچر، نہ ثقافت اور نہ روایات۔

بیرونی ممالک سے چند سطحی سی چیزیں سیکھ کر آتے ہیں اور انہیں اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس قوم کے پاس خدا کا آخری اور مکمل پیغام موجود ہو، جس کی تاریخ عظیم و جمیل روایات سے لبریز ہو، جس کا ماضی۔ غزالی، رومی، ابنِ حنبل، ابنِ قیمؒ، الرازی، طوسی اور اس قسم کے ہزارہا آفتابوں اور مہتابوں سے درخشاں ہو۔ جس کے پاس اقبال و غالب جیسے شعرا، داتا، عطار، ہجویری اور جنید جیسے اہلِ دل، ابن خلدون والبیرونی جیسے مؤرخ، جاحظ و کندی جیسے علمائے طبیعی، ابنِ رشد و رازی جیسے فلسفی، بخاری و مسلم جیسے محدث، ابنِ تیمیہ و ولی اللہ جیسے محقق، طارق، خالد اور ابنِ قاسم جیسے جرنیل، فاروق اعظمؓ وحیدرؓ جیسے خلفاء، اتاترک، و قائد اعظم جیسے رہنما موجود ہوں اسے نقال بننے کی ضرورت کیا ہے۔

**انگریز کا اردو سے سلوک** جب کوئی قوم کسی دوسرے ملک پہ قابض ہو جاتی ہے تو محکوموں کی قومیت، حمیت، تہذیب، ادب، زبان اور روایات کو ختم کرنے کے لیے کئی قدم اٹھاتی ہے، اُن میں سے مہلک ترین یہ کہ دفتروں اور سکولوں میں اپنی زبان جاری کر دیتی ہے۔ اور جو محکوم اس اجنبی زبان میں کچھ دسترس پیدا کر لیتے ہیں۔ انہیں راج دربار میں بڑا مقام دیتی۔ اپنی زبان بولنے والوں سے توہین آمیز سلوک کرتی ہے اور رفتہ رفتہ ملکی زبان علوم و فنون سے خالی ہو جاتی ہے۔

گذشتہ دو سو برس میں، انگریز نے جو سلوک ہماری زبان سے کیا، اس سے آپ آگاہ ہیں۔ اسے دفتروں، عدالتوں اور درسگاہوں سے نکال باہر کیا۔ اور جن لوگوں نے اس زبان میں مہارت پیدا کی انہیں کوئی مقام نہ دیا۔ اگر کیا بھی تو صرف اتنا

کہ بارہ روپے کا پٹواری بنا دیا، یا پندرہ روپے کا دیہاتی مدرّس، اور یا چنگی محرّر۔

انگریز چلے گئے۔ لیکن اردو کی بیکسی کا وہی عالم ہے۔ آج تک کسی مجسٹریٹ یا جج کو اردو میں فیصلہ لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آج تک کسی پرنسپل نے اپنی سالانہ رپورٹ اُردو میں نہیں لکھی، آج تک لاہور سکرٹرایٹ سے کوئی خط اردو میں جاری نہیں ہوا اور اب تک کسی یونیورسٹی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اُردو کو لازمی قرار دے۔ ہمارے ہاں ایسے افراد بھی موجود ہیں جنھوں نے آج تک نجی خطوط اُردو میں نہیں لکھے، اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے منہ سے اردو کا کوئی جملہ کسی شدید مجبوری کے سوا آج تک نہیں نکلا۔

**علوم وفنون اور اقوامِ عالم** آج اس زمانے میں کہ۔ جرمنی، فرانس، برطانیہ ماسکو اور رُوما اپنی لاکھوں بلکہ کروڑوں کتابوں پہ نازاں ہیں۔ ہم پاکستانی اپنی لائبریریوں میں جاتے ہیں، تو آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہ المناک صورت اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک ہمارا نوجوان اپنی زبان میں تعلیم حاصل نہیں کرے گا، اور اس میں قومیّت کا شدید احساس پیدا نہیں ہوگا۔ علوم وفنون قصرِ قومیّت کے ستون ہیں اور ستونوں کے بغیر محل کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

**انگریزی زبان کی کہانی** جن حالات سے اس وقت ہم دوچار ہیں۔ ان سے کبھی انگریز بھی گزرے تھے۔ فرق یہ ہے کہ ہم آزاد ہوتے ہی اپنی زبان کو ترقی دینے کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں اور دوسری طرف انگریز کو سنبھلتے سنبھلتے سولہ سو سال گذر گئے تھے۔ اس طویل عرصے میں یہ قوم لاطینی یا فرانسیسی میں لکھتی رہی اور اس کی اپنی زبان گھسیاروں اور مزدوروں کے جھونپڑوں سے باہر قدم نہ رکھ سکی۔ اس دور

میں اگر کوئی انگریز انگریزی میں کچھ لکھ بیٹھتا تو شرم سے چھپاتے پھرتا، کہ کہیں مہذب انگریزوں کی نگاہ سے گر نہ جائے۔

تفصیل داستان قدیم زمانے میں انگلینڈ وحشی قبائل کا مسکن تھا۔ پرانے آثار سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ لوگ ہل چلاتے، کپڑا بنتے اور مٹی کے برتن بناتے تھے۔ ۸۰۰ ق-م میں یورپ سے کچھ حملہ آور اس علاقے میں داخل ہوئے یہ سلیٹس CELTS اور بریٹن (BRITON) کہلاتے تھے سلٹ شمالی انگلستان اور آئرلینڈ پہ قابض ہو گئے اور دوسری شاخ جنوبی حصے میں اقامت پذیر ہو گئی اور یہ حصہ بریٹن یا برٹن کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ تمام قبائل کاشت کار تھے، ہر قبیلے کا سردار جدا جدا تھا مذہباً بت پرست تھے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔

رومنوں کی آمد ۵۵ ق، م میں رومنوں کے مشہور شہنشاہ جولیس سیزر نے انگلستان پر حملہ کیا اور واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد دوسرا حملہ کیا اور غلاموں کی ایک خاصی تعداد لے کر دوبارہ واپس چلا گیا اور جلد ہی بروٹس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے بعد رومن خانہ جنگی میں الجھ گئے اور برسوں کسی اور ملک کی طرف توجہ نہ کر سکے۔

اُن دنوں فرانس روما کا ایک صوبہ تھا جہاں سے سیکڑوں سیاح اور تاجر ولایت جاتے اور وہاں رومی تہذیب و زبان اور لباس کی نمائش کرتے تھے، اس میل جول سے ولایت کے لوگ کافی متاثر ہوئے۔ اُس دَور کا مشہور برطانوی سردار سمبلین (SYMBLINE) تھا جو سنہ ۵ ق م سے ۴۰ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ لندن شہر کی بنیاد اس نے ڈالی تھی۔ یہ سردار رومی ادب و اطوار سے بہت متاثر تھا۔ اور اپنے

حلقہ اثر میں رومی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے کوشاں تھا۔ جب سنہ ۴۳ء میں رومی انگلستان پہ سہ بارہ حملہ آور ہوئے تو انھیں ملک کو مسخر اور لوگوں کو رام کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ رومیوں نے یہاں سنہ ۴۱۰ء تک حکومت کی۔

**نئے حملہ آور** رومیوں کے بعد یورپ سے تین اور قبائل، جو اینگلز، سیکسنز اور جوٹس کے نام سے مشہور تھے، انگلستان پہ حملہ آور ہوئے اور مختلف حصوں پہ قابض ہو گئے۔ جو علاقہ اینگلز کے حصے میں آیا۔ وہ اینگلز لینڈ کہلانے لگا۔ یہ قبائل لامذہب اور خونخوار تھے برطانیہ رومیوں کے تحت عیسائیت قبول کر چکا تھا۔ ان قبائل نے پادریوں کو قتل اور گرجوں کو جلانا شروع کر دیا۔ لوگ ڈر سے عیسائیت چھوڑ گئے اور جنھیں مذہب بہت عزیز تھا وہ ویلز کے پہاڑوں اور شمالی نقطوں میں بھاگ گئے، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان قبائل نے بھی عیسائیت قبول کر لی۔ حالات اسی نہج پہ چلتے رہے اور گیارھویں صدی کے وسط میں واقعات نے ایک نئی کروٹ لی۔

**فرانسیسیوں کی آمد** اس وقت انگلستان سات ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن پر سات راجے حکمران تھے ان میں سے ایک کا نام ایڈورڈ تھا۔ اس کی والدہ فرانس کے ایک صوبہ نارمنڈی کی رہنے والی تھی، ایڈورڈ خود بھی وہیں پلا تھا، اسے فرانسیسیوں کے طور طریقے بہت پسند تھے۔ اور اسی بنا پر اس نے اپنے دربار میں کافی فرانسیسی بھر لیے تھے۔ یہ سنہ ۱۰۴۲ء میں برسرِ اقتدار آیا۔ جب سنہ ۱۰۶۶ء میں اس کی وفات ہوئی۔ تو اس کا چچا زاد، جس کا نام ولیم تھا اور نارمنڈی کا ڈیوک تھا۔ جانشینی کا مدعی بن گیا۔ جب اس کے مطالبہ پر غور نہ ہوا ------ تو اس نے ولایت پر حملہ کر دیا اور معمولی مزاحمت کے بعد ملک پر قابض ہو گیا۔ نارمنڈی کی نسبت سے یہ لوگ نارمن

کہلاتے تھے، ان کی حکومت ولایت پر بھی تھی اور نارمنڈی پر بھی۔ اندازاً سو سال کے بعد نارمنڈی ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ حکمران برطانوی قومیت ہی میں جذب ہو کر رہ گئے۔

زبان کے سلسلے میں دو ہی حملہ آور قابل ذکر ہیں۔ اوّل رومی جو ۴۳ء سے ۴۱۰ء تک حکمران رہے۔ دوم فرانسیسی یا نارمن، جو ۱۱۵۴ء کے بعد برطانیہ ہی میں جذب ہو گئے، اِن دونوں کی سلطنت کا مجموعی زمانہ ساڑھے چار سو برس بنتا ہے....
لیکن انگریزی اجنبی اثرات کی سِل کے نیچے پندرہ سو برس تک دبی رہی۔
رومیوں کی زبان لاطینی تھی۔ جسے انھوں نے دفتروں، درباروں اور درسگاہوں میں جاری کر دیا، اور اس زبان میں مہارت کو شرطِ ملازمت بنا دیا۔ رفتہ رفتہ اونچے طبقے کے لوگ یہی زبان بولنے لگے اور اہلِ قلم بھی اِسی زبان میں لکھنے لگے۔ گو ۴۱۰ء میں رومیوں کا اقتدار ولایت میں ختم ہو گیا تھا، لیکن پندرہ سو برس تک کلیسا اور اہلِ علم کی زبان لاطینی ہی رہی بارہویں صدی میں ATHE WARD نامی ایک انگریز تلاشِ علم میں بغداد پہنچا۔ وہاں مسلم علماء سے چند عربی کی کتابیں پڑھیں اور واپسی پر عربی زبان کی دو کتابیں ساتھ لے آیا۔ ایک علمِ نجوم پر تھی اور دوسری مقالاتِ اقلیدس اس نے دونوں کو لاطینی میں منتقل کیا۔ اور ساتھ ہی "اصطرلاب" پر اسی زبان میں ایک کتاب لکھی۔ اِس کے یہ تراجم برسوں تک ولایت کی درسگاہوں میں بطورِ نصاب استعمال ہوتے رہے۔

۱۱۴۱ء میں رابرٹ اور اس کا دوست، ڈی۔ ہرمن۔ ولایت سے چل کر ہسپانیہ پہنچے اور وہاں عرب اساتذہ سے عربی کی کتابیں پڑھتے رہے۔ واپسی پر رابرٹ

نے قرآن کا ترجمہ لاطینی میں اپنے ہم وطنوں کے سامنے پیش کیا۔ اِسی زمانے میں الیگزینڈر نکم نے سائنس پر ایک کتاب لکھی جو غالباً انگلستان میں اِس موضوع پر پہلی کتاب تھی، لیکن لاطینی میں۔ ایک اور انگریز ڈراہم نے بائبل کی تاریخ لاطینی اشعار میں قلمبند کی، اس دور کی مشہور تاریخی کتابیں (۱) "ولیم اوّل کی تاریخ — (۲) انگریز بادشاہوں کی تاریخ — (۳) یومیہ واقعات" وغیرہ سب لاطینی میں ہیں رومی پہلی صدی عیسوی میں آئے اور پانچویں صدی کے آغاز میں چلے گئے تھے۔ لیکن ان کی زبان کی گرفت اتنی شدید تھی کہ انگریزی ذہن اور قلم سولہ سو برس تک آزاد نہ ہو سکے، تھامس مور نے اپنی مشہور تصنیف "یوٹوپیا" (۱۵۱۹ء) اور بیکن نے — NOVAM ORGANUM (۱۶۲۰ء) لاطینی ہی میں لکھی تھی۔

فرانسیسیوں کا اثر | لاطینی کا طوطی تو بول ہی رہا تھا، ۱۰۶۶ء میں فرانسیسی آئے تو انگریزی زبان کی حیثیت اور گر گئی۔ اب صورت حال یہ تھی، کہ دفتروں، درباروں اور درسگاہوں کی زبان تو فرنچ ہو گئی اور کلیسا میں لاطینی کے ساتھ فرنچ بھی استعمال ہونے لگی۔ اونچے طبقے حکمرانوں کی زبان بولنے لگے اور انگریزی صرف مزدوروں، چھوٹے دوکانداروں اور کاشت کاروں کی بولی بن کر رہ گئی۔

فرانسیسیوں کا سیاسی غلبہ صرف ایک سو برس رہا۔ لیکن اُن کی زبان ساڑھے تین سو برس تک دفتروں اور درسگاہوں پر چھائی رہی۔ ۱۳۵۰ء میں پہلی مرتبہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ۱۳۶۲ء میں کسی عدالت نے پہلا فیصلہ انگریزی میں لکھا اور ۱۳۹۹ء میں انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم نے پارلیمان کو پہلی مرتبہ انگریزی میں خطاب کیا۔

ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ انگریزی میں کچھ لکھنا تو در کنار، بات تک کرنا نشان ذلت واستحقار سمجھا جاتا تھا، لیکن آج کا انگریز اُس مجسٹریٹ کو اپنا ہیرو سمجھتا ہے۔ جس نے پہلا فیصلہ انگریزی میں لکھا تھا، اور اُس بادشاہ کا انتہائی احترام کرتا ہے جس نے پارلیمان کو پہلی مرتبہ انگریزی میں خطاب کیا تھا۔ ہر قوم چند چیزوں پر فخر کیا کرتی ہے، اپنی تہذیب، زبان، اپنے ادب، پرچم اور ترانے پر۔ ان سب میں زبان اور ادب کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ جس قوم کے پاس اپنا ادب نہیں وہ جاہل بھی جاتی ہے۔ اسے اقوام عالم کی صف میں کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا اور مورخ اس کا نام کبھی احترام سے نہیں لیتا۔

آپ نے چنگیز اور ہلاکو کے نام سنے ہوں گے، بلا کے فاتح اور غضب کے جرنیل تھے، ایک زمانہ تھا کہ منگولیا سے ماسکو شام اور ہندوستان تک ان کا پرچم لہرا رہا تھا، لیکن، مورخ انھیں وحشی خونخوار اور ڈاکو لکھتا ہے۔ انھوں نے بیشک خون ریزی کی ہو گی لیکن اتنی نہیں جتنی پہلی جنگ میں یورپ کے مہذب لوگ ایک، ایک دن میں کیا کرتے تھے، وہ لوگ عیاشی و شراب میں بھی فرنگیوں سے بہت پیچھے تھے، تو پھر وہ وحشی کیوں کہلائے؟ اس کی وجہ صرف تھی کہ ان کے پاس اپنا ادب نہیں تھا، اُن کی لائبریریاں اور ان کے سینے نورِ علم سے خالی تھے، اگر پاکستان نے جلد اپنی زبان کو اپنا نہ بنایا، اس میں علوم وفنون کے انبار نہ لگائے تو کل کا مورخ ہمیں بھی جاہل۔ وحشی اور بے علم لکھنے پر مجبور ہو جائیگا، اور آنے والی نسل ان ارباب اقتدار کو کبھی معاف نہیں کرے گی، جو آج اُردو کو دانش گاہوں، دفتروں اور عدالتوں میں داخل نہیں ہونے دیتے

**فتح قسطنطنیہ کا اثر یورپ پر:** جب سلطان محمد عثمانی نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ تو وہاں سے علمی شوق کی ایک لہر اٹھی جو بہت جلد یورپ میں پھیل گئی ہر طرف حصولِ علم اور تصنیف و تالیف کا چرچا ہونے لگا۔ سب سے پہلے اٹلی پھر فرانس اور جرمنی آخر میں انگلستان متاثر ہوا۔ بعض انگریزی علماء نے یونانی و عربی سیکھ کر آکسفورڈ میں اس کی تدریس شروع کر دی، ساتھ ہی ملکی زبان کو فروغ دینے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ چنانچہ ۱۵۳۰ء ـ ۱۵۸۰ء کے درمیان خاصی تعداد میں ڈرامے، نظمیں اور کتابیں لکھی گئیں۔ بعد کے پچاس برس میں اکثر کلاسکز کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا۔ اب کچھ فتوحات بھی شروع ہو گئی تھیں۔ ایک انگریز ملاح ڈریک نامی ساری دنیا کا چکر کاٹ چکا تھا۔ برطانوی جہازوں نے ہسپانیہ کے طاقتور بیڑے کو تباہ کر دیا تھا، انگریز تاجر، سیاح اور ملاح نئے نئے جزائر، ممالک کی تلاش میں نکل گئے تھے اور شعرا ادبا کو نئے نئے موضوع مل گئے تھے، اس دور میں چند ہستیاں پیدا ہوئیں۔ مثلاً جان للی سر فلپ سڈنی، ایڈمنڈ سپنسر، بیکن، برٹن، شکسپیر وغیرہ۔ ۱۶۱۱ء میں بائبل کا وہ مشہور ترجمہ ہوا، جو اس وقت رائج ہے اور جو جیمز ٹرانسلیشن کے نام سے مشہور ہے اس کے بعد علم و حکمت کے ہر شعبے میں کتابیں لکھی جانے لگیں اور آج یہ عالم ہے کہ کوئی شعبہ لیجئے، سائنس ہو یا فلسفہ، تاریخ ہو یا ادب، عمرانیات ہو یا روحانیات آپ کو ہزاروں کتابیں ملیں گی اور غالباً یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ آج انگریزی دنیا کی شاداب ترین اور متمول ترین زبان ہے۔

جب انگلستان اجنبی زبانوں کے سحر سے مسحور تھا تو خود انگریزوں کی رائے یہ تھی کہ انگریزی گنواروں کی زبان ہے جس میں ایک کامیاب افسانہ بھی لکھنا

دشوار ہے، لیکن آج یہ دنیا کی بلند ترین زبان سمجھی جاتی ہے۔

آج بعض پاکستانی اربابِ اقتدار کی رائے بھی یہی ہے کہ اردو ایک غیر ترقی یافتہ اور خام زبان ہے۔ اس میں علوم و فنون کو منتقل کرنا مشکل ہے، یہ خیال اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ سترھویں صدی سے پہلے انگریزوں کا اپنی زبان کے متعلق۔ ان لوگوں نے ہمت کی تو لاطینی و فرانسیسی ادب کو میلوں پیچھے چھوڑ گئے، اگر آج ہم ہمت کریں گے تو انشاءاللہ نصف صدی میں یورپ کے علمی کارواں کو جالیں گے، لیکن ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ انگریزی کی نشو و نما اس وقت شروع ہوئی تھی، جب وہ درسگاہوں دفتروں اور دربار کی زبان بن گئی تھی، اسی طرح اردو کا کوکبِ اقبال بھی اسی روز طلوع ہوگا۔ جب اسے یونیورسٹیوں، عدالتوں اور دفتروں میں قدم رکھنے کی اجازت ملے گی۔ اس اجازت میں جتنی تاخیر ہو گی، ہماری بدبختی کے ایام اتنے ہی طویل ہوتے جائیں گے، آج یورپ کی تمام اور ایشیا کی بعض اقوام اپنے عظیم و جلیل ادب پر نازاں ہیں۔ نہ جانے میری قوم کو یہ دن کب دیکھنا نصیب ہوگا آج جن لوگوں نے ہماری زبان کا گلا دبوچ رکھا ہے اگر یہ لوگ قومی محاسبہ سے بچ بھی گئے تو آنے والی نسل اور تاریخ انھیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

<u>کانوینٹ سکولز</u> قومی زبان کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رکھیئے انگلینڈ ایک صنعتی ملک ہے، جس کی آبادی ساڑھے پانچ کروڑ کے قریب ہے اور زرعی زمین اتنی کم ہے کہ سو میں سے دس آدمیوں کی غذا بھی بمشکل پیدا کرتا ہے اور باقی آبادی کی زندگی کا انحصار صرف اِس بات پر ہے کہ افریقہ اور ایشیا سدا زرعی رہیں، لوہے کی ہر چیز ولایت سے منگوائیں اور مبادلہ میں اپنی پیداوار وہاں

بھٹنے رہیں۔ اگر یہ زرعی ممالک بھی فولاد اور فولادی مصنوعات (انجن، موٹریں، ٹرک، ٹریکٹر وغیرہ) کے کارخانے لگا لیں، تو ظاہر ہے کہ انگریز کا مال اس کے گوداموں ہی میں پڑا رہے گا۔ اور اس کی نوّے فی صد آبادی بھوک سے بلکنے لگے گی۔

روس انگریز کا دشمن ہے اور اس کی معاشی حالت سے پوری طرح آگاہ ہے چنانچہ یہ جس ملک سے یارانہ گانٹھتا ہے، وہاں فولاد اور فولادی مصنوعات کے اتنے کارخانے لگا دیتا ہے کہ وہ ملک انگریزی مال سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ آج سے چھ برس پہلے چین انگریز کی اقتصادی گرفت میں تھا، وہاں کی زرعی پیداوار ولایت پہنچ جاتی تھی۔ اور ولایت کی موٹریں، ریڈیو اور دیگر بے شمار فولادی مصنوعات وہاں بکتی۔ ۱۹۵۲ء میں وہاں روس نے قدم رکھا، صرف پانچ برس کی قلیل مدت میں ہزارہا کارخانے لگا دیئے اور انگریز دانت پیس کر رہ گیا، جنگ سویز کے بعد ناصر نے روس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اور روس نے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں فولاد کے دو کارخانے لگا دیئے اور یہ منڈی بھی انگریز سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی۔ پنڈت نہرو روس کی طرف مائل ہوا تو روس نے نو سو انجینئر بھیج دیئے کہ بھیلئی میں فولاد کا ایک عظیم کارخانہ قائم کر دیا۔ مغربی بلاک نے دیکھا کہ ہندوستان ہاتھ سے جانے لگا ہے تو انگریز، امریکہ اور مغربی جرمنی تینوں ایک ایک کارخانہ لے کر بھارت پہنچے، اب وہاں پانچ کارخانے کام کر رہے ہیں۔ جن کی سالانہ پیداوار اسّی لاکھ ٹن ہے، آج بھارت۔ موٹریں انجن، توپیں، ٹینک، ٹرک، ٹریکٹر، سمندری جہاز، طیارے سب کچھ خود بنا رہا ہے اور آئندہ دس برس میں بھارت اتنی بڑی طاقت بن جائیگا کہ کمزور ہمسایوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔ آج سے چند ماہ پہلے روسی وزیر اعظم خروشیف

انڈونیشیا میں گیا تھا، اور چند روز ہوئے اخبارات میں یہ خبر آچکی ہے کہ وہاں روسی انجنیئر فولاد کا کارخانہ قائم کرنے لگے ہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ روس کے تمام دوست طاقتور بن رہے ہیں، اپنے ملک کی تمام زرعی و معدنی پیداوار کے خود مالک ہیں اور دوسری طرف غربی بلاک کے تمام دوست کمزور، بے دست و پا مفلس اور محض کاشتکار بن کر رہ گئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو مراکش، الجزیا، ٹیونس، لیبیا، سوڈان، یوگنڈا، گھانا، برٹش سمالی لینڈ، مڈغاسکر، بحرین، یمن، عرب، بھارڈن، ایران، ترکی وغیرہ پر نگاہ ڈالیے آپ کو فولاد کا کوئی کارخانہ کہیں نظر نہیں آئے گا، ترکی میں ایک کارخانہ لگایا گیا تھا۔ چونکہ مشیر انگریز تھے اس لیے بند پڑا ہے۔ ان تمام ممالک کی اجناس خام پر انگریز پل رہا ہے۔ اور لوگ مفلس سے مفلس تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس حقیقت پر امریکہ کی شہادت ملاحظہ فرمایئے۔

"ٹائم" امریکہ کا ایک اہم میگزین ہے جس کی اشاعت دو کروڑ کے قریب ہے اس کے ایک اشوع مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء میں NATIONS کے عنوان کے تحت درج ہے۔

"طویل جمود کے بعد پچھلے ہفتے مفکرین کی بحث و نظر سے تین باتیں واضح ہوئی ہیں۔ ایک یہ

" کہ جو ممالک کمیونزم کے حلقۂ اثر سے باہر ہیں وہ غریب و مفلس تر ہوتے جا رہے ہیں ترکی غربی بلاک کا پرانا دوست ہے چاہیے تو یہ تھا کہ انگریز اور امریکی اسے اتنا طاقتور بنا دیتے کہ ایشیا کے دیگر ممالک میں بھی ان کی دوستی کی خواہش پیدا ہوتی

لیکن ہوا یہ کہ ترکی کا تنہا کارخانہ فولاد بند پڑا ہے۔ اس کی تمام زرعی پیداوار ولایت میں جارہی ہے وہاں سے تبادلہ میں فولادی مصنوعات اور دیگر اشیا آرہی ہیں اور ملک میں بھوک بڑھ رہی ہے۔

جون ۱۹۵۸ء میں ایک سیاح ڈگی چیپل نامی ترکی میں جا نکلا وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد "ریڈرز ڈائجسٹ" کی اشاعت جولائی ۱۹۵۸ء لنڈن۔ ایڈیشن میں لکھتا ہے:۔

"ترک بلا کا کافی نوش ہے بحیرۂ روم کی کافی "ٹرکش کافی" کہلاتی ہے لیکن آج سارے ٹرکی میں کہیں بھی کافی موجود نہیں اور اس کی وجہ یہ کہ مندریز (ترکی کے وزیر اعظم) سارا زرِ مبادلہ بعض سکیموں کی تکمیل پر صرف کر رہا ہے اور کافی کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا۔ ترکی زبردست مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ وہ سکائی کریپرز اچاس ساٹھ منزلوں والے مکانات بنوا رہا ہے اور زمین دوز نالیاں تیار کروا رہا ہے۔ اس سے ٹرکی کا خزانہ خالی ہو گیا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ ٹرکی بعض اجنبی ممالک کے ہاں رہن ہو چکا ہے۔ آج ٹرکی میں نہ کافی ملتی ہے، نہ موٹر، انجن، بس وغیرہ کا کوئی پرزہ وزیر اعظم کے نکتہ چین اس پر الزام عائد کرتے ہیں کہ اس نے دیدہ ودانستہ ملک کا دیوالہ اس بھروسے پر نکال دیا ہے کہ امریکہ اس کی مالی امداد کرے گا۔ اس صورتِ حال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ پریس کی زبان بند ہے اور کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ فلاں جگہ غلطی ہوئی تھی۔" ملخص ص ۵۲-۹۳

**خوفناک حربے** | سیاسی و اقتصادی میدان میں جیت حاصل کرنے کے لیے انگریز کے پاس دو خوفناک حربے ہیں۔

اوّل :- انگریزی زبان۔ جو نہایت بے قاعدہ اور مشکل زبان ہے۔ ہم کچھ کر بھی اس میں مہارت پیدا نہیں کر سکتے۔ ہمارے ساڑھے ننانوے فی صد بی اے اور اٹھانوے فی صد ایم۔ اے غلط انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں ہمارے نمائندے جب مالی، سیاسی، تعلیمی اور دیگر امور طے کرنے کے لیے انگریزوں اور امریکیوں کے سامنے جاتے ہیں تو اس خوف سے کہ غلط انگریزی نہ بول بیٹھیں سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ نہ اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کے لیے الفاظ، نہ تردید کی ہمت اس لیے جو کچھ انگریز انھیں کہتے ہیں وہ لے کر آجاتے ہیں۔ چونکہ انگریزی ہماری دفتری و سیاسی زبان ہے اور ہم اسی میں بات چیت کرنے پہ مجبور ہیں، اس لیے ہر معاملہ میں انگریز کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے ہم سے منوا لیتا ہے اور ہماری حالت اس کے سامنے یوں ہوتی ہے جیسے شیر کے سامنے بھیڑ کی اگر انگریز کو ہم سے اردو میں بات کرنا پڑتی تو اس کی گھبراہٹ دیکھنے کے قابل ہوتی۔ وہ بار بار پانی مانگتا ماتھے کا پسینہ پونچھتا اور ہمارے دلائل کے سامنے دو منٹ میں دم توڑ دیتا۔ لیکن موجودہ صورت میں وہ ڈکٹیٹر ہے اور ہم محض کلرک۔

**کانونٹ سکول:-** انگریزی مقاصد کی تکمیل کے لیے کانونٹ سکول خوفناک ادارے ہیں ہمارے بڑے بڑے حکام اور گھرانوں کے بچے انہی سکولوں میں داخلہ لیتے ہیں، آٹھ دس سال کے بعد خاصی انگریزی بولنے لگتے ہیں۔ چونکہ ہمارے ہاں قابلیت کا معیار صرف انگریزی بولنا ہے، اس لیے یہ بچے اعلیٰ سروس کے لیے منتخب ہو کر پانچ چھ برس کے بعد ڈپٹی سیکرٹری اور دس برس کے بعد سیکرٹری بن جاتے ہیں، کانونٹ سکولوں سے وہ ایک خاص قسم کی ذہنیت ساتھ لاتے

یں جسے اسلام کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اپنے ماضی سے بیگانہ، اسلاف سے بے خبر، انگریزی تہذیب، ادب، آرٹ، موسیقی وغیرہ سے عشق۔ انگریز کا رُعب، نتیجہ یہ کہ انگریز جو کچھ کہتا ہے وہ مانا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ پاکستان ایک زرعی مُلک ہے اور آپ صرف ہل چلایا کریں آپ کے لیے فولاد کا کارخانہ مُضر ہے۔ اُردو گنواروں کی بولی ہے اور ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی، شراب، ناچ اور جوا تہذیب کے لوازمات ہیں تو ہمارا "صاحب" مانا جائے گا اور کہیں بھی بحث میں نہیں اُلجھے گا۔ الجھے کیسے اس کیلئے شُستہ، صاف اور ٹکسالی انگریزی بولنا پڑتی ہے اور ہمارا "صاحب" اتنا اونچا نہیں اڑ سکتا۔

**دوم اکنامکس** انگریز کا دوسرا حربہ اس کی اکنامکس ہے۔ جس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ممالک دو قسم کے ہیں ایک زرعی اور دوسرے صنعتی۔ زرعی ممالک کی تمام تر توجہ اپنی پیداوار بڑھانے پر مرکوز ہونی چاہیے، مطلب یہ کہ "ایشیا کی جاہل اور پسماندہ اقوام تم ہل چلاتے رہو، اپنا غلہ ہمیں بھیجے جاؤ اور اس کے عوض ہم تمہیں موٹریں، ریڈیو کوکوکولا اور دیگر الابلا دیتے رہیں گے سب لوگ ایک ہی کام نہیں کر سکتے۔ موچی کا کام موچی ہی کر سکتا ہے اور لوہار کا لوہار، اسلئے تم کاشتکاری کرو اور ہم صنعتکاری" اگر ایشیا کا کوئی آدمی یہ پوچھ بیٹھے کہ حضرت اگر! کاشتکاری اتنی ہی اچھی چیز ہے تو آپ خود یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ تو صاحب بہادر سر کھجلانے لگیں گے۔

**انگریز کا سلوک مسلمانوں سے** مسلمان آٹھ سو برس تک ہسپانیہ پہ حکمران رہے لیکن انھوں نے انگلستان پر ایک حملہ بھی نہ کیا اور نہ بعد میں برطانوی ایمپائر کے کسی حصے پر حریصانہ نگاہ ڈالی۔ دوسری طرف انگریز اپنے گھر سے چل کر

صلاح الدین ایوبی کے خلاف صف آرا ہوا۔ اس کے بعد اس نے مغل ایمپائر کو تباہ کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مصر و سوڈان کو جالیا۔ موجودہ صدی کے شروع میں ترکوں کو بلقان سے نکالا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں سے عراق، شام، عرب اور یورپ کے کچھ حصے چھین لیے ۱۹۱۸ء کے بعد تھکے ہارے ترکوں پر تازہ دم یونان کو چھوڑ دیا۔ دوسری جنگ میں ایران کو جا دبوچا۔ انگریز ہندوستان میں رہا تو سدا سرحدی افغانوں پر بم برساتا رہا ۱۹۴۷ء میں کئی لاکھ عربوں کو تباہ کر کے فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کر دی اور چھ برس کے بعد مصر پر حملہ کر دیا۔ یہ تمام تاریخ کے وہ ٹھوس واقعات ہیں جن سے انکار ناممکن ہے ان سے ایک ہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ انگریز کو مسلمان سے فی سبیل اللہ بَیر ہے۔

خود پاکستان سے انگریز نے کیا کیا؟ اس کے ریڈکلف نے برطانوی حکومت کے اعلان (کہ تقسیم میں مسلم علاقے پاکستان کا حصہ رہیں گے) کی دھجیاں اڑا دیں اور کشمیر بھارت کے حوالے کر دیا۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے ایک طے شدہ سکیم کے تحت دس لاکھ مسلمان سکھوں سے مروا ڈالے اور اسی ہزار مسلم لڑکیاں اغوا کرا دیں۔ پاکستان بننے کے بعد یارانہ ہم سے گانٹھا اور فولاد کے تین کارخانے بھارت کو دے دیئے کہ اگر پاکستانی سر اٹھائے تو سر توڑ دو۔

**توازن قوت** | اگر دنیا میں کوئی مسلم ریاست سامانِ قوت فراہم کرتی ہے تو انگریز شور مچا دیتا ہے کہ دوڑو، پکڑو قوت کا توازن برہم ہو رہا ہے اور اگر یہی کام حکومت اسرائیل، بھارت، جاپان امریکہ یا فرانس کرے تو چپ چاپ دیکھتا رہتا ہے اگر مسلمان کا شیرازہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں بکھرا ہوا ہے تو خوش ہوتا ہے اور اگر اقبالؒ یہ کہہ دے کہ ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یا ناصر متحدہ عرب جمہوریہ کا خواب دیکھنے لگے، تو "پان اسلام ازم" کے خطرے کی گھنٹی بجا کر سارے جہان کو چوکنا کر دیتا ہے۔

الغرض انگریز نہ مسلمان کو متحد دیکھ سکتا ہے نہ طاقتور اور نہ یہ برداشت کر سکتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔ پچھلے دنوں ایک انگریز نے "پاکستان ٹائمز" میں ترکوں پہ ایک مضمون لکھا تھا (افسوس کہ وہ پرچہ اس وقت سامنے نہیں) جس میں درج تھا کہ ترکی میں مساجد اور نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ صورتِ حال انگریزوں کے لیے باعثِ پریشانی بن رہی ہے۔ کیوں؟ انگریز ہمیشہ اس مسلمان سے خوف کھاتا ہے جو قرآن کو تھام لے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے، اگر یہ کسی طرح متحد ہو جائیں۔ قرآن کو اپنا رہبر، سرفروشی کو اپنا مذہب اور شہادت کو اپنی منزل بنا لیں تو یہ ایک مہیب و جلیل طاقت بن سکتے ہیں۔ انگریز نے اس خطرے کا انسداد یوں کیا کہ مسلم جہاں بھی ہیں، انھیں فولاد کا کارخانہ نہیں لگانے دیتا، انھیں متحد نہیں ہونے دیتا اور انھیں اپنی زبان میں تعلیم حاصل نہیں کرنے دیتا۔ یہ کانونٹ سکول اُسی سازش کی ایک کڑی ہیں۔ ان سے جو بچے نکلیں گے وہ "صاب" زیادہ اور انسان کم ہوں گے، لندن ان کا کعبہ، انگریز ان کا آقا اور انگریز کی سطحی عریانی، بے جان اور "چھچھوری" تہذیب ان کا مذہب ہو گا۔

**تعلیم کا مقصد** سوال یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ کیا ہم نے درسگاہوں سے صرف انگریزی بولنے والے پیدا کرنا ہیں اور بس؟ پاکستان ایک اسلامی ریاست

ہے جہاں ہم ایک ایسی قوم پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کی صفات یہ ہوں۔

(ا) وہ تمام علوم و فنون سے مرصع ہو، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس وقت تک انگریزی کو ایک لازمی مضمون پڑھایا جائے جب تک ہمارا اپنا ادب خود کفیل نہ ہو جائے۔

(ب) وہ بلند کردار کی مالک ہو اور تمام اخلاقی وسماجی غیاثج سے متنفر ہو۔

(ج) خدا، رسول اور قرآن سے اس کا مضبوط رشتہ قائم ہو اور اس کی موت و حیات سب اللہ کے لیے ہو۔

(د) وہ پابندِ صوم وصلوٰۃ، شب خیز، سحر خیز، ایثار پیشہ، راستی شعار، خادم انسان، خوش گفتار اور منکسر المزاج ہو۔

(ہ) وہ اپنے ماضی سے آشنا اور اپنے عظیم اسلاف پر نازاں ہو۔

(و) اسے یہ یقین ہو کہ ایک اور زندگی بھی ہے جہاں اس زندگی کے اعمال کی بدولت یا گلستان مہک رہے ہوں گے یا جہنم دہک رہے ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کانونٹ سکولوں میں ان چیزوں کی تعلیم دی جاتی ہے؟ کیا وہاں خدا اور رسول کا کوئی تصور قائم ہو سکتا ہے، کیا وہاں بچوں کے کان میں بھولے سے بھی کوئی آیت یا حدیث پڑ سکتی ہے؟ کیا وہاں نئی نسل کو رومیؔ و سعدیؔ، حافظؔ و خیامؔ، رازیؔ و حنبلؔ، بخاریؔ و مالکؔ اور فاروقؓ و حیدرؓ کی مقدس و مطہر سیرت کا درس دیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کے سامنے طارقؔ و خالدؔ کی جان بازی، مامونؔ و ہارونؔ کی علم نوازی، جنید و بایزید کی جذب و شوق کی داستانیں پیش کی جا سکتی ہیں اگر ان میں سے کوئی چیز موجود نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ وہاں ہے کیا؟ صرف

انگریزی؟ Sorry اور Thank you کی گردان؟ رقص و سرود کی ابتدائی مشقیں اور ایک ایسی پرسنلٹی جس پر عیسائیت کا رنگ و روغن چڑھا ہوا ہو۔ اور اندر جہل و تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ ایک ایسا دماغ جس میں ملٹن، بیکن اور شیلے تو پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوں لیکن اقبال، غالب، باہو اور بلھے شاہ کا کوئی مقام نہ ہو ایسی نسل کو ہم کیا کریں گے؟ دنیا فانی اور آخرت جاودانی ہے۔ آنے والی بیکراں زندگی کو دنیا پہ قربان کر دینا تو کوئی دانشمندانہ سودا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں دنیا بھی نہیں ملے گی۔ یہ بچے بڑے ہو کر انگریز کے اشاروں پر اسی طرح رقص کریں گے جس طرح مداری کی ڈگڈگی پر بندر ناچتا ہے۔ نہ اپنی کوئی رائے نہ فلسفہ نہ پالیسی نہ قومی حمیت نہ جرأت۔ اور انگریز کے جو ارادے دنیائے اسلام کے متعلق ہیں۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔

**مشکل کا حل** | چونکہ ہم نے انگریزی بھی پڑھنا ہے۔ ساتھ ساتھ بہتر انسان یعنی مسلمان بھی بننا ہے۔ قومی ادب کو بھی فروغ دینا ہے۔ اپنی زبان کا دامن بھی مغربی علوم سے بھرنا ہے۔ اس لیے مناسب صورت ایک ہی ہے کہ ان سکولوں میں انگریزی کو پہلی جماعت سے پڑھایا جائے۔ لیکن باقی تمام مضامین کی تعلیم اردو میں ہو۔ اس وقت ان سکولوں میں اردو محض برائے نام ہے اور باقی تمام مضامین مثلاً تاریخ۔ جغرافیہ وغیرہ انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں

**محکمہ تعلیم کی کمیٹی** | جون ۱۹۶۰ء کے آغاز میں محکمہ تعلیم مغربی پاکستان نے کانونٹ اور پبلک سکولوں کی اصلاح کی خاطر ایک کمیٹی ترتیب دی۔ خبر پریس میں آئی تو ہر سینے میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ ۱۷ جون کے "پاکستان ٹائمز" میں اس کمیٹی کی

سفارشات شائع ہوئیں تو وہ تمام چراغ بجھ گئے۔

اس کمیٹی کے ارکان یہ تھے۔

۱۔ پرنسپل سینٹرل ٹریننگ کالج۔ لاہور۔
۲۔ ہیڈ مسٹرس کیتھیڈرل ہائی سکول لاہور۔
۳۔ پرنسپل کانونٹ آف جیسس اینڈ میری۔ لاہور۔
۴۔ ہیڈ مسٹرس اعظم گیریسن ہائی سکول۔ لاہور۔
۵۔ " " سینٹ اینڈریوز ہائی سکول۔ لاہور۔
۶ " " کینیرڈ ہائی سکول۔ لاہور۔

ممکن ہے کہ ان چھ میں سے اعظم گیریسن سکول کی ہیڈ مسٹرس پاکستانی ہو باقی تمام کے تمام انگریز یا امریکی تھے۔ بات چیت انگریزی میں ہوناتھی کسی پاکستانی لڑکی کی کیا مجال، کہ ایسی مجالس میں بولنے کی جرأت بھی کر سکے۔ وہ مسلسل اسی خوف میں مبتلا رہی ہوگی، کہ منہ سے کوئی غلط فقرہ نہ نکل جائے۔ اس لیے اتنے ہی فقرے کہے ہوں گے جن کی صحت پر اُسے پورا یقین ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن میں سے بیشتر کا تعلق مزاج اور موسم سے ہو

اس کمیٹی کی سفارشات یہ تھیں۔

۱۔ کہ یورپی طرز کے سکولوں اور عام درسگاہوں کا نصاب تعلیم ایک ہی ہوگا فرق یہ کہ اوّل الذکر...... میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔

۲۔ کہ آئندہ ان سکولوں میں وہ معلمات بھرتی کی جائیں گی جو کانونٹ سکولز کی فارغ التحصیل ہوں گی۔

ہے کہ آئندہ پانچ سال تک ان سکولوں میں اُردو کا معیار عام سکولوں کے برابر کر دیا جائے گا۔

جہاں تک پہلی سفارش کا تعلق ہے، بات جہاں تھی وہیں رہی۔ ملک میں کانونٹ سکولز کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ہر چھوٹے سے قصبے میں ان کی تعداد چار ہے۔ عیسائی ان سکولوں پر کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں ان کا مقصد آپ کو پڑھانا نہیں بلکہ عیسائی بنانا ہے۔ یہ مشنریوں کے سکولز ہیں۔ یہ لوگ تبلیغ عیسائیت کے لیے کئی راستے اختیار کرتے ہیں۔ اوّل وعظ۔ دوم لٹریچر کی تقسیم۔ سوم۔ ہسپتال اور چہارم مدارس جہاں ہوشیار اور تجربہ کار اساتذہ بڑے میٹھے انداز میں عیسوی عقائد و تصورات کے نقوش کم عمر بچوں کے دل و دماغ پر مرتسم کرتے رہتے ہیں، دو تین برس میں ان کا تعلق اپنے ماضی اور روایات سے منقطع کر دیتے ہیں اسکے بعد من کی دنیا میں ایک ایسا بُتکدہ تعمیر ہو جاتا ہے جس میں "خداوند یسوع مسیح" سب سے بڑا صنم ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب اپنے تمام عیوب و قبائح کے ساتھ ان کا مذہب بن جاتی ہے۔ اس ماحول میں فریڈ اہیوالک، ملکیا دلی، نطشے اور بائرن انبیاء کا مقام اختیار کر لیتے ہیں۔ اور تمام فلمی ایکٹرز اور کرکٹ کے کھلاڑی ہیروز کا شراب و رقص لازمۂ حیات بن جاتے ہیں، انگریزی شعارِ برتری اور مذہب سے نفرت علامتِ تہذیب سمجھی جاتی ہے اگر یقین نہ آئے تو کسی ایسے نوجوان کو دیکھیئے جو ان سکولوں کا فارغ التحصیل ہو

دوسری سفارش پہلی سے زیادہ خطرناک ہے۔ آج تک تو یہ ہوتا رہا کہ صرف وہی بچے خطرے میں پڑتے تھے جو عیسائی سکولوں میں داخلہ لیتے تھے۔ اب اس سفارش کے تحت تمام پبلک سکولز بھی جنھیں میونسپل اور کنٹونمنٹ بورڈز یا دیگر ملکی

انجمنیں چلا رہی ہیں عیسائی مشنریوں کی زد میں آجائیں گے۔

وہ اس طرح :-

محکمہ تعلیم نے سکولوں کو منظور کرنے کے لیے چند شرائط رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سکول کی عمارت اچھی ہو، سامان پورا ہو، کھیل کا میدان ساتھ ہو اور اساتذہ ٹرینڈ ہوں۔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج دو ہیں، ایک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، جہاں معلمین تربیت پاتے ہیں۔ اور دوسرا ایڈی ورک لیگی کالج لاہور۔ اسی طرح عیسائی مشنریوں نے بھی دو تربیتی ادارے کھول رکھے ہیں (۱) میریٹن ٹریننگ کالج لاہور۔ (۲) سینٹ ڈینیز کالج مری۔ ان میں صرف خواتین کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ انگریز کتنا بڑا جادوگر ہے۔ اس کے پاس وہ خواب آور گولیاں ہیں کہ جسے کھلا دینا ہے صدیوں ہوش میں نہیں آتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس نے گزشتہ تیرہ برس سے پاکستان کو دو کھاد گڑھوں میں دبا ڈاور پوہلی تلف کر دے کے چکر سے نہیں نکلنے دیا۔ اگر ہمارے بہترین دماغ اس ساحر کے سامنے بے بس ہیں تو ان پاکستانی نوعمر لڑکیوں کی اوقات ہی کیا ہے جو ان عیسائی اداروں میں ٹریننگ کے لیے جاتی ہیں، یہاں سے وہ جس قسم کی ذہنیت لے کر باہر آتی ہیں۔ اس سے آپ آگاہ ہیں۔

اس دوسری سفارش کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ وہی پبلک سکول منظور کیا جائے گا جہاں معلمات ان مشنری کالجوں کی تربیت یافتہ ہوں گی۔ یعنی اس سے پہلے عیسائی اثرات کا شکار وہ بچے تھے جو عیسائی مدارس میں داخلہ لیتے تھے۔ اور اب سارا پاکستان ان اثرات کی زد میں ہو گا۔

کنٹونمنٹ پبلک سکولز | اس وقت منسٹری آف ڈیفنس نے تمام چھائونیوں میں پبلک سکول کھول رکھے ہیں جہاں اردو، مذہب، سیرت پر توجہ دی جاتی ہے لیکن ان میں سے چند ایک عارضی طور پر منظور کیے گیے ہیں۔ مستقل منظوری کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ معلمات عیسائی اداروں کی ٹرینڈ ہوں۔ ایسی لڑکیاں چند ایک ہوتی ہیں جو لاہور اور دیگر بڑے شہروں ہی میں جذب ہو جاتی ہیں۔ پبلک سکولوں کو نہ یہ لڑکیاں ملیں گی نہ وہ منظور ہوں گے۔ بالآخر یہ پبلک سکول ختم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ کانونٹ سکول لے لیں گے۔ یہ دوسری سفارش پبلک سکولوں کو ختم کرنے کے لیے ایک اٹیم بم ہے۔ ان سکولوں کو ختم کرنے کے کئی راستے تھے ان میں سے یہ سفارش سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر ہے۔

رہی تیسری سفارش، کہ آئندہ پانچ برس تک ان مدارس میں اردو کی تدریس معیاری کر دی جائے گی، ایک بے جان سی سفارش ہے۔ جب تک وہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے، اردو کے قدم کبھی جمنے نہیں پائیں گے۔ پڑھانے والے انگریز، ماحول انگریزی، فضا اردو کش، ان حالات میں اردو کیسے پنپ سکتی ہے۔

پہلی سفارش کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ یورپی اور عام مدارس کا نصاب ایک ہی ہوگا۔ فرق یہ کہ، یورپی سکولوں میں سب کچھ انگریزی میں پڑھایا جائے گا۔ عام مدارس کی مڈل کلاسز میں تاریخ، جغرافیہ، شہریت، سائنس، حساب اور اسلامیات کے لیے کافی ضخیم کتابیں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں ویسی ایک کتاب بھی موجود نہیں، جو ہیں وہ نصاب پہ حاوی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ عام مدارس کے بچے ان مضامین میں بہت آگے نکل جائیں گے۔ اور یورپی سکولز کے طلبہ چھ سات

تک انگریزی زبان ہی سیکھتے رہیں گے، اور ان کے پلے کچھ بھی نہیں پڑے گا۔

پچھلا طویل تجربہ شاہد ہے کہ یورپی سکولز کے بچے انگریزی میں تو کچھ گٹ پٹ کر لیتے ہیں، لیکن باقی تمام مضامین میں بودے ہوتے ہیں۔

تفاصیل بالا کے پیشِ نظر ہم اربابِ تعلیم سے التماس کرتے ہیں، کہ اِن مدارس میں ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے جلد تر قدم اٹھائیے۔

اگر انگلستان میں کوئی مولوی صاحب ایک ایسا سکول جاری کر دیں جس میں انگریز بچوں کو اردو میں تعلیم دے اور انھیں اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے تو غالباً اُسے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے گا۔ دوسری طرف عیسائی مشنریوں نے ہمارے بہترین گھرانوں کے ہزاروں بچے قابو کر رکھے ہیں۔ جنھیں اجنبی زبان میں اجنبی تہذیب کا درس دے رہے ہیں۔ ان پر مذہبی اثرات ڈال رہے ہیں اور ہماری حکومت ان پر اس قدر مہربان ہے کہ ان کے تمام مدارس کو پروانہ منظوری عطا کر رکھا ہے اور ساتھ گرانٹ بھی دے رہی ہے۔ رہے پبلک سکولز تو ان کی بہت بڑی تعداد منظوری اور گرانٹ ہر دو سے محروم ہے۔ یہ جدول ملاحظہ فرمایئے۔

| علاقہ | منظور شدہ مشنری مدارس |
|---|---|
| لاہور اور پشاور ریجن | ۱۷ |

| منظور شدہ پبلک سکولز | گرانٹ پانے والے مشنری مدارس |
|---|---|
| ۱۲ | ۱۲ |

گرانٹ پانے والے پبلک سکولز

۴

میرا یہ ایمان ہے کہ قومی زبان کو اپنائے بغیر ہم نہ دوسری اقوام کے سامنے سر اٹھا سکیں گے نہ اپنے اندر صحیح تعمیر کر سکیں گے اور نہ اسلامی کردار پیدا ہو گا امید ہے کہ حکومت اِس سلسلے میں جلد کوئی قدم اٹھائے گی

# مری کے خوفناک مناظر

جولائی ۱۹۶۳ء کے پہلے ہفتے میں چند احباب مجھے مری لے گئے۔ وہاں چار ایسے نظارے دیکھے جنھیں میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور جب مستقبل کا مورخ ہماری داستانِ بقا و فنا لکھنے بیٹھے گا تو اُسے ان واقعات کا ذکر کرنا ہی پڑے گا۔

اوّل۔ دو بجے کے قریب ہم مری پہنچے۔ شام کو مال روڈ پر نکلے تو آنکھیں فیشن کی چمک دمک سے خیرہ ہو گئیں، عمدہ لباس معیوب نہیں لیکن بے حیائی سے بہت دکھ ہوتا ہے۔ نوجوانوں نے اس قسم کا تنگ لباس پہن رکھا تھا کہ جسم کا ہر حِصّہ مستور ہونے کے باوجود عریاں تھا۔ لڑکیاں رنگ برنگ کے شوخ لباسوں میں ملبوس ہر طرف قہقہے اور جلوے برسا رہی تھیں اور اِن میں سے بعض ایسی بھی تھیں جنھوں نے سر پر بالوں کے گنبد یا گھونسلے بنا رکھے تھے۔ نوجوانوں کے گروہ اُن کا پیچھا کر رہے تھے دائیں بائیں سے اُن پر نظریں اور انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ لطف یہ کہ بعض ایسی لڑکیوں کے ساتھ اُن کے والدِ محترم بھی جا رہے تھے اور وہ غالباً اِس بات پر نازاں تھے کہ ان کی لڑکی تماشہ بنی ہوئی ہے۔ ان حضرات نے گھر پہنچ کر ضرور کہا ہو گا۔ کہ بیگم آج کی سیر بڑی کامیاب رہی۔ خدا رکھے! ہماری بٹیا تو پاکستان کی ––– کرشائن کیلر ہے۔

یہ منظر دیکھ کر قرآن کی آیت ذیل دماغ میں گھومنے لگی اور میں سوچنے لگا۔ کہ جس نظریۂ حیات کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے ہم نے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا تھا گیا اُس کی عملی تفسیر یہی ہے۔

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَٰلِكَ أَزْكَىٰ لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ۔ وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔

(نور)

اے رسول! ایمان والوں سے کہیے کہ وہ آنکھیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ چیز تزکیۂ دل ودماغ کے لیے ضروری ہے۔ اللہ ان کے اعمال سے آگاہ ہے نیز خواتین کو ہدایت کیجیے۔ کہ وہ بھی آنکھیں نیچی رکھیں شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب وزینت کو (ہاتھ پاؤں کے سوا) چھپا کر رکھیں۔

کسی زمانے میں مسلمان اس قدر باغیرت تھا۔ (اور آج بھی ہمارے دیہات میں ایسے مسلمان موجود ہیں۔) کہ وہ اپنی مستورات پر سورج کی نگاہ بھی نہیں پڑنے دیتے تھا۔ لیکن برا ہو اس مغربی تہذیب کا۔ جس نے ہمارے مردوں کو غیرت اور عورتوں کو حیا وحجاب سے محروم کر دیا ہے بعض مغرب زدہ مرد کہتے ہیں۔ "ابھی عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقعہ دو۔ تاکہ ملک ترقی کرے۔ ان سے کوئی پوچھے، کہ آپ کے ہاں ترقی کا مفہوم کیا ہے؟ خواتین کو بے حیا اور بے حجاب بنانے سے کس قسم کی ترقی ہوتی ہے۔؟ اور یورپ کی موجودہ علمی وصنعتی ترقی میں وہاں کی بے حجاب عورت کا حصہ کتنا ہے۔؟ انھوں نے کتنی ایجادیں کی؟ کائنات کے کون سے راز دریافت

کیے؟ اور علوم و فنون میں کیا اضافہ کیا؟ اتنا ہی سُنا ہے۔ کہ ان کی بدولت یورپ کا معاشرہ سنڈاس سے زیادہ متعفن بن چکا ہے۔ یورپ اس بلائے بے درماں کا علاج سوچ رہا ہے۔ اور ہم ہیں کہ اس غلاظت کو مشک و عنبر سمجھ کر اس پر جان چھڑک رہے ہیں۔

**دوسرا منظر** | دوسرے روز ہمیں نتھیا گلی جانا تھا۔ دن کا کھانا وہاں کے "پائن ہوٹل" میں کھایا۔ ہوٹل کے وسیع لان سیاحوں سے پُر تھے۔ وہاں تین عجیب قسم کی لڑکیاں دیکھیں۔ تینوں کے تن پر جیکٹ تھی تا بہ کمر۔ ایک نے تنگ سی پتلون پہن رکھی تھی اور اس کی پنڈلیاں ننگی تھیں۔ دوسری نے چھوٹا سا ریشمی جانگیہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی رانوں کا بالشت بھر حصہ عریاں تھا۔ تیسری نے پہلوانوں کی طرح ایک رنگین لنگوٹہ کسا ہوا تھا۔ اور لان کے طول و عرض میں اپنی سڈول رانوں کی نمائش کر رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان لڑکیوں کے ساتھ مدڈیڈی، انکل یا بھیّا قسم کے کوئی بزرگ بھی ہوں گے۔ اور وہ اپنی ماڈرن لڑکی کی ایجلیٹی (AGILITY) دیکھ کر بے حد خوش ہو رہے ہوں گے۔

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین
فساد ہے یہ فرنگی معاشرت کا مرد
جہاں شناس ہے لیکن یہ زن شناس نہیں

(اقبالؔ بہ ترمیم)

**تیسرا منظر** | اُسی شام ہم مری کے ایک ہوٹل میں کھانے کے لیے گئے

ڈائننگ ہال کے ملحق ایک وسیع ہال تھا۔ جہاں سے بینڈ کی آواز آ رہی تھی معلوم ہوا کہ اندر ایک نئے قسم کا ناچ ہو رہا تھا۔ میں کھانے کی میز سے اٹھا۔ اور ایک کھڑکی سے اندر جھانکا تو کئی مناظر دیکھے، ہال میں تماشائیوں کی کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ بشیر شراب پی رہے تھے۔ وسط میں مختلف جوڑے مختلف قسم کے کرتب دکھا رہے تھے، ایک لڑکا ایک جوان لڑکی کو ہاتھوں میں اٹھا کر، اور دوسرا سینے کے ساتھ لگا کر لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ دو جوڑے ٹوسٹ (TWIST) دکھا رہے تھے۔ یعنی گز بھر کے فاصلے پر کھڑے ہو کر، بازوؤں اور کولہوں کو نہایت تیزی سے مٹکا رہے تھے، اور زمین پر پاؤں مارنے سے ٹھک ٹھک ٹھکا ٹھک کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر دماغ میں کئی سوال ابھرے۔

۱۔ کیا یہ لڑکے ہماری یونیورسٹیوں کی تخلیق ہیں۔

۲۔ کیا علم عیاش اور بدکردار بناتا ہے۔

۳۔ کیا یہ لڑکیاں اِن لڑکوں کی بہنیں ہیں؟ لیکن مسلمان اِتنا بے غیرت تو نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی بہنوں یا بیٹیوں کا ناچ دکھاتے پھریں! تو کیا یہ کسی اور کی بیٹیاں ہیں؟ کیا یہ اپنے باپ کی اجازت سے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کر رہی ہیں؟ یا باپ کو اُلّو بنا کر یہاں آگئی ہیں؟

۴۔ کیا یہ تماشائی مسلمان ہیں؟ اگر ہیں تو شراب کیوں پی رہے ہیں۔

۵۔ کیا یہ باغیرت ہیں؟ اگر ہیں تو ان مسلمان زادوں کو اس بے حیائی اور بے غیرتی سے روکتے کیوں نہیں؟

۶۔ کیا یہ اِس رقص کو تہذیب سمجھتے ہیں؟ تہذیب کے معنی ہیں پاک کرنا،

دھونا چمکانا گیا انسانیت رقص و شراب سے چمکتی، دھلتی اور پاک ہوتی ہے؟

۷۔ دس کروڑ مسلمانان ہند نے علیحدہ وطن کا متحدہ مطالبہ کیا تھا، تاکہ اسلامی نظریۂ حیات کو جامۂ عمل پہنائیں، کیا رقص، مے نوشی، بے حیائی اور بے غیرتی بھی اس نظریہ کے اجزاء ہیں؟

کھانے کی میز پر میں اپنے ساتھیوں کے سامنے اِن خیالات کا اظہار کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک صاحب بولے،۔۔۔ "ڈاکٹر صاحب" آپ نے تو ایک ہی ناچ گھر دیکھا اور غصے سے ابلنے لگے۔ لاہور میں اس قسم کے درجنوں اور کراچی میں سیکڑوں ہیں

قوموں کی زندگی میں طاؤس و رباب کی منزل آخر میں آتی ہے اور ہماری ابتدا ہی اس "مقدس" کام سے ہوئی ہے۔ نہ جانے ہمارا انجام کیا ہوگا۔

ع قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا

اگر ان عیاشیوں کی وجہ سے کل پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ گیا یا مِٹ گیا تو دس کروڑ پاکستانیوں پہ جو بیتے گی سو بیتے گی، البتہ مورّخ کو بڑی سہولت ہوگی۔ وہ ہماری تاریخ صرف ایک شعر میں لکھ کر قلم رکھ دے گا۔

آتجھ کو سناؤں میں تاریخ زمین پاک
طاؤس و رباب اوّل، طاؤس و رباب آخر

کھانا کھانے کے بعد ہم اُس ہوٹل سے نکلے تو دیکھا۔ کہ بڑے بڑے "شرفا" جن میں حکام، تاجر سب شامل تھے۔ جوق در جوق اپنی جوان لڑکیوں کے ساتھ ناچ گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ اور قریب کی مسجد میں ایک دو مزدور اور تین چار

کھانسی کے مارے ہوئے بوڑھے نمازِ عشاء کے لیے جمع تھے۔

**چوتھا منظر** | ہم ہوٹل سے نکل کر جب اُس مقام پر پہنچے جہاں سے ایک تنگ سی سڑک الگ ہو کر نیچے بس سٹینڈ کو جاتی ہے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نوجوان قے کر رہا ہے اور اس کا ایک قدم تک سیدھا نہیں پڑتا وہ کسی اچھے گھرانے کا چشم و چراغ معلوم ہوتا تھا اور سال سوم یا چہارم کا طالب علم نظر آتا تھا اور اُس نے کافی پی رکھی تھی۔

**تبصرہ** | تاریخ عالم کا یہ اٹل فیصلہ ہے۔ کہ عیاشی اقوام کو تباہ کر دیتی ہے۔ جب آسودہ حال لوگ فسق و فجور میں ڈوب جاتے ہیں تو لازماً جفاکشی و جفاطلبی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ و مقاومت کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ موت تو بڑی چیز ہے وہ کوئی چھوٹا سا دکھ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا نظام اخلاق اس قدر بوسیدہ و فرسودہ ہو جاتا ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے سُکھ پر، خواہ وہ دشمن ہی سے ملے۔ ملک و ملت سے غداری کر جاتے ہیں۔ ہماری تاریخ غداروں کے ذکر سے لبریز ہے۔ یہ تمام کے تمام آسودہ حال عیاش تھے۔ جنہیں، جنگ و جہاد کے وقت دشمن نے پچکارا اور وہ دم ہلاتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں جا گھسے۔ غریبوں مزدوروں اور کسانوں کو خریدنا دشوار ہے کہ ان کے نزدیک سب سے بڑی دولت ایمان ہے جسے وہ کسی قیمت پہ نہیں بیچتے۔

رہے یہ عیاش تو ان کا نہ کوئی ایمان ہوتا ہے نہ اصول، نہ مذہب۔ زبان کا غدا ہوتا ہے اور جس در سے بھی لقمہ تر ملے گا وہیں سر جھکا دیں گے۔

ہماری حکومت کئی لیڈروں کو اس بنا پر گرفتار کر چکی ہے کہ ان کی سرگرمیاں مُلکی مفاد کے خلاف ہیں۔ لیکن ان مے کشوں، رقاصاؤں اور اوباشوں کی سرگرمیوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا یہ مُلکی و ملی استحکام میں اضافہ کر رہی ہیں۔

ہم نے یہ مُلک اسلامی نظریۂ حیات کی اساس پہ حاصل کیا تھا۔ کیا ان لوگوں کی یہ حرکات اسلام کے خلاف بغاوت، اور اسلامی اقدار کی تضحیک نہیں؟ اگر کل پنڈت نہرو ہیگ کی بین الاقوامی عدالت یا اقوام متحدہ کے سامنے یہ مقدمہ پیش کر دے، کہ ہندوستان ہمیشہ سے ایک وحدت چلا آتا تھا۔ مسلمانوں نے اسلامی نظریۂ حیات کی بنا پر اس کی تقسیم کا مطالبہ کیا ہم نے ان کی بات مان لی۔ لیکن ان لوگوں نے اس نظریہ پر ایک لمحہ کے لیے بھی عمل نہیں کیا۔ اس لیے پاکستان کو ختم کر کے حسبِ سابق اسے ہندوستان میں ضم کر دیا جائے تو اس دلیل کا کیا جواب ہوگا۔

**وحشی انسان** دورِ وحشت میں انسان کی تمام دوڑ دھوپ پیٹ بھرنے اور تسکین جنسیت کے لیے ہوا کرتی تھی۔ وہ شکار یا جنگلی پھلوں سے پیٹ بھرتا ہو یا کھجور سے شراب بناتا اور باقی وقت تسکین ہوس میں گزار دیتا تھا۔ کیا اُن وحشیوں اور ہمارے آج کے مہذب عیاشوں میں کوئی فرق ہے؟ اگر ہے تو صرف لباس کا۔ کہ وہ ریچھوں کی کھال پہنتے تھے۔ اور ہم اون اور کپاس اوڑھتے ہیں۔

**ترقی کا مفہوم** ترقی کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ ہر روز حلال یا حرام طریقوں سے دولت کما کر اُس سے شراب کی پیٹیاں خریدیں، شام کو ناچ دیکھیں۔ اور دروازے پر کاریں کھڑی کریں۔ بلکہ اس سے مراد شخصیت کا ارتقاء ہے جو کائناتی و دینی علم پاکیزہ اخلاق اور عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی اوصاف وقار، عظمت

اور احترام پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہوں تو قوم پُر وقار، عظیم اور محترم ہے۔ نہیں تو پھر اس کے اُونچے محل وہ چونے گچ قبریں ہیں جن میں متعفّن لاشیں گل سڑ رہی ہوں۔

حیرت انگیز ہمارے رائٹرز گلڈ نے "قلمکار" کے عنوان سے حال ہی میں نظم و نثر کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس میں جناب ظہیر کاشمیری نے یہ واقعہ درج کیا ہے۔

پچھلے دنوں راولپنڈی کے ایک کیفے میں ایک خوش شکل ٹیڈی شاعر سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے شعر و ادب کے فلسفہ پر گفتگو ہوئی۔ تو ان کے بیان کے مطابق فکر و فلسفہ اور انسانی اقدار کے اعلیٰ تصوّرات بے معنی چیزیں نہیں۔ وہ ضمنیّت اور حیاتی تلذذ کو شعر سمجھتے تھے......... اپنے ذہن کا مزید تعارف کرانے کے لیے مجھے اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ وہاں انھوں نے کمرے کے کونے سے پردہ سرکایا تو وہاں پتھر کا شیولنگ تھا اور پاس ہی سامگری کی ٹوکری دھری تھی۔ میرے استفسار پر کہنے لگے۔ کہ میں طبعاً و اعتقاداً بت پرست ہوں۔ شیولنگ اور کالی کو پوجنے میں ذہنی لذّت محسوس کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے اپنی نظم "کالی پوجا" سنائی (ص ۹۴)

یہ نظم "قلمکار" ہی میں ملاحظہ فرمایئے میں اسے یہاں نقل کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ بے حد فحش و عریاں ہے۔

وجہ خرابی اس اخلاقی انحطاط اور روز افزوں لذّت پرستی کی کئی وجوہات ہیں۔

۱۔ پیسے کی بہتات۔ دولت جس گھر میں قدم رکھتی ہے۔ یہی گل کھلاتی ہے۔

۲۔ تہذیب مغرب کا اثر۔ یورپ کی تہذیب میں بے حد عریانی و عیاشی ہے۔ ہمارے بے تربیت نوجوان سیکڑوں کی تعداد میں ہر سال یورپ جاتے ہیں۔ اور وہاں سے لذّت پرستی کے بیسیوں طریقے سیکھ کر آتے ہیں۔ پھر سیکڑوں امریکی و یورپی ہمارے ہر

شعبے میں گھسے ہوئے ہیں اور عیاشی پھیلا رہے ہیں۔

۳۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات انگریزی فلموں پر مرتے ہیں۔ ان فلموں میں نظر بازی، عریانی، جنسی بے راہ راہی اور اخلاق سوز مناظر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

۴۔ ایک اور مصیبت ہمارے لیڈروں کی زندگی ہے۔ ہمارے بیشتر وزراء، سفراء اور حکام اسلام سے بدکتے، خدا اور رسول سے بھاگتے اور عیش و مستی پہ جان دیتے ہیں۔ بھلا عوام کیوں پیچھے رہیں۔

۵۔ ناقص اور گھٹیا نصابِ تعلیم جس میں دل و دماغ کو متاثر کرنے، اسلامی اقدار کے احیاء اور دلوں پہ تصوّراتِ عالیہ کا نقش راسخ کرنے کے لیے کوئی مواد نہیں۔ اگر ہے بھی۔ تو بھونڈا اور بے اثر۔ ہمارے اونچے خاندانوں کے بچے کانونٹ یا پبلک سکولوں میں جاتے ہیں، جہاں کا نصابِ تعلیم انتہائی ضرر رساں ہے انگریزی مضمون کے نصاب میں نرسری سے آٹھویں تک ستائیس مرتبہ سؤر اور کئی مرتبہ شراب کا ذکر ترغیبی رنگ میں ملتا ہے۔ ایک دو جگہ حضور پر نور کی ذاتِ مقدس پر بھی حملے ہیں۔ کیپٹن ڈریک جیسے لٹیرے اور ڈک ٹرپن جیسے بدمعاش ڈاکوؤں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں ہمارے علی، عمر، غزالی، رازی، رومی، خالد، طارق وغیرہ کا ذکر تک موجود نہیں اور اخلاقی، روحانی اقدار پر ایک سطر تک نہیں ملتی، لطف یہ کہ طلبا اور والدین کا مقصد حصولِ علم نہیں۔ بلکہ صرف انگریزی سیکھنا ہوتا ہے اور بس۔ ان سکولوں سے نکل کر بچے کالجوں میں پہنچتے ہیں۔ تو وہاں جنٹلمین آف فرانس، اور ہیملٹ جیسی کتابیں پڑھا کر انھیں بی۔ اے کی ڈگری دیدی جاتی ہے۔ جب والدین، اساتذہ، لیڈر اور ماحول سب لامذہب ہوں تو لڑکا کیوں

لذت پرست نہ بنے۔

یہ لذّت پرست نوجوان جب حصولِ لذت کے وسائل نہیں پائیں گے تو چوری۔ ڈکیتی، اغوا اور جیب تراشی جیسی واردات پہ اتر آئیں گے (یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے) اور بڑے بڑے شہروں میں نہ کسی کی جان محفوظ ہوگی۔ نہ عزت اور نہ مال۔ سر بازار ڈاکے پڑیں گے، کاریں چوری ہوں گی۔ سڑکوں سے لڑکیاں اٹھائی جائیں گی۔ بازاروں میں فائر ہوں گے اور شہریوں کی زندگی عذاب بن جائے گی۔

کیا میرا اندازہ غلط ہے؟ اگر صحیح ہے۔ تو پھر تم اپنی اولاد کے سامنے شراب نوشی۔ نمائش بینی اور مذہب سے بے نیازی کی مثالِ بد کیوں پیش کر رہے ہو۔ انھیں کانونٹ اور پبلک سکولوں میں کیوں ذبح کرا رہے ہو۔ ان کی اخلاقی و روحانی تربیت سے کیوں غافل ہو؟ قومی زندگی میں ایک عمل کے نتائج برسوں بعد نکلتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کو صحیح راہ پر ڈالنے کے لیے آج قدم اٹھاؤ گے تو کام بنے گا۔ ورنہ جلد یا بدیر ملک مُبتلائے بلا ہو جائے گا۔ اور قوم جہنم کا ایندھن بن جائے گی۔

ہماری کج راہی کی ایک اور وجہ لائف، پوسٹ اور ووُمَین جیسے انگریزی۔ رسائل ہیں، جو ہمیں شوخ و رنگیں تصاویر کے ذریعے لذّت پرستی کی ترغیب دیتے ہیں۔ اگر ہماری حکومت رنگ و تصویر سے کام لے کر اسلامی اقدار کا پرچار کرتی تو آج ہمارا ماحول کچھ اور ہوتا۔

# لاطینی رسم الخط

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد فرنگ اور اس کے پاکستانی چیلوں نے لاطینی رسم الخط کو اس ملک میں نافذ کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ جب مارچ ۱۹۶۱ء میں یہ خطرہ بڑھ گیا۔ تو میں نے ایک خط صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں لکھا۔ نیز چند مضامین شائع کیے۔ ان میں سے دو مضمون اور وہ خط پیش خدمت ہے۔

برقؔ

## جلالت مآب صدرِ پاکستان کی خدمت میں

**عالی جاہ!** ۱۹؍فروری ۱۹۶۱ء کو ڈھاکہ میں آپ نے ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبانوں یعنی اُردو اور بنگالی میں رشتۂ وحدت پیدا کرنے کے لیے رومن رسم الخط اختیار کیا جائے۔ اِس سلسلہ میں باادب گذارش یہ ہے کہ اس مسئلہ کے بہت سے پہلو ہیں، جو برائے غور و فکر حاضرِ خدمت ہیں۔

اوّل ـــ قوت کے ماخذ دو ہی ہیں۔ اوّل یہ کائنات، جہاں سے ہم کوئلہ، پٹرول، فولاد، جوہری توانائی وغیرہ حاصل کرتے ہیں، اور دوسرا دل۔ جس سے وُہ قوت جنم لیتی ہے۔ جو چاند کو دو نیم۔ بحرہ قلزم کو خشک اور ربِ موسٰی کو طورِ سینا پہ جلوہ نمائی کے لیے مجبور کر سکتی ہے۔ پہلی قوت مطالعہ کائنات سے اور دوسری من کی دنیا میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتی ہے، مسلمان ان دونوں توانائیوں کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مطالعہ کائنات کے لیے ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں اور حریمِ دل کو منوّر کرنے کے لیے رومیؒ، غزالیؒ، اجمیریؒ، بلالؓ، سلمانؓ، حیدرؓ اور صدیقؓ جیسے اربابِ دل کے دریہ دستک دیتے ہیں۔ اگر آج تمام درسگاہوں میں لاطینی حروف جاری کر دیئے جائیں۔ تو ایک نسل کے بعد ساری قوم عربی حروف سے ناآشنا ہو

ہو جائے گی۔ سارے پاکستان میں قرآن عظیم کی عبارت پڑھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ ہم حدیث، تفسیر، فقہ اور اپنے بزرگوں کی دیگر لاکھوں تصانیف سے محروم ہو جائیں گے۔ ماضی سے رشتہ کٹ جائے گا اور وہ تمام سوتے خشک ہو جائیں گے جن سے کشتِ دل سیراب ہوتی ہے۔ پھر ہمارے ہاں نہ کوئی جنید پیدا ہوگا، نہ بایزید نہ سعدیؔ، نہ حافظؔ، نہ ابنِ حنبلؒ، نہ ابنِ قیمؒ۔ ایسی بے روح انسانوں کی بھیڑ کو ہم کیا کریں گے؟ اور ان سے انسانیت کی نشو و نما میں کون سی مدد ملے گی۔

اس وقت دنیا میں دو گروہ ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہیں اشتراکی اور مستعمرینِ مغرب! ہر دو نفس پرست اور شکم پرور۔ دونوں زمان و مکان کے زناری اور ہر دو کے دیدہ و دل تاریک۔ اس لیے دنیا میں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو جسم و رُوح دونوں کی ضروریات مہیا کرے۔ جو انسان کو کائنات کا آقا اور اللہ کا غلام بنائے۔ جس کا دامن ایک طرف آب و گل سے اور دوسری طرف روحِ کائنات سے وابستہ ہو۔ اور یہ کام مسلمان ہی سرانجام دے سکتا ہے۔

اگر خدانخواستہ لاطینی رسم الخط کی ترویج کے بعد مسلمان ان بڑے بڑے ذخائر سے محروم ہو گیا۔ جو اس کے اسلاف نے انسان کی روحانی نشو و نما کے لئے فراہم کئے تھے تو پھر کاروانِ انسانیت شاہراہِ حیات سے بھٹک جائے گا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے روح تڑپ اٹھے گی۔ زمین پر اللہ کی مشیّت کا کوئی مفسر باقی نہیں رہے گا۔ اور اس کے بعد ایک بے کردار ملحد اور مسلمان میں امتیاز دشوار ہو جائیگا۔

حضورِ والا۔ اگر ایک رسم الخط سے متحدہ قومیت کا شعور بیدار ہو سکتا، تو پھر یورپ میں جہاں صرف لاطینی رسم الخط رائج ہے۔ صرف ایک قوم ہوتی بیس نہ ہوتیں۔ خط تو

سا ایک طرف، ایک زبان بھی وحدتِ قومیت کا احساس پیدا نہیں کر سکتی۔ انگلینڈ۔ امریکہ۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی زبان ایک ہے، یعنی انگریزی۔ اور قومیں پانچ۔ اسی طرح عراق، شام، اُردن، فلسطین، لبنان، سعودی عرب، یمن، بحرین، کویت، مصر اور لیبیا کی زبان اور رسم الخط عربی ہے اور قومیں گیارہ۔ دنیا میں چار ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن اقوام صرف ایک سو چونتیس۔

دوئم ـــــ حروف آوازوں کی علامات ہیں، ان آوازوں کی تعداد عرب میں اٹھائیس تھی: ایرانیوں نے ان میں، پ، چ، ژ اور گ کا اضافہ کیا۔ یہی آوازیں جب ہند میں پہنچیں تو تین مزید حروف کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی ٹ، ڈ، ڑ عرب سے اٹھائیس[۲۸] حروف چلے تھے، ایران میں پہنچ کر بتیس[۳۲] اور ہند میں پینتیس[۳۵] بن گئے۔ دوسری طرف لاطینی حروف کی تعداد صرف چھبیس ہے۔ جن میں سے تین آوازیں ہمارے لیے بیکار ہیں۔ یعنی x، w، q۔ باقی رہے ۲۳ حروف تو ظاہر ہے کہ ان سے ۳۵ آوازوں کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ ز کے لیے تو ہو گیا Z ذ، ظ، ض کے لیے حروف کہاں سے لائیں گے؟ ث، س، ص، ط، ٹ اور الف، ع میں کیسے تمیز کریں گے؟ حل، ہل، مقرر، مکرّر اور اَلَم، عَلَم، آلام، اعلام عالم کو کیسے لکھیں گے؟ کیا عَلَم، اَعلام۔ آلام، عالم کا ہجا ایک ہی نہیں ہو گا؟ یعنی ALAM کیا AM کو کوئی عام کوئی آم اور کوئی ایم نہیں پڑھے گا؟ یائے مجہول، مثلاً دیر، بہیر، ڈھیر کی آواز انگریزی میں کیسے ادا ہو گی؟ ہمیں کون بتائے گا کہ GHAR غار ہے، گھر نہیں۔ اور GHAT گھاٹ ہے۔ گھٹ (کم) یا غٹ (غٹ غٹ پانی پینا) نہیں HALL حل ہے۔ ہل، ہال یا حال نہیں HAKIM حاکم ہے، حکیم نہیں؟ اس قسم

کی ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

سوئم :- اردو میں دو اور بڑی بڑی خوبیاں ہیں۔

**اول** :- یہ بہت کم جگہ گھیرتی ہے انگریزی کے دس صفحات کا اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو وہ پانچ صفحات میں سما سکتا ہے۔ اگر آج سرکاری دفاتر میں اردو جاری کر دی جائے۔ تو کاغذ میں کئی لاکھ ٹن سالانہ کی بچت ہو گی

دوم :- اس کے پڑھنے میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ میں انگریزی کتاب کے زیادہ سے زیادہ بیس صفحات پڑھے جا سکتے ہیں اور اردو کے ساٹھ۔

چہارم :- ہمارے ہاں مختلف قسم کے خطوط رائج ہیں مثلاً موشح، مشجر، ریحانی، خط گلزار وغیرہ جن کے حسین نمونے، قلمی نسخوں اور تاریخی عمارتوں میں جا بجا ملتے ہیں اور جن پر ساری قوم نازاں ہے لاطینی رسم الخط کی ترویج کے بعد ہم اسلاف کا یہ بیش بہا سرمایہ کھو بیٹھیں گے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آجائے گا کہ اس قسم کے نوشتے پڑھوانے کے لیے ہمیں کابل یا ایران سے آدمی منگوانا پڑیں گے۔

پنجم :- کچھ عرصہ کے بعد ہمیں قرآن، حدیث، کلامِ اقبال و غالب وغیرہ کو لاطینی حروف میں منتقل کرنا پڑیگا۔ چونکہ رومن میں لکھی ہوئی اردو کو پڑھنا ایک سیدھی چٹان پہ چڑھنا ہے۔ اس لیے لوگ اردو کی ان "لاطینی" کتابوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور صرف ۳۰ برس کے عرصے میں ساری قوم جاہل ہو جائے گی۔ جس کا رشتہ ماضی اسلاف اور خدا سب سے کٹ چکا ہو گا۔ اور اس کے سامنے اخلاق، ایمان، خدا، جزا و سزا وغیرہ کا کوئی تصوّر باقی نہیں رہے گا۔

یہ ایک آیت ہے۔

Lo Takhuguku Senatun Wela
naumm :-

اور یہ ایک شعر ہے۔

Too ne yih Kia Ghazab Kiya Mujhko
Bhi Fash Kar Diya,
Main he to Aik Raz Tha Sinia
Kaienat Man :-

شاید آدھ گھنٹے کی مغز سوزی کے بعد بھی پڑھنے میں کامیابی حاصل نہ ہو۔

آیت ہے۔ لَا تَاخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوم

اور شعر ہے ——

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

عظمت پناہا! مسلمان کی بقاء و طاقت کا راز اس تعلق میں ہے۔ جو وہ رب کائنات سے قائم کرتا ہے۔ چونکہ لاطینی حروف کی ترویج سے اِس تعلق پہ شدید ضرب پڑے گی۔ مُسلم کا حسین ماضی اِس سے چھن جائے گا۔ اور صرف ایک نسل کے بعد قرآن حکیم اسے گورمکھی کی کوئی کتاب نظر آنے لگے گی۔ اس لیے خدمت عالیہ میں باادب التماس ہے کہ اُردو کو عربی حروف میں ہی زندہ رکھا جائے اور لاطینی رسم الخط کی تجویز ہمیشہ کے لیے ترک کر دی جائے

ترکوں کی مثال | غالباً ۱۹۲۸ء میں ترکوں نے عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی خط جاری کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء تک عربی حروف سے آشنا نسل ختم ہو گئی اور اس کے بعد ساری قوم کے دلوں و دماغ پر نار یکیاں مسلط ہو گئیں۔ مسجدوں کو قریب قریب تالے لگ گئے درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ عطار و غزالی کے نام تک سے وہ لوگ ناآشنا ہو گئے۔ زندگی کا تصور ہی بدل گیا۔ ہر چھوٹا بڑا عیش پرستانِ یورپ کے نقوشِ قدم پر چل نکلا۔ اس کے بعد وہاں مغرب زدہ قسم کے لوگ تو لاکھوں پیدا ہوئے۔ لیکن رومی یا افغانی قطعاً پیدا نہیں ہو سکا۔

کسی قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ کر اللہ سے دُور ہٹا کر اور دنیائے دل سے جو نور و سرور اور حیات و قوت کا سرچشمہ ہے۔ غافل کر کے اپنے پیچھے لگا لینا شاطرانِ یورپ کا دل پسند کھیل ہے اور اس مقصد کے لیے ان کے بڑے بڑے حربے دو ہیں۔ اوّل انگریزی زبان اور اگر اس جال سے کوئی قوم بچ نکلے تو پھر لاطینی رسم الخط۔ انگریز کو باقی تمام اقوام کی نسبت مسلمان کے مسائل سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اسے ہندو سے کوئی خطرہ نہیں کہ وہ آج تک کسی میدان میں انگریز کے سامنے نہیں آیا۔ نہ بدھسٹ سے کوئی ڈر ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں رہتے ہیں اگر وہ ڈرتا ہے تو مسلمان سے جس نے ماضی میں اسے صد ہا شکستیں دیں۔ ہسپانیہ پر آٹھ سو برس حکمران رہا۔ قسطنطنیہ اور تھریس پہ آج تک قابض ہے۔ بحیرۂ روم کا تمام مشرقی و جنوبی اور بحرِ اوقیانوس کا مغربی ساحل اس کے قبضہ میں ہے۔ اس کی پچیس آزاد سلطنتیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں۔ اس کے پاس تیل ربڑ۔ جوٹ۔ کپاس۔ ٹین۔ گندم اور دیگر اجناس کے بے اندازہ ذخائر ہیں۔ علاوہ ازیں انگریز ایک کارخانہ دار ہے اور مسلمان

اِس کا مزارع - ہر جگہ مسلمان اپنا غلّہ یورپ کے کارخانہ داروں کو بھیج رہا ہے اگر آج یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو انگریز کا زندہ رہنا محال ہو جائے گا - انگریز کی نجات اِسی میں ہے کہ -

۱- مسلمان اللہ سے دُور رہے -

۲- اپنے ماضی سے بے تعلق ہو جائے -

۳- مزارعانہ زندگی بسر کرنے پر قانع ہو

۴- اپنی ہر چیز کو بُرا اور ہر انگریزی چیز کو اچھا کہتا رہے -

۵- انگریزی پڑھے -

۶- اور اگر انگریزی سے بھاگ نکلے تو لاطینی رسم الخط کی دلدل میں تا بہ گلو دھنس جائے -

بس یہ تھیں چند گزارشات -

(۲)

# لاطینی رسم الخط اور اردو

آج سے کچھ عرصہ پہلے اے۔ پی۔ پی نے یہ شوشہ چھوڑا، کہ حکومت پاکستان لاطینی رسم الخط کا قضیہ پارلیمان سے طے کرانے کا انتظام کر رہی ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی ہر محبِ وطن پاکستانی چونک اٹھا۔ اور سوچنے لگا، کہ وہ کونسے لوگ ہیں، جو اِس مسئلے کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور دس کروڑ پاکستانیوں کی خواہش کے خلاف۔ اِن پر یہ خط ٹھونسنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا، کہ قرآن عظیم کے مقدّس حروف میں کیا خرابی ہے اور انگریزی خط میں کون سی خوبی ہے، کہ وہ اوّل الذکر سے بھاگ رہے ہیں اور ثانی الذکر پر جان دے رہے ہیں۔ میرا اندازہ یہ ہے، کہ سارے پاکستان میں زیادہ سے زیادہ آٹھ، دس ایسے بزرگ ہیں۔ جو اس تجویز کے موجد و محرک ہیں۔ ان میں سے ایک دو سے مجھے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اِن حضرات کے پاس نہ تو ان وزنی دلائل کا کوئی جواب ہے۔ جو آج تک عربی حروف کے حامیوں کی طرف سے بار بار پیش ہو چکے ہیں۔ اور نہ اپنے مؤقف کی تائید میں کوئی دلیل بس اتنا ہی کہہ کر رہ جاتے ہیں۔

۱۔ کہ لاطینی خط بڑا ترقی یافتہ اور ماڈرن خط ہے

۲۔ کہ عربی حروف میں کچھ خامیاں ہیں کہ لکھو، ہوا، اور پڑھو، ہوا۔

۳۔ کہ لاطینی خط کی بدولت جزائر شرق الہند کا تناسب خواندگی یک دم

دس سے نوے فی صد ہو گیا ہے۔

۲۔ کہ اردو ادب چند لایعنی قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کام کی کتابیں صرف دو تین درجن ہی ہیں، جنھیں دو تین ہفتوں میں لاطینی حروف میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اس بات کی تو ہم بھی تائید کرتے ہیں کہ انگریز ماڈرن، اس کی خواتین ماڈرن، اس کے کلب اور اس کے رقص ماڈرن، اس کی ہر چیز ماڈرن تو پھر اس کا رسم الخط کیوں ماڈرن نہ ہو۔ دوسری طرف ہماری تہذیب، ہمارا مذہب ہماری اقدار و روایات سب دقیانوسی بھلا ہمارا جدت پسند اور یورپ گزیدہ طبقہ دقیانوسی بننے کی ذلت کیسے گوارا کر سکتا ہے۔

۳۔ یہ کہ اردو میں بعض الفاظ کو لکھتے کچھ اور پڑھتے کچھ ہیں۔ تو یہ نقص۔ نقص ہے اگر عربی حروف میں پایا جائے۔ اور اگر انگریزی میں KNIFE (کنائف) کو نائف — (KNOW) کناؤ کو نو (ENOUGH) انوغ کو اینف، (THROUGH) تھراوغ کو تھرد اور (COLOUR) کلاور کو کلر پڑھیں تو کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ ایک ماڈرن زبان ہے۔ انگریزی میں تیس ہزار الفاظ ایسے ہیں، کہ ان کی کتابت کچھ ہے اور تلفظ کچھ۔ لیکن اس صورت حال پر نہ ہمارے "صاحب بہادروں" کو کوئی اعتراض ہے اور نہ انگریز اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار ہے۔ دوسری طرف ہمارے بعض پاکستانی اتنے نازک مزاج ہیں۔ کہ ہَوا کو ہُوا سے متمیز کرنے کی ذراسی دقت پیش آ جائے تو شور مچا دیتے ہیں۔ کہ اس رسم الخط کو ذبح کر دو اور ہم ماڈرن لوگوں کے لیے ولایت سے نیا خط منگاؤ۔

تیسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ انڈونیشیا میں لاطینی رسم الخط کی وجہ سے خواندگی

کا تناسب دس سے نوّے فی صد ہوگیا۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے کہ دس سال پہلے وہاں خواندہ افراد کی تعداد اسّی لاکھ تھی۔ اور اب آٹھ کروڑ ہو گئی ہے۔ کیا خواندگی کا تعلق دفتری حکم سے ہے۔ کہ ادھر لاطینی خط کے نفاذ کا حکم جاری ہوا۔ اور ادھر تمام لوگ خود بخود خواندہ بن گئے؟ خواندگی نتیجہ ہے بے شمار سکولوں اور اساتذہ کی کوشش کا اسی تعداد میں سکول یہاں کھولیئے، اور اساتذہ مہیا فرمایئے۔ وہی تناسب یہاں بھی ہو جائیگا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ لاطینی رسم الخط اختیار کرنے سے ہمیں ان تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۱۔ کہ ہم سے اردو کی چھ لاکھ کتابیں جو گذشتہ پانچسو برس کی طویل مدت میں لکھی گئی تھیں چھن جائیں گی۔

۲۔ ہم فارسی کی گیارہ لاکھ اور عربی کی لاتعداد کتابوں سے محروم ہو جائیں گے

۳۔ کہ ہمیں اپنی درسگاہوں سے عربی اور فارسی کو نکالنا پڑے گا۔ کیوں کہ ہم بیک وقت اپنے طلبا کو دو رسم الخط نہیں سکھا سکتے۔

۴۔ ہمارا رشتہ ہمارے شاندار اسلاف جن میں رازیؔ، رومیؔ، غزالیؔ، سعدیؔ، ابن قیمؒ۔ ابنِ حنبل، ابنِ تیمیہؒ۔ ابن حزم، سینا اور فارابی جیسے ہزار ہا معمارانِ نور و ہدایت شامل ہیں سے کٹ جائے گا۔ ہم صحیح فکر سے محروم ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ الحاد و عیاشی کا شکار بن جائیں گے، تو جواب ملتا ہے:۔

"واہ جی آپ کے پاس لٹریچر ہی کون سا ہے۔ اڑھائی بوٹیاں اور پھتو باغبان، طوطے مینا کی کہانی۔ داستانِ امیر حمزہؒ، قصہ چہار درویش اور چند دیگر لایعنی کہانیاں اللہ اللہ اور خیر سلا۔ اِن کتابوں کے بغیر بھی قوم زندہ رہے گی۔

ان ملاؤں کو کون سمجھائے کہ ہماری زبان میں دس بیس نہیں، پوری چھ لاکھ کتابیں ہیں جن میں غواصی دکنی سے لے کر فیض تک ہزارہا شعراء کے دیوان، خواجہ گیسو دراز سے لے کر اب تک لا تعداد نثری مجموعے، قرآنِ مقدس کے بیسیوں تراجم، سر سید ذکاء الملک، وقار الملک، محمد حسین آزاد، شرر، راشد الخیری۔ شبلی، حالی، سلیمان ندوی۔ عبدالسلام ندوی، ابوالکلام آزاد، اقبالؒ، نذیر احمد سرشار۔ ظفر علی خان ظفر غلام رسول مہر، سالک، مشرقی، خلیفہ عبدالحکیم، حسرت، شورش، فراق، نیاز، عبدالمجید وقار عظیم۔ ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر عبادت، نسیم حجازی۔ رئیس احمد جعفری، پرویز، بابائے اردو، اور دیگر ہزارہا اہلِ قلم کی لاکھوں علمی، ادبی، اخلاقی، تنقیدی، تاریخی اور ثقافتی تخلیقات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تمام احادیث، شاہ ولی اللہ، غزالی، سعدی ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، اور دیگر علمائے مصر و شام و مفکرینِ عراق و ایران کی بیشتر تصانیف اور کئی سو انگریزی شاہکاروں کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو، پاکستان، نے اردو ادب کی فہرست کی پہلی جلد "قاموس الکتب" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں ایسی بارہ ہزار کتابوں کا ذکر درج ہے۔ جن کا موضوع مذہب ہے۔

کیا ہم ان تمام علمی خزائن کو اٹھا کر محض اس لیے نذرِ دریا کر دیں کہ ہمارے چند فرنگ مزاجوں کا شوقِ فرنگ پرستی پورا ہو جائے۔

ترکی نے ۱۹۲۸ء میں لاطینی خط اختیار کیا تھا۔ آج اس واقعہ کو چھتیس برس ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ لوگ اپنی عظیم علمی میراث یعنی آٹھ لاکھ کتابوں میں سے اب تک صرف دو سو کو لاطینی حروف میں منتقل کر سکے ہیں۔ انہی دو سو کتابوں کو پڑھ

کردہ وکیل بنتے ہیں۔ اور پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، مکینک، ادیب، مورخ اور فلسفی بھی
ہائے بے بسی اور وائے کم نظری آج سے ایک ماہ پہلے دالخلافہ کے ایک خاص اجتماع
میں یہی مسئلہ زیر بحث آیا تو ایک صاحب کہنے لگے۔

" ڈاکٹر صاحب! گھبرائیے مت! میں آپ کی ان چھ لاکھ کتابوں کو ایک مہینہ
میں لاطینی خط میں منتقل کر ڈالوں گا۔

ایک طرف تو بلند ہمتی کا یہ عالم کہ عمر عزیز کے پنتالیس برس گزار دیئے اور اپنی
تحریرات کا ایک مجموعہ تک مرتب نہ کر سکے اور لاف زنی کی یہ انتہا کہ وہ چھ لاکھ کتابیں
کو جن کے صفحات کی تعداد کم از کم تیس کروڑ بنتی ہے۔ صرف تیس دنوں میں لاطینی
میں بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یعنی روزانہ ایک کروڑ صفحہ اگر کام کرنے کے اوقات
شب و روز میں بارہ گھنٹے ہوں۔ تو گھنٹے میں آٹھ لاکھ صفحے۔ اِس پر یہی کہہ سکتا ہوں

" اشکے او شیرا "

اور پھر کتنی ہی مرتبہ خط لاطینی کے حامیوں سے کہا گیا کہ ہماری زبان میں الف
سے یا تک ۳۶ آوازیں ہیں۔ اور لاطینی میں کل ۲۶ جن میں سے C-V-W اور X
ہمارے لیے بیکار ہیں۔ باقی رہیں ۲۲ ان سے ۳۶ آوازوں کا کام کیسے لیا جا سکتا
ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ نقطے ڈال کر مثلاً ط (بے نقطہ) دال اور ڈ (بالنقطہ) ڈال
کا کام دے گی۔ بہت اچھا۔ آئیے، ذرا دیکھیں، کہ قریب الصوت اور ہم صوت حروف
کتنے ہیں اور ہمیں کتنی علامات درکار ہوں گی۔

الفاظ کے مختلف گروہ یہ ہیں:۔

| | | |
|---|---|---|
| ١- ا - آ - ء - ع | ــــــ | ۴ |
| ٢- ب - پ | ــــــ | ٢ |
| ٣- ت - ٹ - ط | ــــــ | ٣ |
| ۴- ث - س - ص | ــــــ | ٣ |
| ۵- ح - ہ | ــــــ | ٢ |
| ٦- د - ڈ | ــــــ | ٢ |
| ٧- ر - ڑ | ــــــ | ۴ |
| ٨- ذ - ز - ض - ظ | ــــــ | ٢ |
| ٩- غ - گھ | ــــــ | ٢ |
| ١٠- ق - ک | ــــــ | ٢ |
| ١١- ی - ژ | ــــــ | ٢ |
| ١٢- ہائے مخفی و جلی | ــــــ | ٢ |
| ١٣- واؤ و یائے مجہول | ــــــ | ٢ |
| ١۴- الف اور فتحہ | ــــــ | ٢ |
| ١۵- ی اور کسرہ | ــــــ | ٢ |
| ١٦- واؤ اور ضمہ | ــــــ | ٢ |
| میزان | | ٣٨ |

یعنی حروف اٹھارہ ہوں گے اور علامات اڑتیس، اس گورکھ دھندے کو یاد کون رکھے گا۔ پھر ش کی کوئی معیّن آواز حروف لاطینی میں موجود نہیں۔ اس آواز

کے لیے کبھی وہ TIO (STATION) کبھی SSIO (SESSION)۔ کبھی SCI–
(CONSCIENCE) کبھی CIA (FACIAL) کبھی SHI (FASHION)
اور کبھی SH (SHRIEK) سے کام لیتے ہیں۔ آپ کون سی صورت پسند فرمائیں گے۔ اور کیوں؟

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور فرمایا کہ ان حروف میں لکھی ہوئی اردو کو پڑھے گا کون؟ ن۔ م۔ راشد صاحب اس رسم الخط کے سب سے بڑے مبلغ ہیں محترم ان کی "ماورا" کو لاطینی میں چھاپ کر دیکھئے۔ اگر قیامت تک ایک نسخہ بھی بک جائے۔ تو ہم ہارے اور آپ جیتے۔ پاکستان ایک جمہوریت ہے۔ اتنی بڑی تبدیلی کی تجویز کرنے سے پہلے عوام سے رائے لینا ضروری ہے۔ یہاں عوام سے مراد ان پڑھ دیہاتی نہیں جو ان مسائل کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ بلکہ آبادی کا تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔

**ممبرانِ پارلیمان سے بدگمانی** جب اے۔ پی۔ پی کی خبر بالا اخبار میں شائع ہوئی تو ایک دوست گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے!

"ڈاکٹر صاحب! اب کیا ہوگا ہمارے ممبران پارلیمنٹ کی ایک خاصی تعداد فکر و نظر کے جوہر سے محروم ہے۔ اگر یہ تجویز پاس ہوگئی تو پھر؟

میں نے عرض کیا کہ یہ بات نہیں۔ اگر مغربی پاکستان کے صرف پندرہ ممبر بھی مسئلہ زبان وخط کو سمجھے ہوئے ہیں تو یہ تجویز کبھی کامیاب نہیں ہوگی۔

**اس تحریک کے اصلی اسباب** تبدیلی رسم الخط کے حقیقی محرک اور معاون دو ہیں۔

اوّل فرنگ۔ جس کی گلوبل پالیسی یہ ہے کہ مسلمان ہر جگہ بدعمل رہے اور قرآن

سے اس کا رشتہ قائم نہ ہونے پائے۔ مسلمان انڈونیشیا سے بحر اوقیانوس کے سواحل تک ہلال کی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہر جگہ جاگ رہا ہے۔ گزشتہ پندرہ برس کی مختصر سی مدت میں اس کی ۱۴ آزاد سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اگر مسلمان کا رشتہ قرآن سے استوار ہو گیا۔ تو وہ دوبارہ یورپ کے لیے خطرہ بن جائے گا اور فرنگ اس دولت سے، جو انبار در انبار یورپ میں پہنچ رہی ہے محروم ہو جائے گا۔ کون نہیں جانتا کہ اسلامی ممالک قدرتی وسائل کے لحاظ سے بے حد دولت مند ہیں۔ جاوا، سماٹرا اور بورنیو میں ربڑ، چینی اور تیل کی بہتات ہے، بحرین، کویت، ایران اور عراق کے تیل سے یورپ اور ایشیا کی تمام موٹریں چل رہی ہیں۔ افریقہ سونے، لوہے، پیتل اور کوئلے کا گھر ہے۔ اگر آج مسلمان منظم ہو جائے تو معاً یورپ کی سیاسی اور معاشی حالت دگرگوں ہو جائے۔ اس لیے یورپ کی یہی کوشش ہے کہ مسلمان ہر جگہ محتاج و مغلوب رہے، وہ یورپ کے آستان پر سدا دُم ہلاتا رہے، اپنی قدرتی دولت کو کبھی نہ سنبھال سکے۔ اور اپنے تمام ذخائر یورپ کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ کر عیاشی کا کچھ سامان مثلاً موٹریں، ٹرانسسٹر اور ریفریجریٹر وغیرہ خریدتا رہے اور اس کے عوام فاقہ و افلاس کی وجہ سے دائماً موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہیں

دوم: تبدیلی خط کا دوسرا محرک بعض پاکستانی ادیبوں اور افسروں کا ایک ایسا طبقہ ہے۔ جو اسلام سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ جس کے لیے روزہ موت نماز سب سے بڑی کوفت، زکوٰۃ بے جا اسراف اور قرآن دقیانوسی ہدایات کا ایک ناکام ضابطہ ہے۔ اس گروہ کے بعض افراد کمیونزم سے متاثر ہیں اور بعض دیگر انگریز کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو اردو کو پاکستانی

دفاتر اور درسگاہوں میں داخل نہیں ہونے دیتا۔

اگر آج یہ خط پاکستان میں جاری کر دیا جائے۔ تو تیس سال تک عربی حروف جاننے والے پاکستان میں ختم ہو جائیں گے۔ اور اس کے بعد قرآن کو لے کر سارے پاکستان میں گھوم جائیے۔ اسے کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔

**عذر سہولت کار:** لاطینی خط کے جواز میں ایک اور عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اردو ٹائپ رائٹر مکمل نہیں اور اگر خط بدل دیں تو موجودہ ٹائپ رائٹر ہی سے کام چل جائیگا اس میں سہولت بھی ہوگی اور کفالت بھی۔ جی ہاں قوم کو لامذہب، لاماضی اور لامستقبل بنانے میں بڑی سہولت ہو جائیگی۔ جب گذشتہ چودہ سو برس سے ہم عربی حروف میں اپنی عظیم سلطنتوں کا کاروبار چلاتے رہے ہیں اور آج بھی مصر، عراق، ایران، شام، شرق اردن سعودی عرب، یمن، سوڈان۔ لیبیا، ٹیونس، مراکش، اور الجزائر نہایت کامیابی سے اپنے دفاتر اور یونیورسٹیاں چلا رہے ہیں۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کے ایک صوبے کا تعلیمی اور دفتری کام ان حروف سے کیوں نہیں چل سکتا۔

**کمال اتاترک اور ایک پروفیسر:** (غالباً) نسیم حجازی جو کچھ عرصہ پہلے ترکی کی سیاحت سے واپس آئے ہیں۔ اس کہانی کے راوی ہیں۔ کہ جب ۱۹۲۸ء میں کمال اتاترک نے عربی حروف کی جگہ لاطینی خط جاری کر دیا تو ایک بوڑھا پروفیسر اتاترک کی خدمت میں پہنچا وہ اپنی بیوی اور پانچ بچوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ اتاترک نے انہیں احترام سے بٹھایا اور تکلیف فرمائی کی وجہ پوچھی پروفیسر نے ایک ریوالور میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

آپ نے آج ایک فرمان کے ذریعہ ملک کا رسم الخط بدل دیا ہے۔ اس

کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آنے والی نسلیں اپنے ماضی، اپنے اسلاف، اپنے ادب اور اپنی اقدار و روایات سے کٹ جائیں گی۔ رسم الخط ایک ایسی وادی ہے جس میں علم و فکر کے چشمے ماضی سے مستقبل کی طرف رواں رہتے ہیں۔ خط کو بدل کر آج آپ نے ان دھاروں کا رُخ پھیر دیا ہے۔ میری قوم کا حال ادب سے خالی ہے، ماضی سے اس کا رشتہ کٹ گیا ہے۔ نتیجتاً اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ ساری قوم اللہ سے کٹ کر یورپی تہذیب کی گرویدہ ہو جائے گی۔ وہ اس طرح اس کی دنیا و آخرت دونوں ہی تباہ ہو جائیں گے۔ اس ریوالور میں سات گولیاں ہیں اور میرے گھر کے آدمی بھی سات ہیں۔ برائے مہربانی ہم کو مار ڈالیے اور یہ فرمان واپس لے کر آنے والی لاتعداد نسلوں کو تباہی سے بچا لیجئے۔ میں یہ قربانی اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ شاید میری قوم بچ جائے۔

وہ مصطفےٰ کمال پاشا جو اناطولیہ و سمرنا کے میدانوں میں ہم انگریز کو شکست دے چکا تھا۔ میدانِ فکر میں انگریز سے وہ مار کھائی کہ آج اس کی قوم لامقصدی — بے راہ روی اور فکری انتشار میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ نہ ماضی، نہ مستقبل نہ منزل، نہ فکرِ منزل۔ جلال الدین رومی کی یہ عظیم قوم کبھی اپنی منزل اللہ کی طرف یوں بڑھ رہی تھی کہ زندگی کی تمام عظمتیں جلو میں اور رحمتیں سر پر سایہ فگن تھیں۔ لیکن آج وہ بھیڑ ہے بے مقصد اور ایک کارواں ہے بے منزل۔ اللہ پاکستان کو اس عبرتناک انجام سے محفوظ رکھے۔

# لاطینی رسم الخط اور ن م راشد

ن م۔ راشد وہی "ماورا" کے مصنف غالباً واحد پاکستانی ہیں جو ہمیں تقریروں، تحریروں سے رومن رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں اس سلسلے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے ان کی ایک تقریر نشر ہوئی ہے جو آہنگ (۱۵ جون ۱۹۶۱ء میں درج ہے آئیے ذرا ان کے ارشادات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

**غسلِ دماغ** | "غسلِ دماغ" انگریزی کی ایک اصلاح (Brain washing) کا ترجمہ ہے جس کا مفہوم ان امثلہ سے سمجھئے۔

۱۔ آج سے چند صدیاں پہلے ہمارے ہاں خانقاہوں میں تصوف کی عملی تربیت دی جاتی تھی۔ جب کوئی شخص صوفی بننے کے لیے خانقاہ میں آتا تھا۔ تو اس کا ذہنی ماحول بدلنے کے لیے کئی قدم اٹھائے جاتے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے اونٹ کے بالوں کا ایک کھردرا چولہ اُسے پہنایا جاتا۔ کئی روز تک بھوکا رکھا جاتا۔ وہ زمین پر سو کر راتیں کو کم از کم پانچ گھنٹے سجدہ و عبادت کرتا، عبادت میں خدا، رسول یا شیخ کا تصور باندھتا اور زندگی کی تمام لذات سے اُسے دُور رکھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس نئے ماحول میں ڈھل جاتا اور زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نگاہ کلیتہً بدل جاتا تھا۔

۲۔ میرے ایک شناسا جو اچھے بھلے آدمی تھے۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ بازارِ نغمہ و حُسن میں جانے لگے۔ رفتہ رفتہ رنڈیوں کی طرح نخرے اور باتیں کرنے لگے

"تیرے سر کی قسم"، "تیری جان کی قسم"، ان کا تکیہ کلام بن گیا۔ عیش و لذت کے گرویدہ اور خدا اور رسولؐ سے منحرف ہو گئے۔

یہ ہیں غسلِ دماغی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تیسری صورت بھی ہے جس کے بڑے بڑے ادارے یورپ میں ہیں۔ گزشتہ چودہ صدیوں سے عیسائیت اسلام سے برسرِ پیکار ہے۔ وہ ہماری تلوار اور تنومند افکار سے ہمیشہ لرزہ براندام رہا ہے اس نے ہمیں اس وقت کچلنے کی کوشش کی جب ہماری تعداد دو تین لاکھ تھی۔ اور آج تو ہم بفضلِ خدا ستر کروڑ ہیں۔ وہ ہم سے کیوں خائف نہ ہو اُسے ڈر ہے کہ:-

(۱) کہیں یہ ستر کروڑ انسانوں کی بھیڑ منظم ہو کر یورپ کے لیے پھر خطرہ نہ بن جائے یا یہ کوئی کامن ویلتھ نہ بنالیں۔

۲۔ اس وقت مسلمان ہر جگہ یورپ کا مزارع ہے جو اس کے لیے پٹ سن، چاول، چائے، ربڑ، آلو، پھل اور غلّہ اگا رہا ہے اپنے معاون یعنی تیل، لوہا، ٹین تانبہ وغیرہ کوڑیوں کے مول اس کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔ ایک دو موٹریں لے کر ایک ایک ضلع کی پیداوار اسے بھیج رہا ہے۔ فولاد کے استعمال سے بے خبر اور بھاری صنعتوں کے فوائد سے ناآشنا ہے۔ ہل چلانے، مٹی کھودنے اور مزدورانہ زندگی بسر کرنے پر قانع ہے۔ یورپ اس کی دولت پہ عیش اڑا رہا ہے اور یہ بے بس ہو کر سب کچھ بچشمِ حیرت دیکھ رہا ہے۔ اگر چینیوں کی طرح مسلمان بھی جاگ اٹھا کارخانے لگا کر اپنی خام اجناس اپنے ہی استعمال میں لے آیا۔ تو فرمائیے کہ انگلستان فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اور غربی جرمنی کی آبادی کہاں سے کھائے گی۔ وہ لوگ تو اپنی زمینوں سے دو ماہ کی خوراک بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

۳۔ اور سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں مسلمان مسلمان نہ بن جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ایک سیلِ تند کی طرح کائنات پر چھا جائے گا اور اس کے عظیم و مہیب انکار و نظریات کے سامنے مسیحیت دم توڑ دے گی۔

یورپ نے ان خطرات کا انسداد یوں کیا۔

۱۔ اسلامی ایمپائر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے اپنے نمک خواروں کے حوالے کر دیا۔ اور پھر ان میں سیاسی و معاشی مسائل کی بنا پر پھوٹ ڈال دی۔ تاکہ سدا ایک دوسرے کا منہ نوچتے رہیں۔ اور کسی دوسری طرف توجہ ہی نہ کر سکیں۔

۲۔ بہر حیلہ و بہر کر انہیں بھاری صنعتوں سے محروم رکھا۔ تاکہ سدا ہل چلاتے رہیں

۳۔ انہیں نہ جنگی جہاز دیئے نہ طیارے۔ تاکہ جنگ کی صورت میں ان کی افواج ایک دن میں گھٹنے ٹیک دیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ترکی جو تقریباً چالیس برس سے یورپ کا یارِ غار، نہایت تابعدار اور پرلے درجے کا دلدادہ ہے کے پاس صرف آٹھ ڈسٹرائرز (چھوٹے جنگی جہاز) ہیں جن کا وزن صرف چالیس ہزار ٹن ہے اور خود انگریز کے سمندری بیڑے کا وزن تیرہ کروڑ ٹن ہے۔ پھر انگریز کے کارخانوں میں ہر سال نو کروڑ ٹن فولاد ڈھلتا ہے اور ترکی ایک چھٹانک بھی تیار نہیں کر سکتا۔ ترکی کے پاس ساڑھے پانچ ہزار ٹریکٹر ہیں، لیکن ورکشاپ ایک بھی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ سب بیکار پڑے ہیں۔

۴۔ انہیں معاشی و جنگی امداد کے سنہری جال میں پھنسا لیا۔ تاکہ کہیں کے نہ رہیں اور امداد کی یہ صورت کہ اگر ہم کسی حملہ آور پر گولی چلا بیٹھیں تو فوراً پوچھا جاتا ہے کیوں صاحب کہیں ہماری عطا کردہ گولی تو نہیں چلا دی۔ پھر متعدد

ہیں یا اتنی کم جیسے صحرا میں شبنم۔

۵۔ اہلِ یورپ کا خوفناک ترین حربہ یہ کہ وہ ہمارے بہترین دماغوں کو، خواہ وہ چوٹی کے طلبہ ہوں۔ یا سی۔ ایس۔ پی افیسرز۔ وظائف کا لالچ دیکر یا گفت و شنید کے سلسلے میں اپنے ہاں بلا لیتے ہیں، جلسوں، کلبوں، تھیٹروں اور ناچ گھروں میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ آزاد لڑکیوں سے آزادانہ ملاتے ہیں مفت شراب پلاتے ہیں۔ جگہ جگہ سیر کراتے ہیں۔ پارٹیوں میں بلاتے ہیں، باتوں باتوں میں اہلِ مشرق پہ چوٹیں کرتے ہیں۔ موقعہ ملے تو مذہب کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ مشرقی اقدار و روایات پہ پھبتیاں کستے ہیں۔ عیاشی کو تہذیب کا رنگ دیتے ہیں۔ اپنے ملٹن اور بائرن، جارج اور ولیم، رسکن اور شا کو کچھ اتنا اچھالتے ہیں کہ مشرقی مبہوت ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے کو وہ اس شد و مد سے جاری رکھتے ہیں کہ ہمارا آدمی اپنے ملک، اپنی روایات تہذیب اور اپنے اسلاف سے متنفر اور یورپ کی ہر چیز کا گرویدہ بن جاتا ہے وہ واپس آ کر اپنی ہر چیز کو کوسنے لگتا ہے۔ توبہ توبہ میرا ملک کتنا غلیظ، کس قدر جاہل اور مفلس ہے۔ یہاں نہ کوئی نائٹ کلب ہے، نہ اچھی وہسکی، نہ گرل فرینڈز نہ تہذیب نہ ایٹی کٹ اور نہ ناچ گھر۔ ڈیم وین، کنٹری، ڈیم ویز پیپل،، اور بعض اوقات یہ کالے صاحب وہیں ولایت ہی میں آباد ہو جاتے ہیں اور شومئی قسمت سے واپس آ جائیں تو ہر چیز کو انگریزی رنگ میں رنگنے کے لیے انتہائی زور لگاتے ہیں اور یہ نیم انگریز لوگ کسی ملک کے لیے خود انگریزوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ انگریز کہتا ہے کہ، تمہارا سب سے بڑا مسئلہ خوراک یا بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ صنعت فولاد ہمارے لیے مفید ہے لیکن تمہارے لیے مضر

ب ہے۔ تم خود موٹریں نہ بناؤ، ہم تمہیں سستی دیں گے۔ مذہب عہد حجری کی یادگار ہے۔ اسے گرجوں اور مسجدوں میں بند کردو۔ زندگی کی تابناک اقدار کار۔ کوٹھی، کلب اور گرڈی (گرل) ہیں روسی ہمارے دشمن ہیں تم بھی انھیں اپنا دشمن سمجھو، اور ہم انھی باتوں کو طوطے کی طرح دہراتے رہتے ہیں۔ یہ ہے مکمل غسیل دماغی۔

**آمدم برسر مطلب**

جناب راشد کا مضمون پڑھ کر شبہ پڑتا ہے۔ کہ کہیں آپ بھی اس حادثے (غسیل دماغ) کا شکار تو نہیں ہوگئے؟ ورنہ ایک پاکستانی ادیب و عالم سے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ وہ ہمیں لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ دے۔ یہ لیجئے ان کے دلائل سنیئے۔

۱۔ ہم صدیوں سے ان پڑھ چلے آتے ہیں...... ہمارے افلاس کا باعث تعلیم کی کمی ہے...... ہمارے سامنے دو اور اسلامی ملکوں کی مثال ہے۔ جنھوں نے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ دو ملک ترکی اور انڈونیشیا ہیں۔ ترکی نے اپنے انقلاب کے بعد پہلا قدم یہ اٹھایا کہ عربی رسم الخط کو ہٹا کر لاطینی رسم الخط میں رائج کردیا۔ سو آج ترکی میں پڑھے لکھوں کا تناسب پچاس فی صد نظر آتا ہے۔ انڈونیشیا میں جب ولندیزیوں کی حکومت تھی تو ملک کی صرف نو فی صدی آبادی پڑھنا لکھنا جانتی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد انڈونیشی حکومت نے لاطینی حروف کے ذریعے تعلیم رائج کرنا شروع کردی آزادی کے بعض دس برس کے اندر اندر وہاں پڑھے لکھوں کا تناسب نو فی صدی سے بڑھ کر چھپن فی صدی تک جا پہنچا ہے۔

(صہ ۹ ۔ آہنگ)

راشد صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ تعلیم کی کمی پورا کرنے کے لیے نہ مدارس کی ضرورت ہے نہ اساتذہ کی۔ بلکہ کسی آرڈی ننس کی رُو سے رسم الخط بدل دیجئے اور فوراً ساری آبادی خود بخود تعلیم یافتہ ہو جائے گی۔ راشد صاحب نے یہ نہ بتایا کہ رُوس میں جہاں لاطینی نہیں بلکہ (CYRILLIC) رسم الخط رائج ہے۔ خواندگی کا تناسب صرف چالیس برس میں تیرہ سے نوّے فی صد کیسے ہو گیا؟ اور نہ یہ فرمایا کہ انڈونیشی حکومت نے اتنی عظیم تعداد کو اس قدر قلیل مدت میں کیسے خواندہ بنا لیا۔ کیا کوئی تعویز ہر اَنپڑھ کے گلے میں ڈال دیا تھا؟ یا بنگال سے کوئی جادوگر منگایا تھا جو جھرلو پھیرتے ہی سب خواندہ ہو گئے۔ ورنہ حکومت کے پاس اتنی رقم کہاں کہ اتنی بڑی تعداد کے لیے مدارس کھولتی۔ انڈونیشیا کی آبادی آٹھ کروڑ ہے بقول حضرت راشد اس میں نو فی صدی یعنی بہتر لاکھ آدمی تعلیم یافتہ تھے۔ دس سال میں یہ تعداد چھپن فی صد یعنی چار کروڑ اڑتالیس لاکھ ہو گئی۔ اگر ایک پرائمری سکول میں بچوں کی اوسط تعداد دو سو ہو تو ایک ہزار طلبا کے لیے پانچ، ایک لاکھ کے لیے پانچسو، ایک کروڑ کے لیے پچاس ہزار اور ساڑھے چار کروڑ طلبا کے لیے دو لاکھ اٹھتیس ہزار سکول درکار ہوں گے۔ اگر ایک سکول کی عمارت پہ پانچ ہزار روپیہ صرف ہو تو ساری رقم ایک ارب بائیس کروڑ بنے گی۔ اور ایک سکول میں پانچ استاد ہوں تو تمام اساتذہ کی تعداد بارہ لاکھ بیس ہزار ہو گی۔ اگر ایک استاد کی تنخواہ ایک سو روپیہ ماہوار ہو تو کل رقم کی ماہانہ میزان بارہ کروڑ بیس لاکھ اور سالانہ ایک ارب چھیالیس کروڑ چالیس لاکھ ہو گی۔ کیا انڈونیشی حکومت کے پاس اتنی دولت اور بارہ لاکھ استاد موجود ہیں؟ بالکل نہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جنابِ راشد نے اپنی بات کو چمکانے

کے لیے فرضی اعداد پیش کیے ہیں۔ ان کے یہ اعداد اتنے ہی صحیح ہیں جتنی اُن کی درج ذیل کہانی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اردو رسم الخط میں ایک فطری نقص یہ ہے کہ اس کا پڑھنا مشکل ہے اور تائید میں یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں۔

"میرے ایک دوست جو اردو کے مشہور ادیب بھی ہیں ایک زمانے تک بھری محفلوں میں اپنے مضامین سناتے وقت خوشخبری کو خوش بخری، فردہ کو مُشردہ اور مدوجزر کو مدن جود پڑھا کرتے تھے" اور راشد صاحب کے خیال میں "اردو کا مشہور ادیب" بھی تھا۔ اگر اس طرح کی بے سروپا ہانکنے ہی کا نام علمی استدلال ہے تو لیجیے ایسی ہی ایک کہانی۔

میرے ایک دوست جو گریجویٹ تھے (STATION) کو سٹے ٹیشن (CAUTION) کو کاٹین (FASION) کو فیسی اون اور (JUDGE) کو جُڈگی پڑھا کرتے تھے، آپ اس "مشہور ادیب" کا نام بتائیں اور میں اپنے اس دوست کو پیش کر دوں گا۔

۲۔ انگریز کو ہر زمانے میں یہ تکلیف رہی کہ مسلمان اپنے ماضی کو کیوں نہیں بھولتا؟ یہ نسل نو کو عدلِ فاروقی، فقرِ حیدری، سعد و خالد کی جہانگیری، سلیم و سنجر کی جہاں بانی۔ رومی و غزالی کے فلسفے اور جنید و بایزید کی روحانی قوت کی کہانیاں کیوں سناتا ہے۔ انھیں امامت، عدالت اور شجاعت کا درس بار بار کیوں دیتا ہے؟ ہمارے استعمار اور مشنریوں کی راہ میں کانٹے کیوں بچھاتا ہے؟ یہی تکلیف راشد صاحب کو بھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"انقلاب اور ماضی پرستی کسی طرح ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔" (ص۱۰)

مسلمانوں کے ذخائر علم دو ہی تو ہیں۔ عربی جس کی تمام کتابوں کی تعداد تین کروڑ سے متجاوز تھی اور فارسی جس میں اب تک دس لاکھ کے قریب کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان ذخائر میں لاکھوں کتابیں اب تک موجود ہیں۔ جن سے ہمیں اپنے لاتعداد فلاسفہ، صوفیا، متکلمین، منجمین، مفسرین، محدثین، نحویین، فقہاء، ظرفاء، شعراء، ادبا، ارباب منطق، مورخین۔ محاسبین، اطباء، ماہرین افلاک، سلاطین وزراء، اور دیگر طبقات معاشرہ کا پتہ چلتا ہے۔ بے شمار صحابہ، صحابیات اور انبیاء کے حالات ملتے ہیں۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے علوم و فنون اور ثقافت کی پیش رفت میں کیا کوشش کی تھی۔ ان کا فن تعمیر کیسا تھا اور مصوری و موسیقی میں کیا اضافہ کیا تھا اگر ہم ان تمام کتابوں سے آنکھیں بند کر لیں تو یہ ساری باتیں ہمیں کون بتائے گا؟ اور ان باتوں کے بغیر ہم رہ کیا جائیں گے؟ خالص بُودم بے دال۔ بہر حال راشد صاحب کا مشورہ تو یہی ہے کہ چھوڑو اس عربی فارسی کو کیپ منکہ!

"عربی اور فارسی سے ہمارے کسب فیض کرنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے" (ص۱۱)

چلو چھٹی ہوئی۔ پھر علم کے اتنے عظیم ذخائر چھوڑنے کے بعد ملے گا کیا؟ انگریزوں کے منشیوں کی لاطینی خط میں لکھی ہوئی چند کتابیں جن میں کچھ اس قسم کے جواہر پارے ہیں۔

۱۔ صاحب بہادر گھوڑا ہو کر مونتا ہے اور غسلخانے میں بہت اچھا گانا گاتا ہے۔

۲- چھوٹا صاب شام کو گھوڑے پہ سواری کرتا ہے۔

۳- میم صاحب کتے اور خانسامے دونوں سے بہت پیار کرتی ہے۔

۳- جناب راشد کو عربی رسم الخط پر کچھ اور اعتراض بھی ہیں۔

**مثلاً**

اُردو رسم الخط میں بہت زیادہ خامیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اس رسم الخط کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ انھی خامیوں کا نتیجہ ہے کہ بتدی کو اس رسم الخط پر عبور حاصل کرنے میں مہینوں بلکہ برسوں لگ جاتے ہیں۔ (ص‌ت)

مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ جسے حکومت ان پڑھ شمار کرتی ہے۔ لیکن یہ لوگ چھ سات سو صفحات کی ایک کتاب دو تین رسائل سمیت رواں دواں پڑھ لیتے ہیں۔ اس کتاب کا نام قرآن ہے اور یہ طبقہ کروڑوں افراد پر مشتمل ہے کسی گاؤں میں جائیے آپ کو ہر تین دیہاتیوں میں کم از کم ایک قرآن خوان ضرور ملے گا۔ یہ قرآن کا معجزہ نہیں اور نہ اس میں دیہاتی کا کوئی کمال ہے۔ بلکہ یہ تمام تر اعجاز رسم الخط کا ہے۔ یہ خط اس قدر سادہ، سہل اور ہمارے مزاج کے مطابق ہے۔ کہ کروڑں ان پڑھ دیہاتی جو اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے اور اردو کی ایک سطر تک نہیں پڑھ سکتے۔ سات سو صفحات کا موٹی قرآن فرفر پڑھ لیتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے لیے آپ مدارس کھولتے تو کیا اسی رسم الخط کی وساطت سے یہ اردو نہ سیکھ لیتے۔؟

۴- "اردو رسم الخط کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ہر حرف کی ایک سے زیادہ شکلیں ہیں" (ص‌۱۰)

زیادہ شکلیں ہیں تو کیا ہوا؟ ہر آدمی احباب و اقارب نیز شہروں اور دریاؤں کے ہزاروں نام یاد کرتا ہے۔ سیکڑوں گالیاں سیکھتا ہے۔ کیا اس کے لیے چند حروف کی اشکال جن میں اختلاف بہت معمولی سا ہے اور مشابہت بہت زیادہ مشکل ہے "تاج محل اور جسم کی ہیم میں بھلا کیا اشتباہ ہو سکتا ہے؟ ایک بچہ ایک دن میں نہیں تو دو دن میں سیکھ جائیگا؟ کیا اتنی سی بات کے لیے ہم اپنا رسم الخط بدل لیں اور چودہ سو برس کے حسین و جمیل ماضی سے رشتہ توڑ لیں؟

پھر عربی حروف میں اختلاف اتنا نہیں جتنا لاطینی حروف میں ہے۔ یہاں تو اتنی سی بات ہے کہ کہیں میم پورا لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ہام، دام اور کہیں اس کا دھڑ کاٹ کر اس کے سر سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً۔ مال، میل۔ مالک۔ لیکن لاطینی کے بعض چھوٹے اور بڑے حروف میں تو کوئی مابہ الاشتراک ہی نہیں۔ مثلاً

چھوٹے حروف۔ a b d e h

بڑے حروف۔ A B D E H

بایں ہمہ راشد صاحب کے ہاں یہ حروف بالکل اعلیٰ و عمدہ ہیں اور عربی حروف کا پڑھنا "جوئے شیر لانا" ہے۔

۲۔ "دوسری خرابی یہ ہے ... کہ ایک ایک آواز کے لیے ہمارے پاس دو دو تین تین علامتیں آگئی ہیں مثلاً ث۔ ص۔ س، جن سب کی آواز "س" کی ہے یا ز۔ ذ۔ ض اور ظ سب کی آواز محض ز ہے اس وجہ سے جب تک عربی اور فارسی پر اچھا خاصا عبور نہ رکھتے ہوں۔ آپ کبھی اردو کا املا درست نہیں لکھ سکتے بعض نوشت و خواند کے لیے کسی زبان کا دوسرے زبانوں کا محتاج ہو کر رہ جانا۔

اس زبان کے متعلموں کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے"۔۔۔ (صد)

مطلب یہ کہ ث، ص، س، ذ، ز، ض، ظ، ق، ک، ت، ط اور ح، ہ کا جھگڑا مٹا دیا جائے قلب (دل) کو کلب (کتا)، قد کو کدّ (جرح) قصر (محل) کو کسر (جزو) قضا (تقدیر) کو کضا (اس طرح) قید کو کید (مکر)، حائل (رکاوٹ) کو ہائل (خوفناک، ہال (بڑا کمرہ) کو حال حذر (پرہیز) کو حضر (گھر میں قیام)، حق کو حک (گھسنا) اور حل کو ہل کھو اور عیش اڑاؤ۔ اگر ہم ہجوں میں اتنی سی تبدیلی بھی نہیں کر سکتے تو پھر پاکستان بننے کا کیا فائدہ ہوا

اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ کہ اردو کا خمیر ہندی، فارسی اور عربی سے تیار ہوا ہے۔ عربی میں الفاظ کے بڑے بڑے گروہ ملتے ہیں جو ایک مادہ و ماخذ سے نکل کر اشکال بدلتے جاتے ہیں۔ لیکن ماخذ کے اصلی حروف و مفہوم سے کہیں جدا نہیں ہوتے۔ مثلاً

۱۔ سلم کے لغوی معنی ہیں بچنا۔ محفوظ رہنا۔ اس سے بیسیوں الفاظ تیار ہوتے ہیں۔ مثلاً سلام۔ استسلام، اسلام۔ سِلم (صلح و امن) سَلَم (قید) سُلّم (سیڑھی سلام (ایک کڑوا درخت) سلامت، سُلامی (چھوٹی ہڈی) سلیم سالم وغیرہ ان تمام حروف میں دو باتیں لزوماً پائی جاتی ہیں اوّل مادہ یا ماخذ کے تین حروف یعنی س ل م اور حفاظت و سلامت کا مفہوم ۔۔۔۔۔!

۲۔ ذل (ذِلّت) سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔ ذِلّت۔ ذلیل (مت بھولئے کہ ظلیل (مادہ ظل۔ سایہ) کا تلفظ بھی یہی ہے۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ذلیل کے معنی ہیں گھٹیا۔ بے عزت، اور ظلیل کا مفہوم ہے سایہ دار) ذلالت اذلّہ (ذلیل کی جمع)

ذلال، مذلل ۔ تذلّل، ذُلل ۔ مُذِلّ وغیرہ ان تمام حروف میں ذل بھی موجود ہے ۔ اور ذلت کا مفہوم بھی ______

۲۔ طلب ۔ کے معنی تلاش ہیں اور یہ مفہوم اس کے تمام مشتقات مثلاً طالب، مطلوب مطلب، طلبہ، طُلّاب، طِلبۃ (مطالبہ) میں لازماً ملے گا۔ اگر ہم طلب کو تلب لکھ دیں تو یہ لفظ اپنی اصل نیز ساری برادری سے کٹ کر بے معنی ہو جائے گا۔ یا یوں کہیے کہ بے اصل ہو کر رہ جائے گا ۔ جناب راشد صاحب کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ غلط لکھ کر ساری زبان کو بد اصل اور بے پدر بنا دو۔ تاکہ ہمارے نازک مزاج بچے من، ملاوٹ، ط گے استباد سے محفوظ رہیں ۔ دیکھا آپ نے اتنی مہیب تخریب کا مقصد بھی ماشاءاللہ کتنا عظیم ہے ۔ بھائی صاحب جن بچوں کو آپ ۔ ت ۔ ط کی امتیاز کی بھی تکلیف نہیں دینا چاہتے کہ کہیں ذہن لطیف کی کوئی چول ڈھیلی نہ ہو جائے ۔ انھیں آپ کس مصرف میں لانا چاہتے ہیں ۔ ان نسیم زادوں سے قوم کو کیا توقع ہو سکتی ہے ۔ ؟

ایک اور اعتراض یہ کیا ہے کہ اردو میں فارسی و عربی کے الفاظ بہت زیادہ ہیں ۔ اور ہماری زبان ان کی محتاج ہے ۔ اس کی مزید تشریح یوں فرماتے ہیں ۔

"کسی خارجی زبان کے ساتھ ہمارا اس حد تک وابستہ رہنا کہ ہم اس کے بغیر اظہار خیال کے قابل نہ رہیں ایک ایسی غلامی ہے جس سے جس قدر جلد نجات مل جائے ہمارے حق میں مفید ہے ۔ (صـــ)

اردو میں چالیس فی صد انگریزی الفاظ بھی موجود ہیں ۔ لیکن راشد صاحب نے صرف عربی و فارسی الفاظ پہ اعتراض کیا ہے ۔ کیوں ؟ محض اس لیے کہ انگریز کو انھی دو زبانوں سے چڑ ہے اور راشد صاحب کے تمام فلسفہ و فکر کا ماخذ فرنگ ہے

پھر ہنم یہ کہ فارسی و عربی کو خارجی زبانیں کہہ دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اُردو بذاتہٖ کوئی زبان نہیں، وہ چند عربی و فارسی، انگریزی، ترکی اور ہندی الفاظ کا مجموعہ ہے اور بس۔ اگر اردو سے خارجی الفاظ نکال دیئے جائیں تو یہ زبان وہیں ختم ہو جائے گی۔ اگر کسی عمارت سے اینٹیں اور بالے کھینچ لیے جائیں، تو وہ کیسے قائم رہ سکتی ہے۔

پھر یہ بھی فرماتے جائیے کہ فارسی و عربی خارجی زبانیں کیسے ہو گئیں۔ کیا یہ ہمارے اسلاف کی زبانیں نہیں تھیں۔ کیا ہمارے اسلاف جن کی اولاد آپ اور ہم ہیں غیر ملکی تھے، کیا اللّٰہ سے بھی بڑا کوئی اور رشتہ مودّت و اخوت موجود ہے۔ تو پھر ایران و عرب کا مسلمان ہمارے لیے خارجی کیسے ہو گیا؟

یہ بھی فرمائیے کہ دنیا میں کوئی ایسی زبان ہے جس میں ہزاروں الفاظ دیگر زبانوں کے نہ ہوں۔ کیا انگریزی میں فرانسیسی، لاطینی، یونانی، جرمنی اور عربی کے لاکھوں الفاظ موجود نہیں؟ تو پھر آپ انگریزوں کو خارجی زبانوں کی غلامی سے بچنے کا مشورہ کیوں نہیں دیتے؟ یہ واکھیان صرف ہمیں کیوں دیا جا رہا ہے؟ عربی و فارسی کو خارجی زبان قرار دینے کا فلسفہ فرنگی کی ابلیسی سیاست کی ایجاد ہے اور ہمیں صدمہ ہوتا ہے۔ جب کوئی پاکستانی دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کا آلۂ کار بن کر ہمیں اس قسم کے وعظ سناتا ہے۔

۵۔ رومن رسم الخط کے بدلنے سے قوم کئی تباہیوں کا شکار ہو گی۔

مثلاً:۔

- (الف) ہم عربی کی تین کروڑ، فارسی کی دس لاکھ اور اُردو کی چھ لاکھ کتابوں در پنجابی کی کافیوں اور گیتوں سے قطعاً محروم ہو جائیں گے۔

(ب) ہمارا علم یک طرفہ ہو جائے گا یعنی عربی خط کے تمام ذخائر علوم سے محروم ہونے کے بعد۔ لازماً ہم یورپی ادب کا رُخ کریں گے اور ذہناً فرنگی ہو کر رہ جائیں گے اس کے بعد ہم ملکہ آزاد ہوں لیکن ذہناً و عملاً فرنگ، ادبِ فرنگ اور تہذیبِ فرنگ کے پرستار بن جائیں گے۔

(ج) دانا عیسائی یہ کہتے ہیں کہ اگر عرب میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا نہ ہوتے تو آج یورپ، افریقہ، امریکہ، ایشیائے صغیر، مشرقِ وسطیٰ، ہند اور جزائر شرق الہند کا مذہب عیسائیت ہوتا۔ عیسائیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلامی ذہنیت اور اسلامی فلسفہ ہے۔ اگر یہ عربی رسم الخط ختم ہو جائے۔ تو اسلامی فلسفہ و ذہنیت کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا اور اس طرح عیسائیت کا راستہ ہموار ہو جائیگا۔

(د) فرنگی استعمار کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی اسلامی ذہنیت ہے ہم ہزار برخوردار و تابعدار سہی۔ لیکن گاہے گاہے ہم میں کوئی۔ ناصر۔ رضاہ شاہ، قائد اعظم اقبال۔ جمال الدین افغانی۔ سعد زاغلول۔ اور اتاترک پیدا ہو کر ایشیا کے ان مزدوروں اور مزارعوں کو اپنے فرنگی لینڈ لارڈز کے خلاف مشتعل کر ہی دیتا ہے۔ اس مرض کا پورا استیصال اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ ان کا خط چھین لو اور اس کے بعد انشاء اللہ یہ یوں قابو میں آئیں گے کہ کان تک نہیں ہلائیں گے۔

(ہ) زبان بگڑ جائے گی۔ حک اور حق۔ قلب اور کلب میں کوئی تمیز نہیں رہے گی

(و) ایران و عرب سے تمام تہذیبی و ثقافتی روابط ختم ہو جائیں گے۔ ان کے تمام علوم و فنون اور ادبی تخلیقات ہمارے لیے اجنبی بن جائیں گی۔

(ز) اور سب سے بڑا ستم یہ کہ جب عربی خط کو جاننے والے آئندہ بیس تیس

برس تک ختم ہو جائیں گے۔ تو پھر سارے ملک میں قرآن پڑھنے کوئی نہیں رہے گا
اگر یقین نہ آئے تو ترکی میں جا کر دیکھئے۔ وہاں لاطینی رسم الخط ۱۹۲۸ء میں رائج ہوا
تھا۔ گذشتہ ۳۶ برس میں عربی خط جاننے والے فوت ہو چکے ہیں۔ آج قرآن عظیم کو لے
کر ترکی کی سلطنت میں گھومئے۔ شاید ہی کوئی بتا سکے کہ یہ قرآن ہے۔ جب قرآن کی
عبارت تک پڑھنے والے نہ رہے تو سمجھنے اور سمجھانے والے کہاں سے آئیں گے
آج ترکی میں مسلمان تو ہیں لیکن قرآن اور تعلیماتِ قرآن سے ناآشنا، اسوۂ رسول سے
بے خبر، روایاتِ اسلام سے ناواقف، اسلامی فلاسفہ اور مفکرین کے افکار و تخلیقات
سے لاعلم۔ گزشتہ ۳۶ برس میں ترکی نے کوئی مفسر، محدث، مورخ، مفکر، عطار
اور رومی پیدا نہیں کیا۔ وہ زمین کیوں عقیم ہو گئی؟ محض اس لیے کہ علم و دانش کے
تمام مآخذ و منابع سے اس کا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اتاترک میدان جنگ میں تو جیت
گیا تھا۔ لیکن علم و فکر اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں انگریز سے وہ شکست کھا گیا
کہ اب اس کی قوم شاید ہی کبھی سنبھل سکے۔

جناب راشد کو اس خطرے کا احساس ہے کہ لاطینی خط کے نفاذ کے بعد
مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو جائے گا اور اس کا علاج یوں تجویز فرماتے ہیں۔

"ایک اور اعتراض یہ ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کے بعد لوگ قرآنِ حکیم کا مطالعہ
نہیں کر سکیں گے۔ مگر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے۔ کہ جس ملک میں صرف سولہ
فی صدی آبادی پڑھے لکھوں کی ہو۔ وہاں کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ لوگ اپنے
مذہب اور اخلاق یا مذہبی فلسفے سے پورے طور پر واقف ہوں گے۔ ان کا مذہبی
علم زیادہ تر سماعی ہی رہ سکتا ہے۔ یا وہ اُن نہایت بے پرواہی سے چھپے ہوئے

کتابچوں پر انحصار کر سکتے ہیں۔ جن میں اکثر باتیں مسخ ہو کر پیش کی جاتی ہیں (صفحہ)

سمجھے آپ کہ راشد صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔؟ پہلی بات یہ کہی ہے کہ پاکستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد صرف سولہ فی صد ہے۔ یعنی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ۔ ان سے توقع ہی نہیں ہو سکتی۔ کہ فلسفۂ مذہب و اخلاق کو سمجھیں۔ ان کے خیال میں فلسفۂ اخلاق کوئی ایسی چیز ہے جسے ایک ارسطو، ایک سقراط، ایک غزالی، ایک سعدی، ایک گوئٹے، ایک ڈانٹے، ایک عیسےٰ، ایک موسیٰ، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اسی کام کے لیے ستّر اسّی کروڑ فلاسفر و انبیاء کی پوری فوج ہونی چاہیئے۔ اور دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ عوام کا علم سماعی تو ہے آج اپنے علماء سے سن کر عمل کرتے ہیں۔ کل اگر یہاں ایسے علماء نہ رہے تو افغانستان یا ایران سے جا کر سن آئیں گے۔ تیسرا ارشاد یہ ہوا ہے کہ آج کل آپ مذہب کا درس ایسے کتابچوں سے لیتے ہیں۔ جن کی طباعت خراب اور مضامین مسخ شدہ ہیں۔ یعنی آپ فلسفہ، اخلاق، مذہب سے تو پہلے ہی جاہل ہیں۔ کل اگر قرآن کا علم پاکستان سے اٹھ گیا تو کیا فرق پڑے گا۔؟

دراصل راشد صاحب جو بات کہنا چاہتے ہیں اور ہم جیسے جہلاء کے ڈر سے زبان پہ نہیں لا سکتے۔ وہ یہ ہے کہ مذہب عہدِ وحشت کی یادگار ہے۔ یہ نماز، یہ روزے یہ درسِ حیا و شرافت، یہ تعلیمِ تقویٰ و طہارت اور یہ قرآن و تورات عصرِ حاضر کے پُر کیف و رنگین تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لیے چھوڑو ان دقیانوسی باتوں کو۔ زندگی صرف چند روزہ ہے جی کھول کر عیش اڑاؤ۔ کھاؤ پیو۔ ناچو گاؤ اور جب موت آئے تو مر جاؤ۔

یوں راشد صاحب ہمارے مذہبی جذبات سے اتنے بے پرواہ ہیں ہماری دلداری کے لیے فرماتے ہیں :-

" قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرنے کے لیے یقیناً ہمیں عربی اپنے رسم الخط کے ساتھ پڑھنی ہوگی۔ (صـــ)

نہایت نیک خیال ہے لیکن پڑھائے گا کون؟ تمام درسگاہوں میں تو لاطینی حروف ہوں گے۔ یہ عربی حروف پڑھانے والے کہاں سے آئیں گے؟ بیس تیس برس میں قرآن و مذہب کا غلغلہ ہی ختم ہو جائیگا۔ نسلِ نو ایک مُردہ علم کے لیے اتنی تکلیف کیوں کرنے لگی۔

" خط بدلنے سے ہم لازماً اسلاف کی علمی میراث سے محروم ہو جائیں گے اور ہم اپنے عظیم و جلیل ماضی سے کٹ جائیں گے راشد صاحب اس کا علاج یوں تجویز فرماتے ہیں۔

" رسم الخط کی تبدیلی کے خلاف ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ اس سے ہمارا قدیم سرمایۂ ادب فنا ہو جائے گا۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہمارا سرمایۂ ادب اس قدر کم ہے کہ اسے نئے رسم الخط میں منتقل کرنا ایک آزاد قوم کے لیے مشکل نہ ہوگا۔ (صـــ)

ہمارا سرمایہ ادب اس قدر کم ہے؟ کم کیسے ہے حضور؟ کیا چھ لاکھ کتابیں کم ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں لاہور کے چند باہمت لوگوں نے یونیورسٹی ہال میں کتابوں کی ایک نمائش ترتیب دی تھی جس میں صرف ایسی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ جو لاہور کے کتب فروشوں سے مل سکتی تھیں۔ ان کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ اُردو کا موجودہ ادب پورے پانچسو سال کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد

خیر آباد، کلکتہ، حیدر آباد دکن اور لاہور کے ہزار ہا اہلِ قلم کے علاوہ ترقی اردو اور ندوۃ المصنفین جیسی سینکڑوں مجالس نے حصّہ لیا۔ ہمارے ہاں شعر کے ہزار ہا مجموعے، درجنوں تفسیریں، تاریخ، سیرت، ادب، تنقید، افسانہ، ناول، ڈرامہ، مذہب، اخلاق، تصوّف، قانون، میراث، حدیث، عروض، علم المعانی، طب، فلسفہ، سائنس، ہیئت، حساب، جغرافیہ، شہریت، معاشیات اور دیگر علوم پہ لاکھوں کتابیں موجود ہیں۔ انھیں لاطینی خط میں کون منتقل کرے گا؟ اگر آپ نے اپنے ادیبوں کو اس بیہودہ کام پر لگا دیا تو نئی تخلیق کیسے ہوگی؟ پھر اس جاتی خط میں لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھے گا کون؟ ایک لاکھ اُردو کے صفحات لاطینی خط کے پانچ لاکھ صفحات میں سمائیں گے اتنا کاغذ کہاں سے آئے گا؟ اور اتنی فربہ کتابوں کو خریدے گا کون؟ پھر یہ فیصلہ کون کرے گا کہ "Ghar" "گھر" ہے یا غار" "Alam" "عالم" ہے یا عالم، یا اَلَم، یا اَلَم یا "اعلام" "Hakim" "حکیم" یا "حاکم" "Zalil" "ذلیل" ہے یا "ظلیل" (سایہ دار) وقِس علیٰ ہذا۔

یہ بھی خوب کہی کہ یہ آزاد قوم اپنے ذخیرۂ ادب کو اُردو میں جلد منتقل کرلے گی۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں اندازاً دو سو کالج اور کئی ہزار سکول ہیں۔ پروفیسروں کی تعداد چھ ہزار اور ٹیچرز کی تعداد ساٹھ ہزار سے کم نہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان چھیاسٹھ ہزار اساتذہ نے گزشتہ بیس تیس برس میں کتنا ادب پیدا کیا؟ یونیورسٹیوں کے چند ایک اساتذہ اور ایک آدھ پروفیسر مستثنیٰ۔ باقی کسی نے ایک نغمہ تک دوہرا نہیں کیا۔ اور ایک مقالہ تک نہیں لکھا۔ سال میں کالج ایک سو اسّی دن اور اور سکول ایک سو پچاس دن بند رہتے ہیں۔ حساب یوں بنتا ہے۔

۱- سال میں ایک پروفیسر ۱۸۰ یوم فارغ رہتا ہے۔

۲- تو گویا چھ ہزار پروفیسر سال میں دس لاکھ اسی ہزار دن فارغ رہے۔

بیس برس میں ان پروفیسروں کو دو کروڑ سولہ لاکھ فارغ ایام نصیب ہوئے اور انھوں نے ایک سطر تک نہ لکھی۔ کیا انہی لوگوں سے آپ یہ امید رکھ سکتے ہیں کہ یہ اردو کی چھ لاکھ کتابوں کو لاطینی خط میں منتقل کر دیں گے۔ بفکر معاش سے مقابلتہً آزاد طبقہ تو یہی ہے۔ اگر اس کی حالت یہ ہے تو کام کون کرے؟ اخبار نویس؟ ادیب؟ یہ ہیں کتنے؟ جو ہیں وہ کوئی نئی چیز لکھیں گے یا پرانی کتابوں کی لاطینی بناتے پھریں گے؟

اس سلسلے میں راشد صاحب نے تاریخ حاضرہ میں سے ایک مثال بھی پیش کی ہے فرماتے ہیں۔

"ترکی کے سرمایۂ ادب سے ہمارا سرمایہ ادب ہر لحاظ سے کم ہے۔ اگر ترکی کو اس بنا پر نقصان نہیں پہنچا تو ہمیں کیونکر پہنچ سکتا ہے" (صفحہ)

اگر ترکی کا سرمایۂ ادب ہم سے زیادہ ہے تو اندازاً آٹھ لاکھ کتابیں ہوں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پچھلے تینتیس برس میں پچاس فی صد پڑھے لکھے ترکوں نے لاطینی میں کتنی منتقل کی ہیں۔ "۲۰ / مارچ ۱۹۶۱ء کے پاکستان ٹائمز" میں "رسم الخط" پر پرنسپل حمید احمد خاں اسلامیہ کالج لاہور کا ایک نہایت فاضلانہ مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ دیگر باتوں کے علاوہ فرماتے ہیں کہ چند ماہ پہلے میں ترکی گیا اور خط کے مسئلہ پر وہاں بات چیت ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ ترکوں نے پچھلی تہائی فی صدی میں اپنے ادب کی صرف دو سو کتابیں لاطینی خط میں منتقل کی ہیں۔ آٹھ لاکھ میں

سے صرف دو سو اور بایں ہمہ جناب راشد صاحب کا خیال ہے "کہ ترکی کو اِس بنا پر نقصان نہیں پہنچا"۔ بھائی اِن سے شاید بلوچی، مہمندی، اور وزیری قبائل کا ادب زیادہ ہوگا۔ وہ بھی کیا قوم ہے جس کا ادب صرف دو سو کتب پر مشتمل ہو۔ چھ سو برس کی ایک پرانی قوم اور ادب صرف چند سو صفحات۔ جو قوم بھی انگریزی کا مشورہ قبول کرے گی۔ اِس کا بھی حشر ہوگا۔

حکیم مشرق نے ضربِ کلیم میں "نصیحت" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز نظم شامل کی ہے۔ ایک فرنگی اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ فتح صرف تلوار ہی سے نہیں ہوتی اس کے طریقے اور بھی ہیں۔ جنہیں رازِ ملوکیت سمجھ کر نہاں رکھو۔

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر — کرتے نہیں محکوم تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا اک ڈھیر

اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ فرنگی لیبارٹری میں لاطینی خط سے زیادہ تند کوئی اور تیزاب موجود نہیں۔

۷۔ ہمارے بعض محققین دکن، لکھنؤ، دہلی، اور مدراس وغیرہ کے قدیم مصنفین پر تحقیق کر رہے ہیں اور آئے دن کوئی کتاب نکل آتی ہے۔ یہ سلسلہ لاطینی رسم الخط کے بعد بھی جاری رہنا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو خط کو پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے۔ اِس مشکل کا حل حضرات راشد یوں بتاتے ہیں:۔

جن لوگوں کو دیوان ناسخ پر تحقیق و تفتیش کرنا ہوگی۔ انھیں رسم الخط سیکھنے سے کوئی

چیز نہیں روک سکتی" (ص۱۱)

تو گویا صاحبِ مضمون تسلیم فرماتے ہیں کہ قرآن اور اُردو ادب کی خاطر عربی خط ضروری ہے تو پھر یہ لاطینی خط کس مرض کی دوا ہے۔؟ محض انگریز کی خوشنودئ مزاج؟ یا دین و دنیا کا کوئی اور فائدہ بھی ہے؟ "... نہیں روک سکتی" یہ کیا ہے۔ واقعہ نگاری ہے؟ پیشگوئی ہے؟ یا دھمکی؟

اپنے دعوٰی کی تائید میں آپ نے ایک مقدس دلیل بھی پیش کی ہے۔ یعنی۔

"شاید آپ کو معلوم ہو کہ خود قرآنِ حکیم کے رسم الخط میں دو تین مرتبہ ردّ و بدل ہو چکا ہے۔ کیونکہ خدا کا کلام کسی مخصوص رسم الخط کے ساتھ نازل نہیں ہوا تھا" (ص۱۱)

"شاید آپ کو معلوم ہو" بھائی صاحب! ہم اپنی جہالت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور صاف صاف کہتے ہیں کہ دو تین مرتبہ تبدیلی کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ ہو سکے تو اس کی وضاحت کیجئے اور فرمایئے کہ حضور صلعم نے قرآن کا جو نسخہ خود تیار کرایا تھا۔ وہ کس خط میں تھا؟ رومی تھا یا یونانی، چینی تھا یا ہندی؟ اور یہ دو تین تبدیلیاں کب ہوئیں؟ کس نے کیں؟ اور اِن کی نوعیت کیا تھی نیز آپ کا یہ ارشاد بھی وضاحت طلب ہے کہ قرآن کسی مخصوص رسم الخط کے ساتھ نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن اُن الفاظ کا نام ہے جو جبریل امینؑ نے حضورِ پُر نور صلعم کے قلبِ مبارک پر نازل کیے تھے خط و کتابت کا مرحلہ تو بعد از نزول پیش آیا تھا اور یہ ایک ٹھوس تاریخی حقیقت ہے کہ حضور صلعم ہر آیت نازل ہونے کے معاً بعد لکھوا دیتے تھے اور اسی مخصوص عربی خط میں لکھواتے تھے جو اس وقت رائج تھا۔ تو پھر آپ کے اس جملے کہ "خدا کا کلام کسی مخصوص رسم الخط کے ساتھ نازل نہیں ہوا تھا" کا یہاں موقعہ اور مقام کیا ہے؟ اور آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

۸۔ آخری دلیل یہ دی ہے۔

رسم الخط بدل لینے سے ایک اور ضمنی فائدہ یہ ہوگا کہ غیر ملکی لوگوں کو ہماری زبان سیکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔" (ص۳۱)

احساسِ کمتری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ یعنی ہم دس کروڑ پاکستانی اپنی علمی میراث صرف اِس "مقصدِ عظیم" کے لیے کالے کنوئیں میں پھینک دیں کہ شاید کل پرسوں یا سو سال بعد کوئی صاحب بہادر ہماری زبان سیکھنے کا ارادہ فرمائیں تو انھیں تکلیف نہ ہو۔ آپ اِسی قِسم کا مشورہ پانچ کروڑ انگریزوں کو کیوں نہیں دیتے۔ کہ وہ لاطینی کی جگہ اُردو خط اختیار کرلیں۔ تاکہ ہم دس کروڑ پاکستانیوں کو انگریزی سیکھنے میں آسانی ہو۔

ہر قوم کو چند چیزیں بڑی عزیز ہوتی ہیں۔ ان میں زبان اور اس کا رسم الخط بھی شامل ہے۔ جو شخص ہمیں ان سے دُور بھاگنے کا مشورہ دیتا ہے وہ ہمارے قومی جذبات کو ٹھیس لگاتا ہے۔ میری اِس تحریر میں کہیں کہیں تلخی ہے اور اِس کی وجہ یہی ہے کہ حضرت راشد کے ان مشوروں سے میرا قومی غرور مجروح ہوا اور میرے قلم سے فریادیں نکلنے لگیں۔

آپ کا آخری جُملہ یہ ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد ہماری زبان اور ادب کی نہضت کا ایک نیا دَور شروع ہو جائے گا اور علوم و فنون کی تحصیل کے نئے راستے کھل جائیں گے۔ جن سے ہماری تہذیب نئے سرے سے مالا مال ہو جائے گی۔ (ص۳۲)

یہ جُملہ یوں ہونا چاہیے۔

"مجھے یقین ہے کہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد ہماری زبان اور ادب

رسوائی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا اور علوم وفنون کی تباہی کے نئے راستے کھل جائیں گے۔ جن سے ہماری تہذیب نئے سرے سے پائمال ہو جائے گی۔

ہلاکو خان نے ہم پر سب سے بڑا ستم یہ توڑا تھا کہ ہماری لاکھوں کتابیں اٹھا کر دریائے دجلہ میں پھینک دی تھیں۔ اِس لاطینی تجویز کا ماحصل بھی یہی ہے کہ اپنی چھ لاکھ کتابیں چناب وجہلم کی لہروں کے حوالے کردو۔ ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

# امریکہ میں حرام کاری

# مقامِ عبرت

قبل اس کے میں آپ کو امریکہ کے مشہور جریدہ "ٹائم" مورخہ ۲۲/جنوری ۱۹۷۳ء کے صفحات ۴۸ - ۴۹ سے چند اقتباسات سناؤں، ایک دو تمہیدی گذارشات سُن لیں:-

**شراب کے نتائج**

حضرت آدمؑ سے محمد عربی صلعم تک تمام انبیاءؑ نے شراب کو حرام و نجس قرار دیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھیں اوّل شراب جذبۂ جنسیّت کو ابھارتی اور بے لگام بناتی ہے۔ ہر شرابی مست ہونے کے بعد ایک لڑکی مانگتا ہے اور اِس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ اس کے دوست کی بہن ہو یا بیٹی نہ ملے تو کنجروں کے پاس جاتا ہے وہاں سب کچھ لٹا کر اور مختلف بیماریاں لے کر واپس آتا ہے۔

۲۔ اِس کی بے راہ روی پر گھر میں ہمیشہ جنگ رہتی ہے ماں، بیوی بہنیں سب احتجاج کرتی ہیں۔ لیکن گناہ میں بڑی لذّت ہوتی ہے اِس لیے رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ شرابی کی اولاد بھی شرابی اور اوباش ہوتی ہے۔ والد اولاد کے لیے رہبر، امام اور نمونہ ہوتا ہے اور اولاد لازماً اس کے نقشِ قدم پر چلتی ہے

۴۔ شرابی کی ہمیشہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی شرابی بنائے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ خدا رسول نے شراب کو حرام قرار دیا ہے تو وہ خدا و رسول کی توہین کرتا، علما کو صلواتیں سناتا اور مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔

۵۔ ہر شرابی کا انجام نہایت خوفناک ہوتا ہے وہ یا تو ذیابیطس کا شکار ہوتا ہے یا ضعفِ دل اور یا کوڑھ کا جسے انگریزی میں ایگزیمہ کہتے ہیں۔

۶۔ شرابی جج ہو یا جرنیل، سماج میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ظاہراً لوگ اس کی ہزار خوشامد کریں۔ دل میں اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اسے خدا اور رسول کا باغی، سماج کا دشمن اور طبقہ نسواں کی عصمت و احترام کا رہزن سمجھتے ہیں۔ جو شخص قرآن عظیم کی ہدایت کو توڑتا، خواتین کی عصمت لوٹتا اور ملک میں بے حیائی۔۔۔ بے غیرتی اور اوباشی پھیلاتا ہے اس کی عزت کون کرے۔ اسلامی حکومت میں ایسے افراد جیلوں میں رکھے جاتے ہیں تاکہ معاشرہ ان کے اثراتِ بد سے محفوظ رہے۔

۷۔ کسی ملک کا دفاع وہی لوگ کر سکتے ہیں۔

(۱) جنھیں اپنی خواتین کی عصمت عزیز ہو اور انھیں خطرہ ہو کہ حملہ آور ان کی بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو لوٹ لیں گے۔

(۲) جنھیں اپنی روایات، تہذیب اور اقدار سے محبت ہو

(۳) جن کی موت و حیات صرف اللہ کے لیے ہو جن لوگوں میں یہ صفات نہ رہیں وہ ملک کیلئے لڑ ہی نہیں سکتے۔ ان کی خواتین کو چنگیز استعمال کرے۔ یا چمن سنگھ کوئی فرق نہیں پڑتا یہی وجہ ہے کہ اوباشوں، شرابیوں اور بے غیرتوں کو ہر میدان میں پیٹا گیا تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اگر یقین نہ

آئے تو ٹی بازار اور لاسٹ ہیلی رام کے بھڑوؤں، دلالوں اور وہاں جانے والے شرابیوں اور بدکاروں کی ایک فوج بنا لیجئے۔ انھیں کسی محاذ پر بھیجئے اور نتیجہ دیکھئے آدھے راہ میں مر جائیں گے اور باقی دشمن کے پاؤں پہ گر پڑیں گے، ایک فوج اس وقت تک لڑ سکتی ہے جب تک کہ عوام کا مورال بلند رہے۔ جس قوم میں لیڈر عیاش ہو جائیں وہاں قرائی چھڑتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو کسی دوسرے ملک میں بھاگ جاتے ہیں اور یا آزادی سے دستبردار ہو کر گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

گذشتہ چودہ صدیوں میں ہم سے ایک سو انیس مرتبہ آزادی سلب ہوئی۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ہلاکو خان نے بغداد میں داخل ہو کر سات دن میں اٹھارہ لاکھ افراد قتل کئے تھے۔ فرڈینان نے سپین میں چالیس لاکھ مسلمانوں کو شمشیر و آتش کے حوالے کیا تھا۔ انگریزوں نے واجد علی شاہ کے حرم میں داخل ہو کر شہزادیوں کے کپڑے اتار لیے تھے اور مغل شہزادوں کو سر بازار گولی مار دی تھی۔ یہ تھا نتیجہ۔ بادہ نوشی عیش کوشی بے غیرتی اور اپنی اقدار سے بغاوت کا۔

**آثارِ ہلاکت** پاکستان کی عمر ابھی صرف سترہ برس ہے لیکن ہمارے شرابیوں نے بربادی و ہلاکت کے تمام سامان فراہم کر رکھے ہیں۔ ہر کلب اور فوج کا ہر میس شراب خانہ بن چکا ہے۔ ترکِ عبادت کی وجہ سے روحانی قوت کے ذخائر ختم ہو گئے ہیں کراچی اور لاہور میں لاتعداد نائٹ کلب کھل گئے ہیں۔ یہ بیماری نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ کراچی میں نوخیز لڑکیاں کپڑے اتار کر ناچتی ہیں۔

اگر قرآن واقعی اللہ کا کلام ہے۔ اگر تاریخ کا فیصلہ درست ہے۔ اگر محمد عربی صلعم حقیقتاً اللہ کے رسول تھے۔ تو یاد رکھو کہ تمہاری اس بدمستی کی سزا اتنی شدید ہے

کہ وقت ملنے پر تم چیخو گے، زمین پر ناک رگڑو گے، لیکن کوئی نہیں سنے گا۔

## فالتو دولت کی تباہ کاریاں

فالتو دولت شرفا کے پاس آ جائے تو گنگا رام کی طرح شفاخانے بناتے ہیں، دیال سنگھ کی طرح کالج کھولتے ہیں غریب طلبا کو وظائف دیتے ہیں اور یتامیٰ کو پالتے ہیں۔ یہی چیز کم ظرفوں، خود پرستوں، ہوس کاروں اور مفاداتِ ملت سے بے خبر اوباشوں کے ہاں پہنچ جائے تو خرمستی، بدکاری و عصمت دری پہ اتر آتے ہیں چونکہ اس طبقے کی بدمستی مفادِ ملت کے لیے از حد ضرر رساں ہے۔ اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو لگام دے، شراب کی درآمد اور ناچ گھروں کو بند کرے اگر یہ لوگ پھر بھی نہ رکیں تو اللہ کے ارشاد ــــ قُلِ الْعَفْوَ (فالتو دولت اللہ کے حوالے کر دو) کے مطابق ان سے فالتو دولت چھین لے

## امریکہ کا اوباش معاشرہ

امریکہ میں دولت کی بڑی فراوانی ہے اور خدا ہے نہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ لوگ حرام کاری، چوری اور بدمعاشی کی راہ میں اتنے دور نکل گئے ہیں کہ ان کے مفکرین لرز اٹھتے ہیں۔ جس ملک میں ہر روز ساڑھے پانچسو خودکشیاں، ایک منٹ میں چھ ڈکیتیاں اور زنا بالجبر ہوتے ہوں وہاں کے اہلِ نظر کو کیوں فکر لاحق نہ ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ امریکہ والے کچھ کریں اس صورتِ حال کا علاج نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ

۱۔ وہاں مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

۲۔ وہاں کے چرچ اور حکومت دونوں نے شراب اور زنا کی کھلی چھٹی دیدی ہے۔

۳۔ وہاں کے اہلِ قلم حرام کاری کو فلسفۂ حیات بنا کر پیش کر رہے ہیں اور اسے صحت مند معاشرہ کی علامت سمجھتے ہیں۔

۴۔ چونکہ والدین، اساتذہ، لیڈر اور مصنف سب کے سب شراب و گناہ میں ڈوب چکے ہیں اس لیے نئی نسل کے سنبھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ خدا ہمیشہ مصیبت میں یاد آتا ہے اور امریکیوں پر پچھلے تین سو برس میں کوئی افتاد پڑی نہیں اس لیے وہ جہنم کی راہوں پر چلے جا رہے ہیں۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ اللہ نے روس کو ایٹم بم صرف امریکہ کی خاطر دیا ہے۔ جس روز اس کی بھٹیوں میں آگ بھڑکے گی ان کے سر بفلک محل پیوند زمین ہوں گے اور ان کی لاشیں گدھوں اور کتوں کی غذا بنیں گی تو انہیں فوراً خدا یاد آجائے گا۔

## امریکہ کی کہانی امریکہ کی زبانی

امریکہ میں معاشرے کا بگاڑ کس حد تک پہنچ چکا ہے "ٹائم" کی زبانی سنیئے۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ بعض تفاصیل کا خلاصہ ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

فرائیڈ کے ایک شاگرد، ڈاکٹر ولہم رائش نے ایک صندوق ایجاد کیا تھا۔ اور اس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس میں بیٹھنے سے جسم کو تہذیب جدید کے تمام امراض (آتشک، سوزاک اور نامردی وغیرہ) سے نجات مل جاتی ہے اور قوتِ مردی میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے ۱۹۵۲ء میں یو۔ ایس۔ اے کی حکومت نے اس صندوق کی فروخت بند کر دی اور ڈاکٹر رائش کو جیل میں ڈال دیا۔ اس صندوق کا نام (آرگون باکس) تھا۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ آج سارا امریکہ آرگون بوکس بن چکا ہے جہاں بڑے بڑے پوسٹرز، فلمیں، رسائل، اخبارات جذبۂ حیوانیت کو بھڑکا رہے ہیں، اہل قلم عریاں افسانے اور ناول لکھ رہے ہیں۔ اور بالغ، جوان اور بوڑھے سب کے سب قیودِ مذہب سے آزاد ہو چکے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں جنسی آزادی کو گناہ سمجھا جاتا تھا

لیکن آج یہ آزادی ہمارے ادب اور زندگی کا جزو بن چکی ہے ۱۹۲۰ء میں جنسی باغیوں کے والدین قدیم روایات کے دلدادہ اور احترام نسواں کے قائل تھے لیکن ۱۹۶۰ء کے جنسی باغیوں کے والدین ویسے نہیں۔ نتیجہ یہ کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں آج ہمارے پادری اساتذہ اور رہنما نوجوان کو نہیں روکتے۔ اگر روکتے بھی ہیں تو نیم دلی سے جن عُریاں کتابوں کو آج سے تیس برس پہلے ضبط کر لیا گیا تھا آج ہر جگہ فروخت ہو رہی ہیں اور تازہ عریاں لٹریچر کے مقابلے میں فلسفیانہ معلوم ہوتی ہیں کچھ ایسے اہلِ قلم بھی ہیں مثلاً ہنری مِلر اور ولیم بروہ جو اِغلام (لونڈے بازی) کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان کی تصانیف اور NAKEDLUNCH (TROPICS وغیرہ ایک تازہ نظم میں یہ گیت بھی ہے۔

شراب موجود ہے
ناچ بہت عمدہ ہے
لیکن اس لذیذ عمل
میں کیا دیر ہے
جو دو آدمی کیا کرتے ہیں
یہ عمل شیریں ترین
کامل ترین
اور لذیذ ترین ہے

سائنس نے پیشابی امراض کا ڈر دُور کر دیا ہے اور دہریت نے خدا کا خوف دُور کر دیا ہے، اب یہ جنسی سیلاب رُکے تو کیوں کر،

یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ کے تقریباً سارے مرد اور پچاس فی صد عورتیں شادی سے پہلے ہی حرامکاری کر چکی ہوتی ہیں ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر نفسیات ڈاکٹر گراہم کا اندازہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ برس میں کالجوں کے طلبہ میں حرامکاری پچاس سے ساٹھ فی صدی تک اور طالبات میں پچاس سے چالیس فیصد تک بڑھ چکی ہے، سوشیالوجی کے ایک عالم پروڈ کا تخمینہ یہ ہے، کہ شادی کے وقت ہر چھ لڑکیوں میں سے ایک حاملہ ہوتی ہے یہ مرض بالغ لڑکوں اور لڑکیوں میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے بعض والدین اس خیال سے کہ ان کی اولاد زندگی کی ہر منزل سے روشناس ہو جائے، اپنے ہاں مخلوط پارٹیاں کرتے ہیں اور تیرہ چودہ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں کو شراب پلا کر نچاتے اور جذبۂ جنسیت کو بھڑکاتے ہیں، گو مذہب اس آزادی کی اجازت نہیں دیتا لیکن مذہب کی بات آج نہ اولاد سنتی ہے اور نہ والدین۔

آج سے بیس سال پہلے کالج کے طلبہ ہوس کی آگ بجھانے کے لیے قحبہ خانوں میں جاتے تھے لیکن اب یہ کام کالج کی حدود میں ہی ہو جاتا ہے۔ آج اس لڑکے سے نفرت کیجاتی ہے۔ جس کے کسی لڑکی سے ناجائز تعلقات نہ ہوں، بعض لڑکیاں چھیڑ چھاڑ کو زیادہ پسند نہیں کرتیں وہ لڑکوں سے بے جھجک کہہ دیتی ہیں کہ ہماری آگ کو زیادہ نہ بھڑکاؤ! آؤ! اور اپنا کام کرو! امریکہ میں کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا قطعاً معیوب نہیں، ایک صاحب نے ایک مضمون میں لکھا کہ شادی سے پہلے جس لڑکی کے ناجائز تعلقات صرف ... دو تین مردوں سے رہے ہوں اسے کنواری ہی سمجھو۔

حال ہی میں کالج کی ایک لڑکی کی ایک نظم شائع ہوئی ہے۔ جس کے آخری

شعر یہ ہیں:-

میں اپنا جسم اپنے یار کے حوالے کرتی ہوں۔

سماج کہتا ہے ایسا مت کرو

لعنت اس سماج پہ

کتنی ہی نوخیز کنواری لڑکیاں بچوں کی مائیں بن چکی ہیں ۱۹۴۰ء میں ایسی لڑکیوں کا تناسب آٹھ فی ہزار تھا اور ۱۹۶۱ء میں سولہ فی ہزار

۲۰-۲۵ سال کی کنواری لڑکیوں کی تعداد جن سے بچے پیدا ہوئے ۱۹۴۰ء میں گیارہ فی ہزار اور ۱۹۶۱ء میں اکتالیس فی ہزار تھی۔

ریاست متحدہ امریکہ کی کل آبادی بیس کروڑ ہے اگر ۱۴ سے ۲۵ سال تک لڑکیوں کی تعداد سات کروڑ ہو تو صرف ایک سال میں حرامی بچوں کی تعداد انیس لاکھ بنتی ہے ایک امریکی رسالے "لک" کی اشاعت ستمبر ۱۹۶۳ء میں ایسی لڑکیوں کی تعداد پچاسی فیصد درج ہے۔ کالج کی لڑکیوں کے پاس نہ صرف حمل رد کے بلکہ گرانے کا بھی سامان ہوتا ہے، بعض گھروں میں مائیں اور بہنیں بیٹوں اور بھائیوں سے یارانہ گانٹھ لیتی ہیں۔ ہنری ہلر کا قول ہے۔

یہ امر سمجھ میں نہیں آتا کہ، ماں سے یاری کرنے میں کیا حرج ہے۔

امریکی سماج میں عموماً اپنے کسی بہترین دوست کی بیوی سے یارانہ گانٹھا جاتا ہے۔ یورپ کے براعظم میں حرامکاری پہ کوئی بندش نہیں۔ وہاں کے سماج نے اسے گوارا کر لیا ہے، البتہ امریکہ میں دل ڈیورانٹ جیسے چند ایک اہل نظر آزادی اس آزادی کے مخالف ہیں۔ لیکن معاملہ اتنا الجھ چکا ہے کہ کسی طرح سلجھنے کی صورت نظر

نہیں آتی۔

یہ ہے ملخص "ٹمائمز" کے مقالے کا۔

اس سے ظاہر ہے کہ امریکہ ایک مکمل کنجر ستان بن چکا ہے اور یورپ اس سے دس قدم آگے ہے۔

## پاکستانی طلبا یورپ اور امریکہ میں

ہر سال سینکڑوں پاکستانی طلبا، یورپ اور امریکہ میں جاتے ہیں۔ ان میں سے ساڑھے ننانوے خدا اور رسول کے باغی، اوباش، رقاص، شرابی اور مکمل حیوان بن کر واپس آتے ہیں، جب ہمارے نوجوان وہاں شراب پی کر لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں، تو ان پر ہر طرف سے انگلیاں اٹھتی ہیں، اور لوگ پوچھتے ہیں، "کیا سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے نمائندے یہی ہیں؟ سائنسی مضامین کے لیے وہاں جانا تو ایک مجبوری ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور قانون کے لیے وہاں کا حج کیوں ضروری ہے؟ ان کی تاریخ جھوٹ کا پلندہ، ان کا فلسفہ غلط ان کا قانون و جغرافیہ ہمارے لیے قطعاً بے کار۔ ان کے لیے لاکھوں روپے کا زرِ مبادلہ ضائع کرنا اپنے نوجوانوں کو عیاش و شرابی بنانا اور خدا و رسول سے متنفر کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اگر ہم آنکھیں بند کر کے یورپ کی گھناونی متعفن، عریاں، اخلاق سوز اور غلیظ تہذیب کو اپناتے گئے۔ تو صرف دس سال میں یہاں سے اسلام کا جنازہ اٹھ جائے گا، اور یہ شہیدوں، دلیروں، غیور جانبازوں اور مقدس دیویوں کی پاک سرزمین بھڑووں، دُلّوں اور رنڈیوں کا وطن بن جائے گی

# عائلی مسائل

# حکومت کا آرڈی ننس اور علمائے کرام

مارچ ۱۹۶۱ء کے آغاز میں حکومت نے میراث، نکاح اور طلاق پر ایک آرڈی ننس جاری کیا تھا۔ جس پر چودہ علماء نے ایک مشترکہ بیان پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اِن علماء میں بعض بڑے پائے کے لوگ ہیں۔ خصوصاً سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو دنیائے اسلام میں عظیم شہرت کے مالک ہیں۔ ان علماء نے اس آرڈی ننس کو خلافِ شریعت قرار دیا ہے، اور حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اس میں مناسب ترمیم کرے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے اعلان اور علماء کے بیان پر ایک غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالی جائے۔

## یتیم پوتے کی وراثت

یہ تسلیم کئے بن چارہ نہیں کہ قرآن عظیم کی ہر ہدایت میں نوعِ انسان کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہر دَور میں کچھ ایسے علماء موجود رہے ہیں۔ جو کتابِ حکیم کے بعض احکام کی ایسی تاویل کرتے رہے جن سے ان کی منفعت مضرت میں بدل جاتی رہی۔ ان مسائل میں سے ایک "یتیم پوتے کی وراثت" ہے ہمارے اکثر علماء کا فتویٰ

یہ ہے کہ باپ کی زندگی میں بیٹا فوت ہو جائے تو یتیم پوتا دادے کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کس قدر عجیب فتویٰ ہے۔ ایک طرف تو پوتا باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا اور دوسری طرف ساری جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ پہلی افتاد تو نتیجہ تقدیر تھی۔ جسے نہ دادا ٹال سکتا تھا اور نہ پوتا۔ لیکن یہ دوسری افتاد کس گناہ کی سزا ہے؟ کیا کوئی معقول انسان اس فتویٰ کو تسلیم کر سکتا ہے؟ ذرا مندرجہ ذیل صورتوں پہ غور فرمائیے

اوّل:۔ زید ایک متمول آدمی ہے۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ بڑا ہائیکورٹ کا جج ہے منجھلا ایک کروڑ پتی سیٹھ ہے۔ چھوٹا محض کسان جس کا گذارہ والد کی زرعی زمین پر ہے اس کے چار پانچ بچے بھی ہیں۔ قضاءً اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کے والد کی حرکتِ قلب بھی بند ہو جاتی ہے اور دونوں کا جنازہ بیک وقت اٹھتا ہے ماتم تو تینوں گھروں میں ہوگا لیکن شدید تر اس گھر میں جس پر باپ اور دادا ہر دو کی جدائی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رحم و انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ دوسروں کی بنسبت یتیم پوتوں کو زیادہ حصہ دیا جاتا لیکن ہمارے علماء فرماتے ہیں:۔

"کہ قرآن کا قانونِ میراث سرے سے اس اصول پہ مبنی ہی نہیں کہ کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی جائے۔ ... ... " (پمفلٹ ص۳)

بدیگر الفاظ قرآنی احکام کی بنیاد بے رحمی، حق تلفی اور یتیم کشی پہ رکھی گئی ہے اور جو شخص ان یتیموں کو حق دلانے کی کوشش کرے گا وہ خارج از اسلام تصور ہوگا۔ اگر یہی قانونِ میراث ہے تو اللہ انسانی دنیا کو اس قانون سے محفوظ رکھے۔

(دوم) فرض کیجئے ایک باپ اور بیٹا کسی بس میں سفر کر رہے ہیں۔ بس پھسل کر ایک گہرے کھڈ میں جا پڑتی ہے۔ یہ دونوں شدید زخمی ہوتے ہیں۔ دونوں کو ہسپتال

میں پہنچایا جاتا ہے۔ صرف سیکنڈ کے وقفے سے دونوں کی وفات ہو جاتی ہے۔ یعنی، گیارہ بج کر ایک سیکنڈ پر ایک اور گیارہ بجکر دو سیکنڈ پر دوسرا مر جاتا ہے۔ اب علماء کی بوالعجبی ملاحظہ فرمائیے۔ کہ اگر پہلے مرنے والا باپ ہے تو یتیم پوتے اس کی وراثت سے حصہ پائیں گے اور اگر بیٹا ہے تو محروم کر دیئے جائیں گے۔

**مغالطہ** اس سلسلے میں ان علماء نے عجیب قسم کے دلائل سے کام لیا ہے۔ ایک دلیل تو آپ ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ قانونِ میراث کی بنیاد رحم پر رکھی ہی نہیں گئی اور دوسری یہ:

"قرآن ایک مورث کے ترکے ہیں صرف ان رشتہ داروں کے حصے مقرر کرتا ہے جو مورث کی وفات کے وقت موجود ہوں۔ لیکن آرڈی ننس کی یہ دفعہ (۴) بعض ان رشتہ داروں کو حصہ دلاتی ہے جو مورث کی زندگی میں وفات پا چکے ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے پہلے یہ فرض کر لیا جائے کہ وفات یافتہ رشتہ دار مورث کی وفات کے وقت زندہ ہیں...... پھر ان کا حصہ نکالتے ہی انھیں مردہ تسلیم کر لیا جاتا ہے... سوال یہ ہے کہ قرآن کی کس آیات سے یہ قانونی مفروضات اور قانونی فیصلے اخذ کیے گئے ہیں (پمفلٹ صـ۲)

اگر خلافِ ادب نہ ہو تو ایک آدھ سوال میں بھی پوچھ لوں۔

۱: قرآن میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ اگر بیٹا مر جائے تو یتیم پوتے کو دادا کی جائیداد سے محروم کر دیا جائے۔

۲: تقسیمِ وراثت کے وقت متوفی بیٹے کا حصہ اس کی اولاد کو دینا کس آیت کے خلاف ہے؟ اور اسے چند لمحات کے لیے زندہ تصور کرنے میں کون سی قباحت

پیدا ہوتی ہے؟

**قرآن کی روشنی میں** قرآنی آیات پر غور کرنے سے پہلے ایک لفظ یعنی "اولاد" کی تشریح ضروری ہے۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں۔ اوّل بیٹا یا بیٹی۔ دوم وہ بیٹے اور پوتے جنھیں ہر نانا، نانی اور دادا، دادی اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور اسی رشتے کی وجہ سے انسان اولادِ آدم کہلاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (نساء ۱۱)

[اللہ تمھیں اپنی اولاد کے متعلق ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر رکھو]

تمام نسلِ انسان کو اولادِ آدم سمجھنا اور یتیم پوتے کو دادے کی اولاد قرار نہ دینا کچھ عجیب سی بات ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص شاخ کو درخت کی بیٹی قرار دے اور پتوں کو درخت کی اولاد نہ سمجھے۔

قرآن کیا ہے؟ منشائے ایزدی کا بیان۔ یہ بیان کہیں مفصّل ہے کہیں مجمل اور کہیں صرف رمز و کنایہ۔ مثلاً اللہ ہمیں بار بار، عدل، احسان، انفاق، رحم، مسکین نوازی اور یتیم پروری کا حکم دیتا ہے۔ اور اس موضوع پر قرآن میں کئی ہزار آیات موجود ہیں۔ کیا یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کرنا ان تمام آیات کی تکذیب اور انتہائی بے رحمی نہیں؟ ان آیات پر غور فرمایئے

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا. وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۔ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا

(نِ ۷ ۔ ۵)

[ماں باپ اور رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ جائیں وہ کم ہو یا زیادہ اس میں مردوں اور عورتوں سب کا حصہ مقرر ہے ۔ اگر تقسیم میراث کے وقت (غیر حصہ دار) رشتہ دار یتیم اور مسکین موجود ہوں تو انھیں اس مال میں سے کچھ دو اور ان سے میٹھی باتیں کرو ۔ میراث تقسیم کرنے والے یہ بات سامنے رکھیں کہ اگر ان کی اپنی وفات اس حال میں ہوتی کہ پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے رہ جاتے تو ظاہر ہے کہ انھیں بڑی فکر ہوتی ۔ سو ان تمام کو اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سیدھی بات کہنا چاہیے ]

اِن تمام آیات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ تقسیم میراث کے وقت اُن اقارب، یتامیٰ اور مساکین تک کا خیال رکھو ۔ جو شرعاً وارث نہیں ہیں اور پمفلٹ والے علماء فرماتے ہیں ۔ کہ باہر کے یتیموں کو تو جو چاہو دے دو ۔ البتہ یتیم پوتے کا خیال رکھنا کہ اس کے دامن میں ایک حبہ تک نہ جانے پائے ۔

**اندراجِ نکاح** | دفعہ ۵ کی رُو سے ہر نکاح کا اندراج یونین کونسل کے رجسٹر میں ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ اس پر علماء کو کئی اعتراضات ہیں ۔

اول :- اس اندراج کو قانوناً لازم کرنا اور اس کی خلاف ورزی پر سزا دینا شرعاً غلط ہے ۔

کیوں غلط ہے ؟

قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ نکاح درج رجسٹر نہ کراؤ ؟ اگر قرآن ان مسائل پر خاموش ہے تو پھر آپ کو بولنے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا ؟ اسی شق کے متعلق ذرا آگے چل کر

ارشاد ہوتا ہے۔

"جہاں تک نکاح کی رجسٹری کا تعلق ہے اس کی ضرورت اور فائدے سے انکار نہیں" (پمفلٹ ص ۳)

اگر یہ اقدام ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ تو پھر خلافِ شریعت کیسے ہوا؟ کیا شریعت کے مطابق ہونے کا مفہوم یہی ہے۔ کہ ایسا اقدام غیر ضروری بھی ہو اور مضر بھی؟

دوم: شریعت اسلامیہ میں نکاح خواں کا سرے سے باقاعدہ منصب ہی نہیں ... لیکن یہ رجسٹریشن نکاح خواں کا ایک منصب قائم کرتا ہے۔

گزشتہ کئی صدیوں سے محلے کا امام نکاح کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ تمام نکاح میونسپلٹی کے رجسٹرات میں درج ہو رہے ہیں۔ ایسے نکاحوں میں یہ پمفلٹ والے علماء بیسیوں مرتبہ شامل بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے نہ کبھی احتجاج کیا نہ کوئی پمفلٹ شائع کیا۔ جب اسی رواج کو حکومت نے اپنا لیا۔ تو جھٹ پمفلٹ شائع کر دیا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ رہا نکاح خواں کا منصب، تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن سرکاری ملازمین کی لسٹ نہیں کہ اس میں تمام مناصب کا ذکر موجود ہو۔ خود علماء میں ہزاروں قاضی، مفتی، مجتہد اور علامہ ہو گزرے ہیں۔ اور اب بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض خطیب، واعظ، زاہد، مفسر، محدث، متکلم اور فلسفی کہلاتے تھے۔ اور بعض دیگر شیخ الاسلام، مجدد اور فقیہہ۔ اگر ان تمام مناصب کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ اور بایں ہمہ آپ انہیں خلافِ شریعت نہیں سمجھتے۔ تو پھر نکاح خواں کے منصب پر اعتراض کیوں؟ کل آپ کہیں گے کہ قرآن میں نہ ریل کا ذکر ہے نہ گارڈ، نہ ٹی ٹی اور نہ اسٹیشن ماسٹر کا اس لیے ان تمام مناصب کو

ختم کر دیا جائے۔

سوئم: تیسری بات قابل غور کہ آیا واقعی یہ رجسٹریشن جائز نکاحوں کے ثبوت کا کوئی ذریعہ ہے؟ ......... اس بات کا بہت امکان ہے کہ بااثر غنڈہ رشوت اور سازش کے ذریعے کسی شریف عورت کے ساتھ کا بالکل فرضی اندراج کرا دے اور اس پر اپنے ساتھی غنڈوں کی گواہیاں ثبت کر دے" (صہ)

اگر رجسٹر میں ایک ایسا اندراج جس پر نکاح خواں، وکیل منکوحہ اور زنین چار گواہوں کے دستخط ثبت ہوں۔ ناقابل اعتبار ہو سکتا ہے۔ تو پھر زبانی نکاح کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ جو غنڈہ رجسٹر میں فرضی نکاح درج کرا سکتا ہے۔ وہ اپنے غیر مندرج فرضی نکاح کے ثبوت میں دس گواہ بھی عدالت میں پیش کر سکتا ہے۔ کیا ہم تمام ریل گاڑیاں محض اس لیے بند کر دیں کہ ان میں بعض بے ٹکٹے سفر کرتے ہیں۔ کیا مساجد کو صرف اس لیے تالا لگا دیں کہ ان میں کبھی کبھی چور اور اُچکے رات گذارتے یا نمازیوں کی جوتیاں اٹھا لے جاتے ہیں۔؟ کسی اچھی چیز کے ناجائز استعمال سے وہ چیز بُری نہیں ہو سکتی۔

تعدد ازدواج | ایک سے زائد بیویوں پر آرڈی ننس کی دفعہ ۶ میں مندرجہ ذیل پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔

اوّل: کہ ایسا شخص پہلے اپنی موجودہ بیوی کی رضامندی حاصل کرے

دوم: اپنی یونین کونسل کی چیئرمین سے اجازت لے۔

سوئم: ایک پنچایت کو جس میں چیئرمین اور اس کی اپنی بیوی یا بیوی کا نمائندہ شامل ہو مطمئن کرے کہ اس کے لیے ایک اور نکاح ضروری ہے اس دفعہ پر علماء

کا تبصرہ یہ ہے :-

"..... تعدد ازدواج کو اصلاً ایک برائی سمجھنا اور صرف ناگزیر حالات میں اس کی اجازت دینا ایک غیر اسلامی تخیّل ہے۔ خود سرورِ کائنات سیدنا محمد صلعم کی متعدد بیویاں تھیں ..... پھر نبی صلعم کے چاروں خلفاء، بیشتر صحابہؓ، اکثر ائمۂ اہلبیت اور اسلامی تاریخ کے بیشتر اکابر جن پر مسلمانوں کو فخر ہے۔ بیک وقت متعدد بیویاں رکھنے والے تھے ... یہ پوری دفعہ منسوخ کر دینے کے قابل ہے کیوں کہ قرآن، سنّت اور فقہ اسلامی اس کے بنیادی تخیّلات اور اس کے اصول و قواعد سے بالکل ناآشنا ہے۔ اس کی بجائے صرف ایک چیز اس دفعہ میں ہونی چاہیے اور وہ یہ کہ جو شخص ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں اُن کے درمیان عدل نہ کرے تو اُس کے خلاف اُس کی بیوی کو شکایت عدالت میں لے جانے کا حق ہوگا" (صـــ)

اِس تبصرے کو پڑھ کر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یا تو اِن اصحاب نے کبھی قرآن دیکھا ہی نہیں اور یا "تنقید برائے تنقید" پر عمل کر رہے ہیں۔ قرآن نے تعددِ ازدواج پر دو کڑی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جن کی تعمیل فرض ہے۔ متعلقہ آیات ملاحظہ فرمائیے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۔ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً

اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (النساء ۲ ۔ ۳)

ترجمہ کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ آیات بالا مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آئے دن حضور صلعم اور صحابہ کرام کو کسی نہ کسی جنگ میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ اِن لڑائیوں میں صحابہ کی ایک خاصی تعداد شہید ہو جاتی تھی۔ حضور پرنور صلعم، پرورش اور حفاظت کی خاطر شہدا کی اولاد کو باقی صحابہ کے سپرد کر دیتے تھے۔ اِن یتامیٰ میں بعض صاحبِ جائداد ہوتے تھے۔ گو صحابۂ کرام انتہا درجہ کے دیانتدار تھے۔ لیکن پھر بھی یہ خطرہ رہتا تھا۔ کہ کہیں یتیموں کے کھیتوں کا غلہ، اُن کے باغات کا پھل یا اُن کے ریوڑ کی اون وغیرہ گھر کے دیگر افراد استعمال نہ کریں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا۔ کہ اگر اس قسم کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ تو جوان یتیم لڑکیوں یا ان کی ماؤں سے نکاح کر لو۔ تاکہ اپنے پرائے مال کی تمیز ہی باقی نہ رہے اور ان حالات میں چار شادیوں کی اجازت اس شرط پہ دی۔ کہ کسی بیوی سے ناانصافی نہ ہونے پائے۔ تو گویا ایک سے زیادہ نکاح صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔

اول :۔ کہ یتیموں کے مال میں بے حسابی اور ناجائز تصرّف کا خطرہ ہو۔

دوم :۔ کہ کسی بیوی سے ناانصافی کا کوئی خطرہ موجود نہ ہو۔ میں ان پمفلٹ والے علماء سے پوچھتا ہوں۔ کہ آپ میں سے بعض دوسرے یا تیسرے نکاح کی تقریبات میں کہیں نہ کہیں شامل ہوئے ہوں گے۔ کیا آپ نے دولہا میاں سے کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا فرمائی کہ کیوں میاں صاحب! آپ کے تصرّف میں کتنی یتیم لڑکیاں ہیں؟ ان کی جائیداد کتنی ہے؟ اور کیا آپ کو بے حسابی کا خطرہ ہے؟ اگر ان نکاحوں میں ایسی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ بلکہ یہ شادیاں عموماً ناجائز عشق کا نتیجہ تھیں۔ جن میں پہلی بیوی سے

عدل وانصاف کا ہلکا سا امکان بھی موجود نہیں تھا۔ تو پھر آپ ایسی شادیوں میں کیوں شامل ہوئے نکاح خواں کے فرائض کیوں سر انجام دیئے؟ اور ان نکاحوں کے جواز پر مُہرِ تصدیق کیسے ثبت کی۔؟

آرڈی ننس کی دفعہ زیرِ بحث سے نہ علماء کو اتفاق ہے اور نہ مجھے۔ علماء کو اس لیے اختلاف ہے کہ کثرتِ ازدواج پہ پابندیاں کیوں عائد کیں۔ اور مجھے یہ اعتراض ہے کہ حکومت نے بنیادی پابندی کو نظر انداز کر دیا ہے اور جب تک اس میں مندرجہ ذیل کلاز کا اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ دفعہ قرآن کے مطابق نہیں بنے گی۔

**کلاز:**۔ اگر کسی شخص کی سرپرستی میں صاحبِ جائداد یتیم ہوں اور اسے ان کے مال میں بے حسابی اور ناجائز تصرّت کا خطرہ لاحق ہو جائے تو ان سے چار کی حد تک اس شرط پر نکاح کر سکتا ہے کہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اگر اسے یہ خوف ہو کہ وہ سب سے یکساں سلوک نہیں کر سکے گا۔ تو پھر اُسے صرف ایک ہی شادی کی اجازت ہے۔

اب آیاتِ بالا کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

(یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو اپنی ردّی چیزوں سے اُن کی اچھی چیزوں کا مُبادلہ مت کرو اور ان کا مال اپنے مال سے ملا کر مت کھاؤ کہ یہ ایک بڑا گناہ ہے۔ اور اگر تمھیں یہ خطرہ لاحق ہو جائے۔ کہ تم یتیموں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکو گے۔ تو پھر اپنی پسندیدہ لڑکیوں سے دو تین اور چار کی حد تک نکاح کر لو۔ اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ تم سب سے یکساں سلوک نہیں کر سکو گے۔ تو پھر ایک ہی نکاح کی اجازت ہے۔ یا پھر اُن لونڈیوں سے نکاح کرو جو تمھارے قبضہ میں ہوں۔ یہ

ہدایات کثرتِ عیال سے بچنے کے لیے مفید ہیں۔
رہا حضور پر نور صلعم کا عمل۔ تو آپ کے لیے عرش سے ایک خصوصی آرڈی ننس نافذ ہوا تھا۔ جس کے تحت آپ کی تمام ازواج آپ پہ حلال کر دی گئی تھیں۔ اور آئندہ کے لیے آپ کو مزید شادیوں سے روک دیا گیا تھا۔
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ۔ (احزاب ...۵۰)
[اے نبی! تم جن بیبیوں کا مہر ادا کر چکے ہو انھیں ہم تمھارے لیے جائز اور حلال قرار دیتے ہیں]
لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (احزاب ...۵۲)
[اس آیت کے نزول کے بعد تمھیں کسی اور نکاح کی اجازت نہیں۔]
رہے صحابہ کرام، تابعین اور اکابرِ اسلام تو ان کا ہر عمل ہمارے لیے واجب التقلید نہیں۔ یہ لوگ معصوم نہیں تھے۔ اِن سے لغزشیں سرزد ہوتی تھیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں بعض صحابہ بھی شریک تھے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ کی خوفناک جنگ میں دونوں طرف صحابہ کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔ اگر ان میں سے کسی نے کثرتِ ازواج کی قرآنی پابندیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ تو اُس کا یہ عمل شرعی حُجت نہیں نہیں بن سکتا۔
اگر کوئی شخص بیوی کے دائمی مرض یا بے اولادی یا شدتِ اختلاف کی وجہ سے دوسرے نکاح پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لیے سیدھا راستہ یہ ہے۔ کہ پہلی بیوی کو طلاق دے۔ اس کا مہر ادا کرے۔ اگر اس کے گزارے کی کوئی اور سبیل موجود

نہیں تو نکاح ثانی تک اُس کا خرچ ادا کرے۔

مسئلہ طلاق | طلاق کا رواجی طریقہ یہ ہے کہ جونہی شوہر کے منہ سے طلاق کا لفظ نکلتا ہے۔ ہمارا مفتی بیوی کو حرام قرار دے دیتا ہے اور اگر بعد میں شوہر نادم ہو جائے۔ تو اُسے حلالے کی راہ دکھاتا ہے۔ اس کا نکاح کسی اور سے کراؤ، ایک رات کے بعد اس سے طلاق لو اور دوبارہ نکاح کر لو۔ اِس سلسلے میں علمائے نے طلاق کی کئی قسمیں بنا رکھی ہیں۔ مثلاً رجعی، بائن، مُغلّظ، جن کا نام و نشان تک قرآن میں موجود نہیں۔ قرآنی طلاق کی صورت صرف یہ ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ... اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ... وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ...... (البقرہ ۲۲۸ — ۲۳۲)

[جن عورتوں کو طلاق مل گئی ہے۔ وہ تین حیض (اندازاً تین ماہ) تک انتظار کریں ... اس دوران میں اگر اُن کے شوہر صلاح کا ارادہ کریں۔ تو وہ انہیں واپس لینے کا پورا حق رکھتے ہیں .... طلاق دو مرتبہ ہو سکتی۔ اس کے بعد یا تو بیوی کو ایک اچھے طریقے سے گھر میں رکھا جائے۔ یا حُسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دیا جائے ..... جب مطلقہ عورتیں اپنی عدت ختم کر چکیں اور میاں بیوی صلح کر لیں۔ تو ان کو اپنے شوہروں کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنے سے مت روکو۔)

ان ہدایات کی مزید تفصیل سورۂ طلاق میں ملتی ہے۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا
الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۖ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ ........
فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ ........

(طلاق ۱-۲)

[اے نبیؐ! جب آپ ازواج کو طلاق دیں، تو عدت والی طلاق دیں۔ اور عدت کو گنتے رہیں۔ اللہ سے ڈریں اور انھیں اپنے گھروں سے نہ نکالیں اور جب وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو اس کے بعد یا تو عمدہ طریقے سے انھیں اپنے ہاں رکھ لو اور یا حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دو۔]

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن میں طلاقِ بے عدت کا نام و نشان تک موجود نہیں اور ہمارے علماء کا یہ عالم ہے کہ شوہر کے منہ سے لفظِ طلاق نکلتے ہی بیوی کو حرام کر کے باہر پھینک دیتے ہیں۔ علماء کے اس غیر قرآنی روش کا سدِباب کرنے کے لیے حکومت نے آرڈیننس میں دفعہ ۷ کا اضافہ کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ کہ شوہر طلاق کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

۲۔ عدتِ طلاق ۹۰ دن ہوگی۔

۳۔ اس مدت میں شوہر کو رجوع کا حق ہوگا۔

۴۔ اور چیئرمین اطلاعِ طلاق کے بعد میاں بیوی میں صلح کرانے کی کوشش کریگا

اس پر علماء کا تبصرہ کافی طویل ہے۔ جس میں سے موٹی موٹی باتیں یہ ہیں

۱۔ یہ تمام شقیں قرآن کے صریح احکام سے ٹکراتی ہیں (صـ)

کیسے ؟ کیا مسئلہ عدت غلط ہے ؟ شوہر کا حق رجوع ناجائز ہے ؟ یا چیئرمین کی سعی
مصالحت کفر ہے ؟ چیئرمین جب صلح کرائے گا تو لازماً ایک آدمی شوہر کی طرف سے بلائے
گا اور دوسرا بیوی کے خاندان سے اور اس طرح حَکَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَهْلِهَا)
[میاں بیوی میں صلح کرانے کیلئے ایک نمائندہ شوہر کا ہو اور ایک بیوی کا -] کا منشا پورا ہو جائے گا۔

”یہاں شوہر کے حق طلاق کو کسی پنچایت یا عدالت کے سامنے پیش کرنے اور
اس کا فیصلہ کرنے سے مقید کیا گیا ہے“ (ص )

کہاں مقید کیا گیا ہے ؟ حق طلاق تو شوہر ہی کو حاصل ہے۔ اس نے صرف چیئرمین
کو اطلاع دینا ہے اور چیئرمین کا کام صلح کرانا ہے وبس۔ یہ اقدام شریعت کے خلاف
کیسے ہوا ـــ ؟ رہا یہ کہ اگر شوہر نے طلاق کی اطلاع نہ دی تو اسے سزا ملے گی۔
یہ کلاز کس آیت کے خلاف ہے ؟ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ چیئرمین کو اطلاع
طلاق نہ دینا عین شریعت ہے۔

۳۔ ”اس دفعہ کی شق ۶ ایک اور فتنہ انگیز صورت پیدا کرتی ہے۔ اس
میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر وہ نکاح جو کسی مؤثر طلاق کے ذریعے سے ختم ہو چکا ہو،
اس کے فریقین دوبارہ باہم نکاح کر سکیں گے۔ بغیر اس کے کہ عورت کسی دوسرے
شخص سے نکاح کرنے کے بعد طلاق پا چکی ہو۔ اس شق کا منشا یہ ہے کہ یک
وقت دی ہوئی طلاقیں خواہ تین ہی کیوں نہ ہوں مغلظ نہیں ہوں گی اور عملاً ان
کی تاثیر ایک ہی ہوگی۔ بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے
لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے ‘ ........ اس ملک کے باشندوں کی عظیم
اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کا اعتقاد امام ابو حنیفہؒ اور مذہب حنفی

کے ائمہ وفقہا کے علم و تقویٰ پر ہے ۔ وہ اعتماد آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔ (صنا)

قرآن کہتا ہے کہ خاتمۂ عدت پر میاں بیوی کو دوبارہ رشتۂ نکاح میں منسلک ہونے سے مت روکو اور یہ علماء فرماتے ہیں کہ یہ ایک فتنہ انگیز صورت ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ زمانۂ عدت تین حیض ہے ۔ اس عرصے میں جب چاہو رجوع کر لو ۔ اور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ چیز حنفی مذہب کے خلاف ہے ۔ مطلب یہ اگر کوئی بات قرآن کے عین مطابق اور حنفی مذہب کے خلاف ہو ۔ تو اسے کفر و الحاد سمجھا جائے ۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ حنفی مذہب کیا چیز ہے ؟ اس کی سند قرآن میں کہاں ہے ! حضور پرنور نے کہاں فرمایا ہے ؟ کہ جہاں امام ابو حنیفہؒ اور قرآن میں تصادم ہو جائے وہاں قرآن کو ٹھکرا دو ؟ کیا اسلام کی بنیاد قرآنی وحی پہ ہے یا امام اعظم کی فقہ پر ۔؟

دفعہ ۱۲ | اس دفعہ کی رو سے لڑکی کی شادی کی عمر ۱۴ برس سے ۱۶ کر دی گئی ہے جس پر علمائ کا تبصرہ یہ ہے ۔

"ہمیں اس سے انکار نہیں کہ صغر سنی (چھوٹی عمر) کی شادی بالعموم ہمت افزائی کی مستحق نہیں اور جن علاقوں میں اس کا رواج قباحتیں پیدا کر رہا ہے ۔ وہاں اس کی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن معاشرے کی ہر خرابی کا علاج لازماً جبر ہی نہیں ہے"

(صلا)

جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ بچپن کی شادی بالعموم ہمت افزائی کی مستحق نہیں اور بعض علاقوں میں اس کا رواج قباحتیں پیدا کر رہا ہے تو پھر ایسے برے رواج کو

سختی سے کیوں روکا جائے۔ آپ فرمائیں گے کہ اس سختی کی سند قرآن سے لاؤ۔ جواباً یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ آئے دن اپنے بچے یا شاگرد کو کسی چھوٹی سی بات پہ پیٹ ڈالتے ہیں تو اس وقت قرآن کی کس آیت سے استناد کیا کرتے ہیں؟ بدی سختی ہی سے رُک سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے حضورِ پُر نور کو قرآن کے ساتھ تلوار بھی دی تھی اور یہ تلوار نمائشی نہیں تھی۔ بلکہ باطل تصورات، افکار اور رسومات کا سر قلم کرنے کے لیے تھی۔

**علماء کا منصب** | بے شک علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ حکومت کے غیر شرعی اعمال پر نکتہ چینی کریں۔ اُسے جادۂ ہدایت سے منحرف نہ ہونے دیں۔ یہ ایک طرح کا مقدس جہاد ہے۔ جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ لیکن تنقید کرتے وقت قرآن اور حنفی مذہب کی حدود تو متعین کر لیا کریں۔ پھر تنقید کا مقصد تخریب نہ ہو بلکہ تعمیر ہو۔ ملّت پاکستان ایک نوجوان قوم ہے۔ یہ فرنگ کی صد سالہ غلامی سے ابھی ابھی نکلی ہے۔ ابھی اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ نہ اس کے فکر و نظر میں تازگی ہے نہ قلب و نگاہ میں پاکیزگی اس کی تگ و دو معاشی وسائل تک محدود ہے اور یہ انسانیت کبریٰ کے مقامات سے محض بے خبر ہے۔ اس لئے ہمارے علماء ایسی تنقید کی بجائے قوم کی اخلاقی و روحانی تعمیر پہ اپنی توجہ مرکوز کریں اور اگر سو میں سے صرف دس آدمیوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنے میں کامیاب ہو جائیں تو ملّت کے اس احسان کو تاریخ فراموش نہیں کرے گی اور وہ اللہ سے اجرِ عظیم پائیں گے۔

# "اگر رسولِ خدا دوبارہ تشریف لائیں تو"

محمد رضا شبیبی عراق کے ایک بلند پایہ مفکر، سیاست دان اور شاعر ہیں، کئی بار عراقی کابینہ میں وزیر تعلیم بھی رہے، چونکہ اللہ کو اسلام کی حیاتِ ثانیہ منظور ہے۔ اس لیے مشرق سے مغرب تک ایسے بیسیوں فلسفی، مفکر پیدا ہو گئے ہیں جو اسلامی نظامِ حیات کی برتری اور فرنگی تہذیب کی تباہ کاریوں پہ دھڑا دھڑ لکھ رہے ہیں۔ ان میں انڈونیشیا کے ڈاکٹر ناصر، شام کے ڈاکٹر دوالیبی، مصر کے شیخ ابوزہرہ و ڈاکٹر عبد الغنی حسن، مراکش کے حید اللہ کنوں اور عراق کے محمد رضا شبیبی بہت ممتاز ہیں یہ سب کے سب ایک سی باتیں کہہ رہے ہیں۔

۱۔ کہ انسان کی نجات صرف اسلام میں ہے اور باقی تمام ازم محض ڈھکوسلے ہیں۔

۲۔ کہ یورپ کا تجویز کردہ نظامِ تعلیم، اس کی تاریخ، اُس کا ادب اور فلسفہ انسانیت کے لیے زہرِ قاتل ہے۔

۳۔ کہ صلیبی جنگیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور نظری میدانوں میں زیادہ شدت کے ساتھ جاری ہیں۔ اس جنگ کے ہتھیار یورپ کے مصور رسائل، اس کی فحش عریاں اور غلیظ فلمیں، اس کی لکھی ہوئی غلط سلط تاریخ، اس کا گمراہ کن فلسفہ اور اخلاق سوز لٹریچر ہے، گو ۱۹۱۸ء میں سقوطِ شام کے وقت یورپی فوج کے سپہ سالار

نے یہ اعلان کیا تھا، کہ "صلیبی جنگ آج ختم ہو گئی" لیکن دراصل یہ ختم نہیں ہوئی، یورپ کا مقابلہ اسلامی روح سے ہے، جو کبھی ریف کے عبدالکریم، کبھی ترکی کے اتاترک کبھی پاکستان کے قائد اعظم، کبھی مصر کے زغلول اور کبھی الجزائر کے سرفروشوں کا روپ دھار لیتی ہے یہ روح پھر بیدار ہو رہی ہے اور جکارتہ سے قیروان تک ایک ہی آواز بلند ہو رہی ہے

نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشاں — ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
زچشم امم ریخت آں اشکِ نابے — کہ تاثیر او گل دماند ز خارے
سرت گردم اے ساقیِ ماہ سیما — بیار از نیاگانِ ما یادگارے
بہ ساغر فروریز آبے کہ جاں را — فروزد چو نورے بسوزد چو نارے
شقائق بروید ز خاکِ نژندم — بہشتے فرو چیں بہشت غبارے

(اقبالؒ)

۴۔ کہ شراب و رقص قومی زندگی کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں، اور خدائی غضب کو یوں کھینچتے ہیں، جیسے لوہے کو مقناطیس۔ یورپ بیس سال کے عرصے میں دو مرتبہ خوفناک جنگوں کا شکار ہو چکا ہے۔ پہلی میں چھ کروڑ اور دوسری میں بارہ کروڑ افراد ہلاک یا زخمی ہوئے تھے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک ہر رات کئی کئی سو بمبار لندن، برمنگھم، لنکاشائر اور دیگر شہروں پہ جاتے ہزار ہا ٹن وزن کے بم گراتے، بے شمار عمارات کو پیوند زمین بناتے، لاتعداد نفوس کو موت کے گھاٹ اتارتے اور سینکڑوں مقامات پر آگ بھڑکا کر واپس چلے جاتے تھے۔

بغداد، دہلی، غرناطہ، قاہرہ اور سسلی میں بھی کچھ ہمارے ساتھ ہوا جب ہم ناؤ نوش کے خوگر ہو گئے، عیاشی، اوباشی اور حرام کاری کو اپنا وطیرہ بنا لیا تو اللہ کا قہر

ہلاکو، غازان، فردینان، راجر اور انگریز کی صورت میں ہم پر نازل ہوا۔ لہٰذا دیں اٹھارہ لاکھ، سپین میں پچاس لاکھ، سسلی میں تیس لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ ان کی تین کروڑ کتابیں جلا دی گئیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کو گدھوں اور کتوں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

بالآخر ہم دردمندوں کی دعائیں قبول ہوئیں ۱۹۴۷ء کے شہیدوں کا خون رنگ لایا، کروڑوں مجاہدین آزادی کی مساعی کامیاب ہوئیں اور ہمیں آزادی مل گئی، ہماری سرزمین میں بہار آگئی حدِ نظر تک ہریاول لہرانے لگی۔ لیکن میری قوم کی بدبختی دیکھئے، کہ ہر طرف شرابیوں، رقاصوں اور ریڈیوں کا ایک ٹڈی دل امنڈ پڑا ہے۔ جو میری کھیتی کو چاٹ رہا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو گذشتہ چودہ صدیوں میں اسلام کو ۱۱۹ مرتبہ تخت سے اٹھا کر فرش پر پٹخ چکے ہیں انہی لوگوں نے ہلاکو اور انگریز سے ساز باز کی تھی انھوں نے ہی خدائی غضب کو بار بار پکارا تھا۔

شراب اور رقص کی تباہ کاریوں سے اقوام عالم چیخ اٹھی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا۔ امریکہ نے شراب نوشی بند کر دی تھی جس روز یہ حکم نکلا، کروڑں شرابیوں نے میخانوں پر ہلہ بول دیا سب کچھ توڑ تاڑ ڈالا اور شراب کے مٹکے اٹھا لے گئے۔ پاکستان کو شراب پر پابندی لگانا ہی ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کب؟ آج ہزار میں صرف ایک شرابی ہے اور اس شر کو ختم کرنا آسان ہے، اگر کل یورپ کی طرح ہزار میں نو سو شرابی بن گئے تو پھر اس بدی کا استیصال ناممکن ہو جائے گا۔ سانپ کے بچے کو پال کر ایک زہریلا کوبرا بنانا عقلمندی نہیں۔

آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ کہ سب سے پہلے صدر سوئیکارنو نے،

پھر لبنان نے اور اب ویت نام نے رقص کو قانوناً ممنوع کر دیا ہے، پاکستان میں بھی انفرادی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر سیّد فرید اللہ شاہ سابقون الاولون میں سے ہیں۔ جنھوں نے لاہور کے بیشتر ہوٹلوں میں ناچ ختم کر دیا ہے۔ انھوں نے قیام صلوٰۃ کے لیے بھی محلہ وار مجالس بنائی ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے، ابھی لاہور میں کچھ ایسے کلب موجود ہیں جہاں ہر شام شراب کے دَور چلتے اور ناچ ہوتے ہیں۔ لاہور کے ایک کلب نے ۱۹۶۲ء میں پندرہ لاکھ روپے کی شراب فروخت کی تھی۔

رضا بشیبی کی بات ہے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ رضا بشیبی عراق کے بلند پایہ شاعر مفکر اور ادیب ہیں اور وہاں کے عیاش طبقے سے سخت نالاں ہیں، انھوں نے آج سے کچھ عرصہ پیشتر حضور پُر نور صلعم کے یومِ ولادت پہ ایک نظم پڑھی تھی۔ جو ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔ اس کے چند اشعار کا خلاصہ حاضر ہے۔

۱۔ اگر آج سرورِ کائنات عراق میں دوبارہ تشریف لائیں۔

۲۔ تو ان کے ساتھ عراقی وہی سلوک کریں جو کفارِ مکہ نے کیا تھا۔

۳۔ ہم اس پیغام کو چھوڑ چکے ہیں جو حضورؐ ابن آدم کی طرف لائے تھے، اور آج ہم کسی طرح بھی کفارِ مکہ سے کم نہیں۔

۴۔ ہمیں دیکھ کر حضورؐ حیرت زدہ ہو جائیں گے۔ اور فرمائیں گے۔

"جس راہ پہ تم چل رہے ہو، یہ میری راہ نہیں اور نہ یہ میرا مذہب ہے۔ میں نے تو تمھیں توحید و وحدت کا درس دیا تھا، لیکن تم باہم لڑ رہے ہو، میں نے تمھیں زندگی اور حرارت کی دولت دی تھی۔ لیکن تم متعفن لاشیں بن چکے ہو۔ میں نے تمھیں شراب نوشی اور فحاشی سے روکا تھا لیکن تم نے ..... ان کو حلال بنا لیا ہے۔ میں نے

تمہیں قیصر و کسریٰ کے تخت دیئے تھے لیکن آج تم بے طرح ذلیل و خوار ہو۔ میں نے تمہیں کائنات کی خدمت کے لیے مامور کیا تھا، لیکن تم خواہشات، پیٹ اور شیطان کی پرستش کر رہے ہو، اے میری روح! یہ بستی تیری نہیں اور نہ یہ اُمت تیری ہے یہاں سے گزر جا اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھ!" ...... (ملخص)

یہ تھا عراق لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کسی رات لاہور کے جم خانہ میں نزولِ جلال فرمائیں تو کیا ہو۔ کسی کالج میں نوجوانوں کی حالت دیکھ پائیں مساجد کی ویرانی و بربادی ملاحظہ فرمائیں۔ تو ان کے دل پر کیا گزرے۔

**جنگ سر پہ آ گئی** - امریکہ یا روس لڑیں یا نہ لڑیں پاکستان اور بھارت کی جنگ نہیں ٹل سکتی۔ بد عہد نہرو نے سیکورٹی کونسل کے سامنے اپنے تمام مواعید کی شکست کا اعلان کر دیا ہے۔ کشمیر کے ۵۰ لاکھ مسلمانوں کی زندگی موت سے بدتر بنا دی ہے بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے رزق کے تمام وسائل چھین لیے ہیں۔ گزشتہ سوا برس میں پانچسو سے زیادہ خونی فسادات کرا چکا ہے اور مسلمانوں کو کارواں در کارواں پاکستان کی طرف دھکیل رہا ہے۔ پاکستان اس صورت کو کب تک برداشت کریگا؟ آج ہر پاکستانی نعل در آتش ہے۔ غیض و غضب سے لاوے کی طرح کھول رہا ہے۔ اور ان بے اندازہ مظالم کا انتقام لینے کے لیے سر سے کفن باندھے ہوئے ہے۔ اس لیے یہ جنگ ناگزیر ہے اور میرا اندازہ یہ ہے، کہ یہ اس قدر خونی ہولناک اور طوفانی ہو گی۔ کہ عہد گذشتہ کے تمام ریکارڈ مات ہو جائیں گے۔

**جنگ کا انجام** جنگ کا انجام کیا ہو گا؟ اس وقت کوئی پیشگوئی مشکل ہے حالات یہ ہیں کہ بھارت کی فوج اور اس کا اسلحہ ہم سے آٹھ گنا زیادہ ہے۔ اس کے ہاں

اسلحہ کے بیس کارخانے شب و روز چل رہے ہیں۔ ٹینک اور طیارے تک بن رہے ہیں اس طرف واہ میں صرف ایک بے کار سا کارخانہ اور چند مانگے ہوئے ہتھیار، اس بے سرو سامانی میں صرف ایک چیز ہمیں بچا سکتی ہے کہ ہم اہلِ بدر کی طرح اس قدر بلند اعمال اور خدا پرست بن جائیں کہ ہمارا رب غیبی امداد نازل کرنے پر مجبور ہو جائے یہ اُس کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔

یہ آیات ملاحظہ فرمایئے :-

۱۔ تم بدر میں بالکل بے سرو سامان تھے اور تعداد میں قلیل ہم نے تمھاری مدد کی۔ اللہ سے ڈرو تاکہ اللہ تم کو نوازتا رہے اور تم شکریہ ادا کرتے رہو۔

اے رسول! وہ وقت یاد کرو جب تم اپنی چھوٹی سی فوج سے پوچھ رہے تھے کہ اگر اللہ تمھاری مدد کے لیے تین ہزار فرشتے نازل کرے تو کیا یہ کافی ہوں گے؟ یاد رکھو کہ اگر میدانِ جنگ میں تم ثابت قدم رہے پاکیزگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو دشمن کتنے ہی جوش و خروش سے تم پر حملہ کرے تمھارا رب تمھیں بچائے گا اور پانچ ہزار وردی پوش فرشتوں سے تمھاری مدد کریگا۔ (آلِ عمران ۱۲۳-۱۲۵)

جنگِ بدر میں مسلمان صرف ۳۱۳ تھے ان کی امداد تین ہزار (دس گنا) فرشتوں سے کی اور مزید دو ہزار (سات گنا) کا وعدہ فرمایا۔ مطلب یہ کہ اگر ہم صرف دو خوبیاں پیدا کر لیں۔ اوّل ثابت قدمی، دوم تقویٰ، تو ہماری امداد کے لیے سترہ گنا فوج آسمان سے آ سکتی ہے۔ ہمارے مقدس اسلاف نے اس نسخے کو بارہ سو برس تک آٹھ سو میدانوں میں آزمایا اور ہر جگہ دشمن کی دس بیس، چالیس اور پچاس گنا فوج کو پیس کر رکھ دیا۔ آج جب کہ بھارت اور امریکہ جیسی مہیب طاقتوں سے مقابلہ ہے اور کسی زمینی

طاقت سے ہمیں امداد کی کوئی امید نہیں تو ہمارا بچاؤ اسی میں ہے

۱۔ کہ اللہ کے سامنے جھک جائیں، صلوٰۃ قائم کریں۔

۲۔ اپنا اخلاق و اعمال کو پاکیزہ بنائیں۔

۳۔ جام و ساغر توڑ ڈالیں اور عیاشی و اوباشی کا سلسلہ ختم کر دیں اگر یہ نہ ہوا تو روحانی قوت کے ذخائر نہ ہونے کی وجہ سے بھارتی ڈنڈے ہماری بستیوں میں داخل ہو جائیں گے اور تلوار کو اسی وقت نیام میں ڈالیں گے جب یہاں کے کروڑہا مسلمانوں کی لاشیں۔ کتوں، بھیڑیوں اور گدھوں کی خوراک بن چکی ہوں گی اور پیچھے صرف ہماری نوجوان بیٹیاں رہ جائیں گی جن سے درندے بدکاری کریں گے۔

## شرابی اپنی قوم کا لہو پیتا ہے

شرابی قوم کا اخلاق بگاڑتا، خواتین کی آبرو لوٹتا اور غیرت و حمیت کا جنازہ نکالتا ہے وہ ملک و ملت کی خاطر کبھی نہیں لڑ سکتا۔ مجھے ایک دوست نے جو جنگ کشمیر میں شامل تھا بتایا کہ وہاں ایک شرابی افسر بھی پہنچا۔ شام کو شراب پی کر لاف زنی کرتا رہا لیکن دوسری صبح جب محاذِ جنگ پہ پہنچا اور پہلی توپ چلی تو بھاگ نکلا خوف سے پتلون بھیگ گئی۔ جوتے راہ میں پھینک گیا۔ اور سترہ میل دور ایبٹ آباد میں جا دم لیا۔ اگر ایک فوج میں سپاہی اور افسر سب شرابی ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ ملک کا دفاع کبھی نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شرابی قوم کا لہو پیتا ہے یہ بات ایک اور پہلو سے بھی درست ہے۔ کہ ایک چرواہا ایک بکری چار سال تک۔ گرمی، سردی، بارشوں اور طوفانوں میں جنگلوں وادیوں اور پہاڑوں میں چراتا ہے۔ بالآخر وہ ذبح ہوتی ہے اور اس کی کھال بیچ کر ہم صرف دو شلنگ زرِ مبادلہ

کماتے ہیں۔ شراب کی ایک بوتل نوتے شلنگ میں آتی ہے۔ جسے دو شرابی ایک ہی شام کو پی جاتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ اس بوتل کے اجزاء کیا ہیں ؟

پینتالیس بجریوں کا لہو، پینتالیس چرواہوں کا خونِ گرم پسینہ اور دوڑ دھوپ، غریب کی محنت کا یہ ناجائز استعمال اور غیر ملکی زر (جس سے ہم وسائل معاش و قوت خرید سکتے ہیں) کا یہ عیاشیانہ صرف ایک خوفناک قومی جرم ہے ؞

ایک مرتبہ حضور صلعم کے پاس ایک بدوی قبیلہ کے چند سردار آ کر کہنے لگے۔ کہ حضورؐ! ہمارے ہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ اس لیے ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دو۔ حضور پرنورؐ کی یہ سخت گیری محض اس وجہ سے تھی کہ شراب اور اسلام کا اجتماع ناممکن ہے۔ اسلام معاشرے میں پاکیزگی، توازن، غیرت، جانفروشی، ایثار اور بے نفسی اور دیگر بلند اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور شراب ان تمام اوصاف کی دشمن ہے ؞

بالآخر مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے۔ کہ اے میرے مقدس وطن کے پاک لوگو! اپنے مستقبل کو سوچو، اپنی بیٹیوں اور بہنوں پہ رحم کھاؤ۔ اللہ کی پناہ میں آؤ، اور جام و مینا توڑ دو۔ کہ تمھاری نجات اسی میں ہے۔

# شیعہ و سنی کو دعوتِ اتحاد و محبت

مغربی پاکستان۔ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا۔ کہ یہاں کوئی قوم موجود نہ تھی اور اسی لیے حکومت فرقہ دارانہ مسائل کی الجھنوں سے آزاد تھی۔ لیکن ہماری بدبختی دیکھئے کہ خود مسلمانوں میں پھوٹ پڑ رہی ہے۔ اور شیعہ سُنّی اختلافات ایک خوفناک صورت اختیار کر رہے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ اگر ہمارے ادیبوں، مدیروں، راہنماؤں اور دیگر بہی خواہانِ ملک و ملت نے اِس مسئلے کی طرف فوری توجہ نہ کی تو ہمارا وقار ختم ہو جائے گا۔ ہماری طاقت ٹوٹ جائے گی۔ اور بھارت کے پچاس کروڑ افراد ہم پر قہقہے لگائیں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ شیعہ و سُنی کن چیزوں پر متفق ہیں اور اختلاف کہاں ہے؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ مجھے ان میں اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم نظر آتا ہے۔ دونوں کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک، تہذیب ایک، معاشرت ایک۔ اہلِ بیت سے محبت دونوں کا ایمان۔ یزید پر لعنت بھیجنے میں دونوں ہم زبان، دونوں نے اسلامی کلچر کی پیش رفت میں نمایاں حصہ لیا۔ اگر فخر الرازی، ابن تیمیہ، ابن قیم، امام غزالی، اور ابن العربی جیسے ہزار ہا سُنّی علماء کے کارنامے قابلِ صد ستائش ہیں تو یقین جانیے کہ شیعی فضلاء کی ثقافتی کوششیں بھی اپنے بڑے بھائیوں سے

کسی پہلو کم نہ تھیں. علمِ عروض کے موجد خلیل ابن احمد، علم النحو کے واضع ابوالاسود دوٴلی شیعہ تھے۔ جن شیعہ علماء نے علم الکلام کی تدوین و توسیع میں حصّہ لیا۔ ان میں سے ابوہاشم بن محمدؐ بن حنیفہ، عیسٰی بن روضہ، قیس الناصر، محمدؐ بن علی احول، ہشام بن حکم سکاک البغدادی، ابو مالک ضحاک حضرمی، ہشام بن سالم اور یونس بن یعقوب۔ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ سیرت نگاروں میں ابان بن عثمان الاحمر، ہشام بن محمد محمد بن سائب، الکلبی اور محمدؐ بن اسحاق مطلبی ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مؤرخین میں بھی کافی تعداد شیعوں کی تھی مثلاً کتاب "المحاسن" کے مصنّف احمد بن محمد بن خالد "الیعقوبی" کے مصنّف احمد بن یعقوب "مروج الذہب" کے مصنف المسعودی "آداب السلطانیہ" کے مصنّف محمد بن علی بن طباطبا، نیز نصیر بن مزاحم منقری، ابراہیم بن محمدؐ بن سعد ثقفی اور دیگر سینکڑوں افاضل جنھیں یہاں درج کرنا باعثِ طوالت ہے:

شعر و ادب میں بھی شیعہ سنیوں سے پیچھے نہ تھے۔ نابغہ جعدی اور عروہ بن زید اپنے زمانے کے مشہور رجز گو تھے اور حضرت علیؑ کی طرف سے جنگ صفین میں شامل ہوئے تھے ان کے علاوہ ابوطفیل عامر بن وائلہ، کعب بن زہیر، دربارِ اموی کا مشہور شاعر فرزوق اور تیسری صدی کے مشہور شعرا مثلاً ابونواس، ابو تمام، دعبل خزاعی حسین بن ضحاک، ابن رومی، اشجع سلمی اور محمد بن وہب سب شیعہ تھے۔ اگر تیسری صدی سے لیکر آج تک شیعہ شعرا و ادبا کی فہرست مرتّب کرنے لگیں تو شاید دس جلدیں بھی بھر جائیں، مشہور شیعہ تاجداروں، سیاستدانوں اور وزیروں کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مشہور البرامکہ یعنی خالد، یحییٰ، جعفر اور فضل اور مامون الرشید

کے دو مشہور وزیر فضل بن سہل اور حسن بن سہل شیعہ تھے۔ مقتدر باللہ کا وزیر حسن بن علی رکن الدولہ دیلمی کا وزیر ذوالکفایتین اور صاحب بن عباد جیسے بلند پایہ مدبر بھی شیعہ تھے۔ گزشتہ زمانے کو چھوڑیئے اور عصرِ رواں کو دیکھئے۔ یہاں بھی آپ کو چند ایسے افراد ملیں گے جن میں سے کچھ عقیدۃً شیعہ تھے جسٹس امیر علی اور حضرت قائد اعظمؒ۔ اور بعض حضرت علیؑ کو اصحابِ ثلٰثہ سے افضل سمجھتے تھے۔ مثلاً حکیم مشرق علامہ اقبالؒ اور غالبؔ۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے عظیم کارناموں پر شیعہ و سنی ہر دو کو ناز ہے اور جن کی تخلیقات دونوں فرقوں کی مشترک علمی و ثقافتی میراث ہے۔

جغرافیائی وحدت ایک زبردست رشتہ ہے۔ جو مختلف مذاہب کے افراد کو ایک قوم بنا دیتا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور رشتہ لسانی وحدت ہے۔ لیکن ان سب سے قوی تر مذہب کی حبل المتین ہے جو سفید و سیاہ اور ترکی و ایرانی کے تمام امتیازات مٹا دیتی ہے، شیعہ و سنی میں صرف مذہبی وحدت ہی نہیں بلکہ نسلی ثقافتی اور معاشرتی وحدت بھی پائی جاتی ہے۔ حیرت ہے کہ واعظین کو یہ تمام وحدتیں نظر نہیں آتیں اور وہ گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کے لیے مختلف قسم کے خیالی اختلافات تراشتے رہتے ہیں۔

## اختلافات

بعض لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شیعہ سنی کا اختلاف اصولی ہے اور دونوں فرقے اسلام کے تمام اصولوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے شدید اختلاف ہے۔ اسلام کے اصول کیا ہیں؟

یہی توحید، نبوت، آخرت، ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا، فرائض خمسہ یعنی صلوٰۃ وصوم وغیرہ کو ادا کرنا۔ گناہ سے بچنا اور صالحات پر عمل کرنا۔ اسلام کی اصولی تعلیم یہی ہے ہے کوئی ایسا شیعہ یا سُنی جو اِن میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہو؟ اگر کوئی نہیں تو پھر ان دونوں میں اصولی اختلاف کیسے ہو گیا۔

رہی یہ بات کہ شیعہ کی اذان سنیوں سے مختلف ہے یا وہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور ایسی ہی چند اور باتیں۔ تو یہ سب اختلافات جزوی اور فروعی ہیں ان کا اصولی عقائد و اعمال سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ "قرآن" نے نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں بتایا۔ اور نہ اذان کی صورت متعین کی ہے۔ عبادت کا تعلق دل سے ہے۔ اگر نمازی اللہ کے حضور میں گڑگڑانے، اس کی رحمت و مغفرت طلب کرنے اور اپنی غلط کاریوں پر چند آنسو بہانے آتا ہے، تو پھر ہاتھ چھوڑنے، یا ناف و سینہ پہ باندھنے سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس قسم کے اختلافات تو خود سنیوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، امام مالکؒ اور اور احمد بن حنبلؒ کی فقہ اس قسم کے اختلافات سے لبریز ہے۔ کتنے ہی ایسے کلامی مسائل ہیں جن میں قتل و قتال، اور کفر و تفسیق تک نوبت پہنچی۔ مثلاً ابن العربی کا مسئلہ وحدۃ الوجود۔ امام بن حنبل کا نظریہ کہ قرآن غیر مخلوق ہے اور امام ابن تیمیہ کا عقیدہ کہ خدا جسم رکھتا ہے اور عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور اسی قسم کے لاتعداد دیگر مسائل۔ رسول کریم صلعم کے عالم الغیب ہونے نہ ہونے پہ بحث آج بھی جاری ہے اور مُردوں سے امداد طلب کرنے کا مسئلہ آج بھی وجہ پرخاش بنا ہوا ہے۔ جب ان نزاعی مسائل کے باوجود ایک عقیدہ کے سُنی، دوسرے عقیدہ کے سُنیوں کو ایک

الگ مذاہب کے پیرو نہیں سمجھتے تو پھر چند فروعی اختلافات کی بنا پر شیعوں کو کیوں
الگ فرقہ خیال کیا جائے۔

اس سے انکار نہیں کہ شیعوں کا عقیدۂ امامت ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے
ان کا ایمان ہے کہ امام کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اور یہ کہ بارھویں امام حضرت
مہدیؑ قیامت سے پہلے دوبارہ تشریف لائیں گے۔ یہ عقیدہ بھی وجہ اختلاف
نہیں ہو سکتا۔ گو اہلِ سنت اِس اصول کے قائل نہیں تاہم وہ ہر زمانے میں ان تمام
ائمہ کا بے حد احترام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اُمیہ اپنے سو سالہ جابرانہ دورِ
حکومت اور عباسیہ اپنے پانچسو برس کے طویل عرصے میں کسی سُنّی سیرت نگار سے
ایک لفظ تک ان آئمہ کرام کے خلاف نہ لکھوا سکے۔ شیعہ انھیں عقیدتاً اور سُنّی
علم و تقویٰ کی بناء پر اپنا سردار، راہنما، مُرشد اور امام سمجھتے ہیں۔

رہے امام مہدیؑ تو اُن کی دوبارہ آمد کی بشارت سے سنیوں کی تمام کتب
احادیث بھری پڑی ہیں۔ اور دونوں نہایت بے چینی سے اُن کے منتظر ہیں۔ اگر
حضرت امام موسیٰ رضا کو اس زمانے کے بعض آدمیوں نے تسلیم نہیں کیا، یا دکھ دیا
تھا تو اس کی ذمہ داری آج کے سُنیوں پر عائد نہیں ہوتی۔ کیونکہ آج کا سُنی۔ خاندانِ
نبوت کے ان شہزادوں سے اتنی ہی عقیدت و محبت رکھتا ہے۔ جتنی کہ کوئی شیعہ۔
گو مسئلہ امامت ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس پر عملاً شیعہ و سُنی دونوں
متحد ہیں۔

## اصحابِ ثلٰثہ

جو مسئلہ آج ان دونوں فرقوں میں تلخی پیدا کر رہا ہے وہ اصحابِ ثلٰثہ کا ہے

سُنی ان اصحاب کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ لیکن شیعوں کا خیال یہ ہے۔

۱۔ کہ حضرت حضورِ اکرم صلعم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کا حق تھا جس پر یہ حضرات زبردستی قابض ہو گئے۔

۲۔ کہ ان کے تعلقات حضرت علی سے مُعاندانہ تھے۔

شِقِ اوّل ــــــــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافت پر حضرت علیؓ کا حق یہ کیسے تھا؟

اس کے جواب میں شیعہ علماٴ حدیث ذیل پیش کرتے ہیں۔

"جب حضور صلعم آخری حج سے لَوٹے اور ایک مقام "غدیرِ خم" پر قیام فرمایا تو صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاہُ۔"

ترجمہ:۔ اے مسلمانو! کیا تم مجھے اپنی جانوں سے زیادہ محبوب نہیں رکھتے؟ جواب ملا - ضرور۔ پھر فرمایا جس کا میں مولا ہوں علیؓ بھی اس کا مولا ہے۔ اے اللہ! جو علی سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت کر اور جو اس سے دشمنی کرے۔ تو بھی اُس سے دشمنی کر۔

علمائے شیعی کا استدلال یہ ہے کہ اس اعلان کی رُو سے حضور صلعم نے حضرت علیؓ کو نامزد کر دیا تھا۔ اور یہاں مولیٰ کے معنی امیر سردار اور مالک کے ہیں۔ اس کے جواب میں سُنی علما یہ کہتے ہیں کہ "مولیٰ" بیس مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے:۔

مالک، سردار، آزاد کردہ غلام، انعام دینے والا، انعام پانے والا، ــ

محبت کرنے والا، ساتھی، دوست، حلیف، پڑوسی، مہمان، حصہ دار
بیٹا، چچے کا بیٹا، بھانجا، چچا، داماد، رشتہ دار، والی تابعدار۔

(قاموس۔ المنجد!)

اور ہر جگہ اِس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے حدیثِ زیرِ بحث میں چار لفظ ایسے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اولیٰ۔ مولیٰ والِ۔ والا جن کا مادہ یا ماخذ "ولی" ہے۔ "اولیٰ" یہاں محبوب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وال کے معنی "محبت کر" اور والا کے معنی "محبت کی"۔ پس "مولیٰ" کے معنی بھی دوست، اور محبوب ہی ہو سکتے ہیں۔ اور حدیث کا ترجمہ یوں ہوگا۔

"۔۔۔۔ میں جس کا محبوب ہوں۔ علی بھی اُس کا محبوب ہے"

علماء سنت کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر رسول صلعم نے واقعی حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کیا ہوتا۔ تو وہ پیروانِ رسولؐ جو رسولؐ کے ایک اشارے پر سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ رسولؐ کے اس اہم ارشاد کی بھی لازمی تعمیل کرتے اور حضرت صدیقؓ کو کبھی مسندِ خلافت پہ نہ بیٹھنے دیتے۔ خود علیؓ اُس ظلم پر اُسی طرح تلوار سونت لیتے۔ جس طرح حضرت امام حسینؓ نے یزید کے خلاف سونت لی تھی۔ اور ان حضرات کو نہ تو مشوروں سے نوازتے اور نہ بیعت کرتے۔

اِس موضوع پر خود امیر المومنین حضرت علیؓ کا قول فیصلہ کن ہے:
فرماتے ہیں:۔

"اِنَّمَا الشُّوْرَیٰ لِلْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَسَمُّوْہ"

اِنّمَا کَانَ ذَالِکَ لِلّٰہ رِضیً ۔۔ ۔۔ ۔۔ (نہج البلاغت ج ۲ ص ۸)
(شوریٰ مہاجرین و انصار کا حق ہے۔ اگر وہ کسی شخص کو متفقہ طور پر اپنا امام بنا لیں۔ تو اللہ کی رضا بھی یہی ہوگی۔)

یہاں یہ بھی سوچنا ہے کہ حضرت فاروق و صدیقؓ نے مسندِ خلافت کو غصب کر کے کون سا فائدہ اٹھایا۔ کیا دنیا جمع کی جاگیریں سمیٹیں یا محل بنوائے؟ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ وہی مٹی کے کچے جھونپڑے۔ سو سو پیوندوں والے کرتے رات بھر کے پہرے، بیواؤں، یتیموں اور غریبوں کی پرورش، جہاد، سلطنتِ اسلامی کی توسیع اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت دو خالی ہاتھ۔ حضرت علیؓ کے اپنے ارشاد کے مطابق مہاجرین و انصار نے ان حضرات کو اپنا سردار چن لیا تھا اور کچھ عرصے کے بعد حضرت علیؓ نے بھی بیعت کر کے اس جھگڑے کو ختم فرما دیا تھا۔ اگر فی الحقیقت حضور صلعم نے حضرت حیدرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا ہوتا۔ تو مہاجرین و انصار کی بہت بڑی جماعت خلافتِ صدیقؓ کی مزاحمت کرتی۔ آخر وہ لوگ زبردست ایمان و جرأت کے مالک تھے، خدا اور رسول کی محبت میں سرشار تھے زندگی سے متنفر اور موت سے محبت کرنے والے تھے۔ لڑنا۔ مرنا۔ مارنا پشتوں سے چلا آتا تھا۔ وصیتِ رسول کی صریحاً توہین ہو رہی ہو۔ اور شمعِ نبوت کے پروانے خاموش رہیں؟ عقل تسلیم نہیں کرتی۔ تیس برس بعد جب معاویہ نے غصبِ خلافت کی کوشش کی تو امیر المومنین حضرت علیؓ نے ذو الفقار سونت کی اور صفین کا میدان مددگارانِ معاویہ کے لہو سے رنگین کر دیا۔ بیس برس بعد جب انتخاب و استحقاق کے بغیر یزید مسندِ رسول پر قابض ہو گیا۔ تو فاطمۃ الزہراؓ کا لختِ جگر

سارے کے سارے خاندان کو لے کر کربلا کی طرف چل دیا۔ خانوادۂ رسالت کے اس غیور شاہزادے نے سارا خاندان کٹا دیا۔ خود جسدِ مبارک پر چھیانوے زخم کھائے۔ اور بالآخر سر دے دیا لیکن غاصب کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر حضرت صدیقؓ بھی غاصب ہوتے تو فاتح خیبر یوں آسانی سے توہینِ رسالت کو برداشت نہ فرماتے۔ اگر اور کچھ نہ سکتے تو اپنے نورِ نظر کی طرح مدینہ کو کربلا میں تبدیل دیتے۔

ایک اور بات بھی سوچنے کے قابل ہے۔ کہ خم غدیر والے خطبے کے بعد حضور صلعم تین ماہ تک بقیدِ حیات رہے۔ اگر "مَن کُنتُ مَولَاہُ" میں "مولا" سے مراد جانشین ہوتا۔ تو حضورِ پرنور اس کی تائید میں ایک آدھ جملہ تو اور ارشاد فرماتے۔ لیکن تاریخ و حدیث کا سارا ذخیرہ اس قسم کے تائیدی جملے سے خالی ہے اور غالباً شیعی احادیث میں بھی کوئی ایسا مقولہ موجود نہیں۔ بات یہ ہے کہ "اَمرُھُم شُورٰی بَینَھُم" (مسلمانوں کی حکومت باہمی مشورے سے طے ہونا ہے) کی آیت نازل ہو چکی تھی۔ اور حضور صلعم نامزدگی کی ضرورت ہی محسوس نہیں فرماتے تھے۔ درست فرمایا تھا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے :-

"شوریٰ انصار و مہاجرین کا حق ہے۔ وہ جس شخص کو بھی اپنا امام منتخب کر لیں اللہ کی رضا بھی اسی میں ہوگی ——————"۔

## خلفائے اربعہ کے باہمی تعلقات

اس میں کلام نہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مسند نشینی کے وقت

حضرت علیؓ کچھ دل برداشتہ سے ہو گئے تھے۔ آپ نے چند ماہ تک بیعت نہیں کی تھی۔ اور اس خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں حضرت علیؓ کی علیحدگی اسلام کی آہنی دیوار میں کوئی شگاف نہ ڈال دے۔ ایک موقعہ پر حضرت فاروقؓ نے دھمکی سے بھی کام لیا۔ لیکن تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس مختصر سی شکر رنجی کے بعد جو حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کی رحلت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی، پچیس برس تک ان حضرات کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے اور خوشگوار کیوں نہ ہوتے کہ اسلام کی حبلِ متین کے علاوہ قرابتوں کے بندھن میں بھی بندھے ہوئے تھے۔ صدیقؓ و فاروقؓ حضورؐ کے سسر تھے اور عثمانؓ و علیؓ داماد۔ حضرت صدیق کی وفات کے بعد آپ کی ایک بیوہ اسماءؓ بنت عمیس سے حضرت علیؓ نے شادی کر لی تھی۔ اور حضرت علیؓ نے اپنی ایک بیٹی — اُمّ کلثومؓ جو حضرت فاطمۃ الزہرہ کے بطن سے تھی۔ حضرت عمرؓ کو دے دی تھی جب ایران فتح ہوا اور شہنشاہِ ایران کی ایک دختر فاروقِ اعظمؓ کے سامنے لائی گئی تو آپ نے یہ شہزادی خاندان نبوّت کے جلیل القدر شہزادے یعنی امام حسینؓ کو دے دی اور اُس کا نام جہان شاہ سے شہر بانو رکھا۔ یہی وہ عظیم المرتبت خاتون ہے۔ جس کے بطن سے امام زین العابدین پیدا ہوئے تھے۔

اگر یہ خلفاء غاصب ہوتے تو خاندان نبوّت کا یہ بطلِ جلیل جس نے چند برس بعد اسی قسم کے تنازعے میں سارا خاندان کٹا دیا تھا۔ غاصبوں کے ہاتھ سے کوئی تحفہ کبھی قبول نہ کرتے پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کے گھر کو باغیوں نے گھیر لیا اور پانی بند کر دیا تو خلیفہ کی امداد سب سے زیادہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے کی تھی۔

ہر دور میں مسلمان کو خاندانِ رسالت سے انتہائی عشق رہا۔ اس کے اظہار کی ایک صورت یہ بھی اختیار کر گئی کہ بچوں کے نام سادات کے نام پر رکھے گئے۔ ہمارے حسنوں۔ علویوں۔ محمدوں کو آج شمار کرنا مشکل ہے۔ لیکن ظالم اور غاصب یزید کا نام ساری ملّتِ اسلامیہ میں شاید ہی پھر کسی نے رکھا ہو اگر اصحابِ ثلٰثہ بھی غاصب ہوتے تو یزید و شمر کی طرح ان کے نام بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتے۔ لیکن سادات کے بعد دوسرے درجے کی مقبولیت ان ناموں کو حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت علی نے ایک صاحبزادے کا نام جو لیلیٰ بنت مسعود کے بطن سے تھا۔ ابوبکر رکھا ایک اور بیٹے کا نام جو جیبہ بنت ربیعہ سے تھا عمرؓ رکھا۔ نیز ایک صاحبزادے کا نام جو امّ البنینؓ بنت حزم کے بطن سے تھے عثمانؓ تجویز فرمایا اسی طرح امام حسنؓ کے ایک بیٹے کا نام ابوبکر اور دوسرے کا عمر تھا یہ دونوں معرکہ کربلا میں شہید ہوئے تھے امام زین العابدین کے ایک بیٹے کا نام عمر تھا اور امام باقر کے ایک صاحبزادے سید قاسم کا عرف بھی عمر تھا۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ ہم انہی بزرگوں کے نام اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔ جن سے ہم محبت کرتے ہوں یہ ایک واقعہ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اصحابِ اربعہ کے باہمی تعلقات نہایت گہرے اور انتہا درجہ کے خوشگوار تھے۔

نہج البلاغہ میں جو حضرت علی کے خطبات کا مجموعہ ہے متعدد ایسے واقعات درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ ثلٰثہ عموماً اور حضرت فاروق خصوصاً تمام معاملات میں حضرت علی سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ جب حضرت فاروق نے اسلامی افواج روم کی طرف بھیجیں تو فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ خود ساتھ جائیں یا نہ۔ حضرت علیؓ

سے مشورہ لیا تو انھوں نے فرمایا،

فلم رو اسلام کو غلبۂ دشمن سے بچانے والا اور مسلمانوں کی آبرو کا ضامن و کفیل اللہ ہی ہے۔ اللہ نے انھیں اس وقت فتح دی۔ جب ان کی تعداد نہایت قلیل تھی...... اگر آپ خود ساتھ گیے اور ہلاک ہو گئے تو پھر مسلمانوں کو کہیں پناہ نہیں ملے گی...... اگر آپ یہاں موجود ہوں گے تو مسلمانوں کی پناہ اور ڈھارس ثابت ہوں گے۔ [نہج البلاغۃ ص ۳۲۵]

جنگ ایران کے موقعہ پر بھی حضرت علیؓ نے یہی مشورہ دیا تھا لیکن الفاظ یہ ہیں کہ سردار کا مقام رشتہ مروارید کی طرح ہے جو تمام دانوں کو ایک نظام میں منسلک رکھتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو موتی بکھر کر دانہ دانہ ہو جاتے ہیں۔

[نہج البلاغۃ ص ۳۲۵]

حضرت حیدر کرار کے یہی وہ زریں مشورے تھے جس کی افادیت کے پیش نظر کئی مرتبہ حضرت فاروق نے فرمایا تھا۔ لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَر۔ (اگر علی نہ ہوتے تو عمر تباہ ہو جاتا۔) اور وزیری و مشیری کا بھی وہ مقام تھا جس کے متعلق ایک مرتبہ جناب مرتضیٰ نے فرمایا تھا (انا لکم - وزیرا خیر لکم منی امیرا)

نہج البلاغہ ص ۲۱۹

(میرا وزیر رہنا تمہارے لیے امیر ہونے سے بہتر ہے)

## مدح و قدح کا آغاز

حضرت علی کی شہادت کے بعد جب عنانِ حکومت معاویہ کے ہاتھوں میں آئی تو آپ نے حکماً حضرت علی پر محراب و منبر سے لعنت بھیجنے کا سلسلہ جاری کر دیا

اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ محبانِ علی نے خلفائے ثلثہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں خارجیوں کا گروہ پیدا ہو گیا۔ جو حضرت علی اور معاویہ دونوں کو بُرا بھلا کہتا تھا خارجی ختم ہو گئے اور خاندانِ اُمیّہ کے ساتھ ہی اہل بیت کے خلاف لعن طعن کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ لیکن بعض حلقوں میں قدح صحابہ کا سلسلہ ابھی تک باقی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ہر عشرہ محرم میں بہی خواہانِ ملّت کے لیے باعثِ تشویش بن جاتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس چیز کا ذمہ دار کون ہے جہاں تک عوامِ شیعہ کا تعلق ہے وہ امام باڑہ میں حضرت شہیدِ اعظم کے پاکیزہ سوانح اور مرثیے سننے جاتے ہیں۔ انہیں کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تعلیم یافتہ شیعہ رد و قدح کو معیوب سمجھتے ہیں اور انھیں شدید احساس ہے کہ اس چیز کے نقصانات بے شمار ہیں۔ لیکن فائدہ کوئی نہیں۔ شیعوں کا بلند تر طبقہ ہر زمانے میں اصحابِ ثلثہ کا مداح رہا۔ عصرِ حاضر کے روشن خیال عالم و مفکر جسٹس سید امیر علی کی کتاب "ہسٹری آف سیرسینز"۔ صدیقؓ و فاروقؓ کی تعریف سے لبریز ہے خود حضرت علی ان کے مداح رہے ہیں۔ حضرت علیؓ ایک خط میں امیر معاویہ کو لکھتے ہیں۔

بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوھم علیہ فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یرد

(نہج البلاغت ج ۲ ص۸۔)

[میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنھوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ سے بیعت کی تھی اور پھر اسی بات پر کی ہے جس پر ان کی بیعت ہوئی تھی پس کسی حاضر یا غیب کو یہ بیعت مسترد کرنے کی اجازت نہیں]

امیر المومنین کا یہ جملہ کہ انصار و مہاجرین نے میری بیعت اسی بات پر کی ہے جس پر خلفائے ثلثہ نے کی تھی۔ صاف صاف اعلان ہے اس حقیقت کا کہ حضرت علی ان خلفاء کی خلافت اور بیعت کو اتنا ہی صحیح و جائز سمجھتے تھے۔ جتنا کہ اپنی خلافت و بیعت کو۔

حضرت امام حسن عسکری کی تفسیر ص ۱۳۱ میں حضور پر نور کی ہجرت کا واقعہ یوں درج ہے:۔

"جبرئیل علیہ السلام حضورؐ پہ نازل ہوئے اور کہا کہ ابوجہل اور چند قریش آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اس لیے آپ ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر روانہ ہو جائیں۔ حضورؐ نے ابوبکرؓ سے پوچھا آپ نے عرض کی اگر آپکی محبت میں عمر بھر عذاب اور دکھ پہنچتا رہے تو میرے لیے یہ دنیا کی شہنشاہی سے بہتر ہے۔ یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ کو علم ہے کہ تیرا دل اور تیری زبان ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔

جُعلت منی بمنزلۃ السمع والبصر والرأس من الجسد و بمنزلۃ الروح من البدن"

خدا نے تیرا تعلق مجھ سے وہی قائم کیا ہے جو کان، آنکھ اور سر کا جسم سے اور روح کا بدن سے ہے۔" ...... ملخص ا

شیعوں کی ایک مستند کتاب تفسیر قمی ص ۱۵۷ میں حضرت امام جعفر کی یہ روایت درج ہے فرماتے ہیں:۔

جب حضور غارِ ثور میں تھے تو ابوبکرؓ سے فرمایا کہ میں جعفر اور اس کے ساتھیوں کی کشتی کو دیکھ رہا ہوں جو دریا میں کھڑی ہے۔ نیز انصارِ مدینہ کو دیکھ رہا ہوں

جو گھروں میں بیٹھے ہیں ...... ابو بکر نے کہا حضور مجھے بھی یہ منظر دکھایئے
فمسح علیٰ عینیہ فرانھم فقال لہ انت الصدیق
"حضور نے ابو بکرؓ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں بھی وہ سب کچھ نظر آگیا۔ اور پھر فرمایا۔ ابو بکر! تو صدیق ہے" ...... (ملخص)

فروع کافی میں ایک طویل حدیث وارد ہوئی ہے جس کے راوی امام جعفر صادق ہیں۔ اس میں حضرت ابو بکرؓ، ابو ذر اور سلمان فارسیؓ کا بھی ذکر ہے۔ پہلے حضرت ابو بکرؓ کا نام آتا ہے پھر حضرت سلمانؓ کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے"

"ثم من علمتم بعدہ فی فضلہ وزھدہ سلمان"

ابو بکرؓ کے بعد فضل و تقویٰ میں دوسرا درجہ حضرت سلمانؓ کا تھا" تینوں کا ذکر کرنے کے بعد امام صادق فرماتے ہیں:۔

"ومن اتقی من ھولاء"

(اور ان سے بڑا متقی کون ہو سکتا ہے؟)

حضرت امام باقر کا ارشاد ہے۔

لست بمنکر فضل ابی بکر ولست بمنکر فضل عمر ولکن

ابابکر افضل۔ [کتاب احتجاج ص۲۰۲]

(میں ابو بکرؓ و عمرؓ کے فضائل کا منکر نہیں بلکہ میں یہ تو کہتا ہوں کہ ابو بکر افضل تھے)

شیعہ بھائیوں کی ایک اور معتبر کتاب۔ کشف الغمہ میں یہ روایت درج ہے

"حضرت امام باقر سے کسی نے پوچھا کہ تلوار کو مرصع کرنے کی اجازت ہے یا نہیں
"اجازت ہے کیوں کہ ابو بکر صدیق نے تلوار کو مرصع کیا تھا" سائل نے کہا"

کیا آپ ابوبکر کو صدیق سمجھتے ہیں حضرتِ امام غصے میں اپنی جگہ سے اٹھے اور تین مرتبہ۔ اچھا صدیق۔ اچھا صدیق (نِعمَ الصدیق) کا فقرہ دہرایا اور آخر میں فرمایا

فَمَن لَم یَقُل لَہُ الصدیق فلا صدّق اللہ قولہ فی الدنیا والاخرۃ

[کہ جو شخص ابوبکرؓ کو صدیق نہ کہے، خدا اُسے دنیا و آخرت میں جھوٹا کرے!]

کتاب احتجاج طبری میں بروایت علی مرتضےٰ درج ہے:

"کہ ہم حضور صلعم کے ساتھ جبلِ حرا پہ کھڑے تھے کہ پہاڑ ہلنے لگا، حضور نے فرمایا! ٹھہر جا کہ تجھ پر نبیؐ، صدیقؓ اور شہید کے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

مُلا باقر مجلسی نے امام باقر کی یہ روایت درج کی ہے۔

انّ رسول اللہ صلعم قال اللّٰھم اعزّ الاسلام بعمر بن الخطاب او بابی الجہل بن ھشام۔

کہ حضورِ پر نور یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ عمر بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام کو مسلمان بنا کر اسلام کی عزت اور شان میں اضافہ کر۔

[بحار الانوار ج ۴ کتاب السماء والعالم]

فروع کافی کی تیسری جلد ص۱۵۱ پر واقعہ حدیبیہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب حضور نے حضرت عثمان کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجا اور کفار نے انھیں قید کر لیا تو حضور نے سب سے بیعت لی اور وہ ضرب باحدی یدیہ علی الاخریٰ لعثمان و قال المسلمون طوبیٰ لعثمان۔ اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر فرمایا کہ بیعت عثمان کی طرف سے ہے اس پر تمام مسلمانوں نے کہا۔ عثمان کو بشارت:۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ حضرت عثمان کے ہاں کسی سفارش کے سلسلے میں گئے وہاں

حضرت علی نے حضرت عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ہماری طرح حضورپرنور کی صحبت میں رہے ابوبکر و عمر آپ سے زیادہ متقی نہیں تھے۔ پھر آپ حضور سے زیادہ قرابت رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ :-

قد نلت من صهره ما لم ينالا

کہ آپ کو داماد ہونے کی وہ عزت حاصل ہے۔ جو صدیق و فاروق کو حاصل نہ تھی

[ نہج البلاغت طبع مصر ج اول ص۳۷۳ ]

ان روایات کے علاوہ شیعہ بھائیوں کی دیگر اہم کتابیں ان صحابہ کی مدح و ثنا سے پر ہیں۔

مگر ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ میری درج کردہ روایات سب کی سب جعلی اور سنیوں کی وضع کردہ ہیں۔ پھر بھی عشرہ محرم میں اصحاب ثلثہ کے خلاف کچھ کہنا نہ تو قرآن کی بلند اخلاقی تعلیم کی رو سے جو بتوں کو بھی گالیاں دینے سے روکتی ہے جائز ہے اور نہ ہماری ملی وحدت کے لیے مفید ہے دنیا کے چالیس کروڑ سنی مسلمان خلفائے ثلاثہ کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان پر زبان طعن کھولنے سے چالیس کروڑ دل بے چین ہو جاتے ہیں۔

ہندؤں کو دیکھئے کہ گائے کو ماتا سمجھتے ہیں اس کا دودھ اور کبھی کبھی پیشاب بھی پی جاتے ہیں۔ اس کے گوبر سے چکن کے صحن کو پوتر بناتے ہیں اس کی کھال کے جوتے پہنتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی منچلا گائے کی ہڈی ان کے مندر میں پھینک دے تو سارے گاؤں کے مسلمانوں کو زندہ جلا دیتے ہیں۔ گائے زندہ ہو تو ماتا اور معبود مر جائے تو پلید و مردود۔ یہ سب پراپیگنڈہ کی بوالعجبیاں ہیں رشید منشی ناگی نے

اپنے پتر ہری رام کو کہا۔ "بٹیا گاؤ ماتا کی ہڈی اور ماس سے سارا گھر بھرشٹ ہو جاتا ہے" اور یہ جملہ اتنی مرتبہ دھرایا گیا۔ کہ یہ عقیدہ اس کا ایمان بن گیا۔ اب کوئی لاکھ کہے کہ لالہ جی! پوری گائے گھر میں بندھی ہو تو باعثِ رحمت و برکت اور اگر اس کا کوئی حصّہ چار دیواری میں آگرے تو سارا گھر ناپاک۔ یہ کیا؟ لالہ جی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

مسلمان مزدور اور راج ہندؤوں کے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ مسلمان کسان انھیں غلّہ دیتے ہیں جسے مسلمان مزدور مشینوں پر پیستے ہیں۔ کنواں مسلمان کھودتے ہیں۔ ہر چیز کو مسلمانوں کے ہاتھ لگتے ہیں۔ اور کوئی چیز ناپاک نہیں ہوتی لیکن جونہی کوئی شریمتی اس کنویں کا پانی اس گھڑے میں بھر لیتی ہے۔ جو نورے کمہار نے بنایا تھا۔ اور پھر کوئی مسلمان اس گھڑے کو چھو لیتا ہے تو سارا محلہ سنتا ہے یہ سب پراپیگنڈہ کی کارستانیاں ہیں۔ ایک مرتبہ ایک احمدی دوست سے مرزا صاحب کی نبوت پر بحث ہو رہی تھی۔ اور میں مرزا صاحب کے اقوال پیش کر رہا تھا۔ جن میں انھوں نے اپنی نبوّت کا انکار کیا تھا۔

وہ دوست زِچ ہو کر کہنے لگے۔ بھائی! مرزا صاحب کی رسالت کا عقیدہ ماں کے دودھ کے ساتھ میرے رگ و ریشہ میں داخل ہو چکا ہے۔ اب اگر حضرت مرزا صاحب بھی قبر سے اٹھ کر کہیں کہ دیکھو! میں نبی نہیں ہوں۔ تو میں انکار کر دوں گا۔

کسی حد تک یہی صورت مسئلہ زیرِ بحث میں بھی پائی جاتی ہے۔ تیرہ سو برس سے شیعہ واعظین اس بات پر زور دے رہے ہیں۔ کہ خلفائے اربعہ کے تعلقات آپس میں خراب تھے۔ اور اب تصوّرات یقینات کی صورت اختیار کر چکے ہیں

اب ہیں لاکھ کہوں کہ حضرت علی مرتضیٰؑ اور ان کی اولاد اصحاب ثلٰثہ کے متعلق نہایت بلند رائے رکھتی تھی اور ان کا بہت احترام کرتی تھی تو شیعوں کے بلند پ طبقے کے سوا شاید ہی میری بات کیطرف کوئی دھیان دے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ حضرات یہ تحریر پڑھتے ہی میرے ہم نوا بن جائیں۔ بلکہ صرف اتنی التماس کرتا ہوں کہ از راہ کرم ملت اسلامیہ کی وحدت، پاکستان کے استحکام اور بلند اخلاقی کو مدنظر رکھتے ہوئے عشرہ محرم میں علی الاعلان اصحاب ثلاثہ کی توہین نہ کریں کہ اس سے آپ کے چالیس کروڑ بھائیوں کی دل آزاری ہوتی ہے اور اس دل آزاری سے بگڑتا بہت کچھ ہے سنورتا کچھ بھی نہیں۔ رہا چھوٹے موٹے عقائد کا اختلاف تو یہ چیز آفرینش آدم سے چلی آتی ہے اور قیامت تک چلتی جائے گی:۔

میرا تعلق کسی عقائد سے نہیں۔ آپ جو عقائد چاہیں رکھیں۔ میں تو صرف اتنی سی بات کہہ رہا ہوں، کہ آیئے! حضرت شہید اعظم کی یاد کچھ اس طریقے سے منائیں کہ ہماری روحِ عمل بیدار ہو۔ ہمارے تعلقات ہر دو ملا سنوار ہوں اور ہم کندھے سے کندھا ملا کر اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر شاہراہ زندگی پر کچھ اس انداز سے آگے بڑھیں کہ ارض و سما پکار اٹھیں:۔

یہ ہیں پیروانِ محمدؐ اور محبانِ آلِ محمدؐ:۔

# ایک کارتوس ایک ہی دفعہ چلتا ہے

یہ تھا وہ جملہ جو ایک نوجوان افسر کے منہ سے نکلا اور ساتھ ہی کہا "اسلام کا کارتوس چل چکا ہے۔ اور اب یہ بیکار ہو گیا ہے۔" میں نے کہا "جی ہاں۔ کنوئیں کے پانی سے صرف ایک ہی بار پیاس بجھتی ہے۔ اگر کوئی پیاسا اسی کنوئیں پہ دوسری مرتبہ جائے تو کتنا ہی پانی پیئے اس کی پیاس دور نہیں ہو گی۔ کیونکہ کارتوس فقط ایک ہی دفعہ چلتا ہے۔" دیکھا آپ نے ہمارے یورپ زدہ نوجوان اسلام سے بھاگنے کے لئے کیا کیا دلائل اختراع کر رہے ہیں۔

بات سیدھی سی ہے کہ انگریزی ادب پڑھنے، یورپی فلمیں دیکھنے اور بادہ و زن کا مزہ چکھنے کے بعد قدیم روایات، معاشرتی بندشیں اور مذہب زہر لگتا ہے۔ اس قسم کے نوجوان صرف یہ چاہتے ہیں کہ والد صاحب اپنی کمائی میں سے کم از کم سو اسو روپے ہر شام صاحب زادہ صاحب کو دے دیں۔ یہ ہمسائے کی بیٹی کو ساتھ لیں۔ کسی ناچ گھر میں جا کر ساٹھ، ستر کی شراب پیئں۔ چالیس پچاس کا ڈنر کھائیں جسم کے تین بجے تک داد عیش دیں۔ پھر گاتے، لڑکھڑاتے اور بکواس کرتے ہوئے گھر کو چل دیں۔ اور اگلے روز دن کے دو بجے تک بستر میں بے ہوش پڑے رہیں۔

اگر آپ کو اسلام کے مقدس اصول پسند نہیں، تو چلیئے ہم کچھ وقت کے لیے آپ ہی کی پیروی کر لیتے ہیں۔ کراچی میں نوجوانوں کی تعداد نو لاکھ کے قریب ہو گی۔ انہیں شام گزارنے کے لیے نو لاکھ لڑکیاں اور شراب کی نو لاکھ بوتلیں چاہئیں۔ یہ کہاں سے آئیں گی۔ لڑکیوں میں کچھ زیادہ حسین ہوتی ہیں، اور کچھ کم۔ حسیناؤں کے لیے جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ سارے مرد شراب میں غٹ، جگہ جگہ چاقو زنی اور گولی چلنے کی وارداتیں ہوں گی، اور ہر رات کراچی کی گلیاں خون سے سرخ ہو جائیں گی۔ اگر یہ نوجوان ہر شام کسی دوسرے کی بیٹی یا بہن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ تو انھیں لازماً اپنی بہنیں کسی اور کے حوالے کرنی پڑیں گی —۔ رفتہ رفتہ دیہاتی آبادیاں بھی متاثر ہوں گی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کنجرستان بن جائے گا۔

اے پاکستان کے عیاشو! تمہاری حیوانیت کے منطقی نتائج یہی ہیں تم میرے وطن کی مقدس سرزمین پر فسق و فجور پھیلا رہے ہو۔ میرے کرجاں بازوں کو بے غیرت، بزدل، شرابی اور بھگوڑا بنا رہے ہو۔ میری، محترم، باحیا اور باعصمت بیٹیوں کی توہین کر رہے ہو۔ اسلام کی ناکامی کا اشتہار دے رہے ہو انسانیت کو بہیمیت کی طرف واپس بلا رہے ہو۔ اور دس کروڑ پاکستانیوں کی تباہی کا انتظام کر رہے ہو۔ یاد رکھو۔ کہ اللہ جرم عیاشی کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ عیاش لوگ نہ تو ملک کا دفاع کر سکتے ہیں۔ نہ وفادار ہوتے ہیں۔ یہ صرف لال پری اور لال دوپٹے کے پرستار ہوتے ہیں۔ یہ چیزیں دشمن سے ملیں تو دشمن کے بن جاتے ہیں۔

آپ نے تاریخ میں پڑھا ہو گا کہ جب مغلوں، رومیوں، بابلیوں، عباسیوں اور دیگر صدہا اقوام کا سفینہ غیرت و شجاعت مے و نشاط کے دریا میں ڈوب گیا۔ تو خدائی غضب چنگیز، ہلاکو اور زلزلہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ ان کی آزادی.... عزت، شان و شوکت، دولت و شراب کے خم اور بیٹیاں سب چھن گئیں، لاکھوں قتل ہو گئے۔ اور باقی ماندہ سگان بازار سے بھی زیادہ ذلیل و خوار بن گئے۔ کیا آپ اس تاریخ کو پھر دہرانا چاہتے ہیں۔؟

ہمارا نوجوان کہتا ہے کہ اگر شراب و رقص وجۂ تباہی ہوتے۔ تو یورپ مدت سے تباہ ہو چکا ہوتا۔ اسے کون سمجھائے کہ یورپ کے پاس اس زہر کے بیسیوں تریاق موجود ہیں۔ ان کا بے پناہ علم، محنت، تلاش، جستجو، وطن کے لیے جذبۂ سرفروشی، اتحاد وغیرہ وہ خوبیاں ہیں کہ جب تک ان میں موجود رہیں گی۔ وہ شاید شراب و رقص کے باوجود زندہ رہیں۔ لیکن نوجوانِ پاکستان کے پاس کیا ہے؟ ایک اسلام تھا اس سے بھی بھاگ رہے ہیں۔ اس بے سرو سامانی کا نتیجہ لازماً شخصی تباہی اور ملّی زوال ہو گا۔

بعض تعلیم یافتہ ایسے بھی ہیں۔ جو شراب سے متنفر ہیں، عورت کا احترام کرتے ہیں اور اچھے خاصے جنٹلمین ہیں لیکن بایں ہمہ اسلام سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ آپ اسلام کی کون سی بات ناپسند ہے؟ اللہ سے رابطہ محبت؟ والدین کی تابعداری؟ اساتذہ کا ادب؟ امیر کی اطاعت؟ اتحاد و اتفاق؟ تلاش علم؟ تسخیر کائنات

تن من کی پاکیزگی؟ مساواتِ انسانی؟ احترامِ قانون؟ عبادت؟ الٰہی صفات کا نام تو اسلام ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو نظامِ حیات سے نکال دیجیے۔ اور یہ دنیا جہنم بن جائے گی۔ فرض کیجیے کہ حکومت بد دیانتی کی اجازت دے دیتی ہے۔ ایک گھنٹے میں خزانہ خالی ہو جائیگا۔ بنک لُٹ جائیں گے بازار اُجڑ جائیں گے۔ اور آپ کی کوٹھی، جائداد، وغیرہ پر غنڈے قبضہ کر لیں گے۔

البتہ ایک چیز ایسی ہے جس کے متعلق ہمارے ننانوے فیصد، طلبہ، اساتذہ اور حکام کا خیال یہ ہے کہ اسے اسلام سے نکال دیا جائے اور وہ ہے عبادت یعنی صلوٰۃ۔ کوئی کہتا ہے نماز بور کرتی ہے۔ آپ ہر روز صبح سردی میں جاگ جلدی جلدی دفتر جاتے ہیں۔ دن بھر گوشوارے بھرتے، جمع و تفریق کرتے اور ایک ہی انداز کی چٹھیاں لکھتے رہتے ہیں۔ ان چیزوں سے تو آپ بور نہیں ہوتے۔ لیکن صرف دو منٹ کے لیے اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر نور و ہدایت طلب کریں۔ منزل پہ پہنچنے کی دعا مانگیں، آباؤ اجداد کی مغفرت اور ساری کائنات کے لیے خدا کی فضل و کرم کی آرزو کریں تو بور ہو جاتے ...... واہ رے نزاکتِ طبع۔

عبادت کے فوائد یہ ہیں:۔

اوّل:۔ کائنات میں کچھ خفیہ طاقتیں ہیں۔ جو پھولوں کو رنگین، پھلوں کو شیریں گھٹاؤں کو جمیل اور بہاروں کو حسین بناتی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے۔ بہت اچھا۔ تو پھر ایک انڈا خود بخود انسان کیوں نہیں بن جاتا۔ تمھارے دادا جان مرنے کے بعد خود بخود زندہ کیوں نہ ہو گئے۔ کیکر کے ساتھ

خود بخود آم نیوں نہیں لگتے۔ جواب ایک ہی ہے کہ آقائے کائنات کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک جنبش نہیں کر سکتا۔ اس کے تحت لاتعداد مخفی کارکن ہیں۔ جن میں سے کچھ آپ کی خدمت پر مامور ہیں۔ یہ آپ کے دل کی مشین چلاتے، لہو کو رگوں میں پھراتے اور آپ کو حادثوں، دکھوں اور پریشانیوں سے بچاتے ہیں۔ اگر ایک آدمی عبادت کو ترک کر دے۔ تو ان میں سے کچھ واپس بلا لیے جاتے ہیں۔ اور انسان بار بار امراض و آلام کا شکار ہوتا ہے:

دوم:۔ عبادت سے مزاج میں نرمی، رفتار میں متانت اور کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی عظمت اسی پاکیزگی میں ہے۔

سوم:۔ ایک معبود کے آگے سر جھکانے سے دیگر بیسیوں خداؤں سے نجات مل جاتی ہے، ایک عابد کی غیرت یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے سر کو جو ہر روز اللہ کے سامنے جھکتا ہے۔ کسی اور کے سامنے خم کرے۔ روح کی یہی وہ حریت ہے۔ جو شخصیت کی بالیدگی عطا کرتی ہے۔

چہارم:۔ عبادت سے چہرہ حسین بن جاتا ہے اور خد و خال میں ملاحت و دلکشی آجاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے مسجد کے امام یا کسی اور عابد کا چہرہ دیکھئے۔ اور پھر آئینے میں اپنی شکل ملاحظہ فرمائیے۔ عبادت کی یہی وہ چمک تھی۔ جس نے اسلام کو بحر الکاہل کے بعید ترین جزائر تک پہنچا دیا تھا۔ دنیا ہمارے عبادت گذار تاجروں سپہ سالاروں اور حاکموں کے حسین چہروں کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتی تھی۔ کہ یہ روشنی جھوٹے کے چہرے پر نہیں ہو سکتی۔

پنجم:۔ عبادت سے شخصیت میں مقناطیسیت پیدا ہوتی ہے۔ بشرطیکہ

زندگی گناہ سے پاک ہو۔ اور کبھی کبھی یہ عالم ہو جاتا ہے کہ موت کے بعد بھی دنیا عابد کے مزار پر صدیوں عقیدت کے پھول برساتی رہتی ہے۔ حضرت شکر گنج، داتا گنج بخش ہجویری اور باہو رحمتہ اللہ علیہم کے مزار پر جائیے اور لاکھوں پروانہ صفت عقیدت مندوں کا طواف دیکھئے۔ اگر وہاں کوئی شمع نہیں جل رہی تو یہ پروانے کیسے آ گئے؟ یہ کشش اور کروڑوں دلوں پہ یہ حکومت صرف عبادت کا نتیجہ ہے۔

ششم :۔ ساری دنیا سکون و قرار کی تلاش میں ہے یہ اگر دولت میں ہوتا تو۔۔۔۔ دولت مند تمام افکار سے آزاد ہوتے۔ لیکن حقیقت اس کے الٹ ہے۔ یہ سلطنت میں ہوتا تو تمام سلاطین چین کی نیند سوتے۔ لیکن شاہوں کے نصیب میں یہیں کہاں یہ نعمت صرف ایک مقام سے ملتی ہے۔ اور وہ ہے عبادت۔ اللہ کا پجاری فکر سود و زیاں سے بلند ہو جاتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو اللہ کی مشیت سمجھتا ہے۔ اور اس لیے ہر حال میں خوش رہتا ہے

ہفتم :۔ عبادت سے دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ کامیابیوں کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور کائنات کی تمام خفیہ طاقتیں مددگار بن جاتی ہیں۔ جنگ بدر تین سو تیرہ تلواریں ہزار تلواروں سے کیسے جیت گئیں۔ نہاوند، قادسیہ، صلیبی جنگوں اور دیگر آٹھ سو میدانوں میں چھوٹے چھوٹے بے سروساماں لشکروں نے اپنے سے بیس، تیس اور پچاس گنا زیادہ افواج کو کیسے شکست دی۔ جواب ہے روحانی قوت جو عبادت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم اس قوت سے محروم ہو گئے تو ہر میدان میں پٹنے لگے اور اب تو یہ عالم ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور بھارت ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

مادی قوت ہماری پاس ہے نہیں۔ اگر روحانی طاقت بھی پیدا نہ کی تو پندرہ کروڑ اسلامیانِ ہندو پاک حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مِٹ جائیں گے۔

حکومت کا فرض ہے کہ وہ الحاد و دہریت کے رجحان کو روکے۔ شراب خانوں کو بند کرے۔ مادی قوت کو بڑھائے اور ساتھ ہی روحانی قوت کی تخلیق کے لیے تمام سیکرٹریوں، کمشنروں، پرفیسروں، طالب علموں، اور دیگر ملازمین کو ادائے نماز کا حکم دے۔ اگر یہ نہ کیا تو کل ساری قوم کو لادینی عیاشی اور خدا سے دوری کے نتائج سہنے پڑیں گے۔ آسودہ حال طبقے کی عیاشی کیا ہے؟ غریب کی محنت سے حاصل کردہ دولت کا نہایت وحشیانہ و بہیمانہ استعمال، یہ وہ گناہ ہے جسے اللہ نے آج تک معاف نہیں کیا اور نہ آئندہ کرے گا۔ یقین نہ آئے تو تاریخ اقوام پڑھیئے یا الہامی صحائف اٹھا کر آپ کو ہر جگہ یہ بات لکھی ملے گی۔

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

# کیا مغربی پاکستان میں اردو ایک اجنبی زبان ہے؟

کچھ عرصے کا ذکر ہے۔ کہ لاہور میں علاقائی زبانوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں جو تقاریر ہوئی تھیں۔ ان کا ماحصل یہ تھا۔ کہ زبان سے اقوام نہیں بنا کرتیں کہ کئی ممالک میں ایک سے زیادہ قومی زبانیں ہیں۔ اس لیے پنجابی، پشتو اور سندھی کو بھی قومی زبانیں قرار دیا جائے۔ پھر مندوبین کا عام رجحان یہ تھا کہ مغربی پاکستان میں اردو ایک اجنبی زبان ہے۔

ہمیں مندوبین کی اس بات سے تو کامل اتفاق ہے کہ اقوام زبانوں سے نہیں بنتیں۔ لیکن ان کا یہ مطالبہ کہ پنجابی، پشتو اور سندھی کو بھی قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ اور یہ دعویٰ کہ یہاں اُردو ایک اجنبی زبان ہے، محلِ نظر ہیں۔

**اُردو کی حیثیت**

کیا اُردو مغربی پاکستان میں ایک اجنبی زبان ہے؟ اگر ہے تو وہ اجنبی لوگ کون تھے؟ کیا یہ زبان آریوں، یونانیوں، یا انگریزوں کے ساتھ یہاں آئی تھی؟ کیا یہ فرانسیسی یا پرتگالی تاجروں کے صندوقوں سے نکلی تھی؟ اگر یہ بات نہیں۔ بلکہ یہ زبان فارسی اور پنجابی کے اختلاط کا نتیجہ تھی۔ تو پھر اجنبی کیسے ہوئی؟ فارسی بولنے والے مسلمان (اور مسلمان کسی خطہ زمین میں ہو لا الٰہ کی

جبل متین سے یوں بندھے ہوئے ہیں کہ غیریت و اجنبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پنجابی (یہاں پنجابی سے مراد زبانِ پنجاب ہے۔ ممکن ہے اُس زمانے میں اس کا ہندی نام کچھ اور ہو) بولنے والے اہلِ پنجاب، تو پھر اُردو ایک بیگانہ زبان کیوں کر ہوئی؟

**تاریخی حقیقت** حقیقت یہ ہے کہ آج سے کئی سو برس پہلے وسطی و شمالی ہند کی زبان تقریباً ایک ہی تھی۔ یعنی ہندی۔ لیکن مختلف علاقوں میں اس کے نام جدا جدا تھے۔ یہ پنجاب میں پنجابی، قنوج کے قریب انتربیدی، گوالیار کے شمال مشرق میں سیکرڑ واری، بھرت پور کے جنوب میں ڈانگی اور نینی تال میں بھکسا کہلاتی تھی۔ پنجابی کو امیر خسرو، لاہوری اور ابوالفضل ملتانی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ زبان جو دریائے چناب کے مغربی علاقہ میں لہندا (پنجابی میں آج بھی مغرب کو لہندا کہتے ہیں) کہلاتی تھی۔ پانچ دریاؤں کے درمیان محصور نہ تھی بلکہ مشرق میں دریائے گھگرا اور مغرب میں پشاور تک پھیلی ہوئی تھی۔ آج سے ہزاروں برس پہلے فارسی سے اسی زبان کا رابطہ قائم ہوا تھا۔

ہر دور میں لاہور پنجاب کا مرکزی شہر تصور ہوتا رہا۔ محمود غزنوی یہاں آیا۔ تو اس نے اسی شہر کو پایہ تخت قرار دیا۔ غزنویوں کی زبان فارسی تھی۔ وہ یہاں ایک سو ستر برس رہے۔ اس طویل عرصہ میں پنجابی اور فارسی کے ہزارہا الفاظ باہم خلط ملط ہوئے۔ حکومتی، تجارتی اور معاشرتی کاروبار چلانے کے لیے غزنویوں نے پنجابی الفاظ اور پنجابیوں نے فارسی الفاظ ایک دوسرے سے لیے اور اس طرح دو صدیوں میں ایک نئی زبان کا ڈھانچہ تیار ہوگیا۔ اور یہی زبان بعد میں اُردو کہلانے لگی۔ آغاز میں اس پر پنجابی رنگ و روغن زیادہ نمایاں تھا

یہی زبان جب بعد میں دہلی اور دکن پہنچی تو پنجابی الفاظ، تراکیب اور افعال و اسماء ساتھ لے گئی۔ وہاں ہندی کی ایک ایسی شاخ سے رابطہ پیدا ہوا۔ جو پنجابی سے قدرے مختلف تھی۔ اس لیے وہاں اردو کی ہیئت میں تبدیلی آنے لگی، اور تین چار صدیوں کے بعد اُس پنجابی سے قدرے مختلف ہو گئی۔ جو پنجاب میں بولی جاتی تھی۔

کیا آپ آج اُردو کو محض اِس اختلاف اور تبدیلی ہیئت کی وجہ سے اجنبی کہنے لگے ہیں؟ مختلف ماحول میں یہ تبدیلی ہو کر رہتی ہے۔ اگر ہمارے گھر کا کوئی آدمی کاروبار کے لیے برما جائے۔ وہیں کا لباس اور طرزِ معاشرت اختیار کرے۔ تو کیا اس تبدیلی کی وجہ سے ہم اُسے اجنبی قرار دیں گے؟ ہر سال ہمارے ہزار ہا نوجوان ولایت جاتے ہیں واپس آتے ہیں تو لباس کے ساتھ عادات و اطوار بلکہ زندگی کے متعلق نقطہ نگاہ تک بدلا ہوا ہوتا ہے۔ تو کیا ہم ان سب کو اجنبی قرار دیں؟ ایسی تبدیلیاں تو ہر گھر میں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ فرض کیجیے زید کے تین بیٹے ہیں ایک اَن پڑھ، دوسرا سی۔ ایس۔ پی۔ اور تیسرا کسی مسجد میں امام ہے۔ ان تینوں کے لباس، ہئیت، چال ڈھال اور نقطہ نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔

اختلافِ ماحول کی وجہ سے یہ تبدیلیاں پودوں، پرندوں اور دیگر جانوروں میں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو چڑیا گھر میں پچاس رنگ کے طوطے، کسی جھیل میں مختلف قسم کی مرغابیاں اور باغوں میں بارہ رنگ کے گلاب دیکھئے۔ گلاب گلاب ہے خواہ وہ پیلا ہو یا سُرخ، طوطا طوطا ہے، خواہ وہ سبز ہو یا نارنجی آم آم ہے خواہ وہ مالدہ ہو یا لنگڑا اور پنجابی پنجابی ہے خواہ دہلی والے اسے اُردو کہیں یا ریختہ۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ اردو کی ابتدائی صورت پنجاب میں تیار ہوئی تھی۔ بعد میں جب ہزاروں لاکھوں پنجابی دہلی کی طرف تجارت کی خاطر یا حملہ آوروں کے لشکر میں شامل ہوکر گئے۔ تو نئے ماحول میں اُن کی زبان بدلنے لگی، اور بالآخر وہ دہلی میں میرؔ و غالبؔ کی زبان بن گئی۔

**پنجابی دہلی میں**

ضروری نہیں کہ ہر واقعہ کا ذکر تاریخ میں موجود ہو۔ تاریخ میں سمجھ آسے کہ کوئی لکھے۔ محمود غزنوی کے بعد کتنے ہزار یا لاکھ پنجابی دہلی کی طرف گئے۔ ہمیں معلوم نہیں، نہ تاریخ کو علم ہے۔ البتہ چند متفرق واقعات کا ذکر ملتا ہے۔

اوّل جب نمک حرام خسرو نے خلجیوں کے خلاف غدّاری کی اور تخت دہلی پر قابض ہوگیا تو غیاث الدین تغلق پنجابیوں کا لشکر لے کر دہلی کی طرف بڑھا ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں دہلی پہ قابض ہوگیا۔ اور ان پنجابیوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہیں آباد ہوگئی۔

دوم:۔ خضر خان تیمور کی طرف سے ملتان کا گورنر تھا۔ اس نے ۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء میں ساٹھ ہزار پنجابی سپاہیوں کے ساتھ دہلی پہ چڑھائی کی اور دولت خاں لودھی کو شکست دی۔ اس لشکر کے بیشتر افراد دہلی ہی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔

بیرونی حملہ آور پنجاب میں سے گذر کر دہلی پہنچے تھے۔ وہ ساری فوج گھر سے ساتھ نہیں لاتے تھے۔ بلکہ منزل بمنزل کہیں جہاد کا نعرہ لگا کر اور کہیں مالِ غنیمت کا لالچ دے کر تیار کرتے تھے جب بابر فرغانہ سے نکلا تو اس کے ساتھ صرف تین چار جاں نثار تھے۔ کابل میں پہنچ کر یہ پچیس بن گئے اور پنجاب میں کئی

ہزار۔ یہی وہ پنجابی تھے، جو تلوار کے ساتھ ابتدائی اردو بھی ہمراہ لے گئے۔ یوں کہیے کہ اُردو ہمارے آباؤاجداد کی زبان تھی جس میں ہزار برس تک تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ دہلی میں اسکا نام اردو پڑ گیا اور لاہور میں پنجابی کہلانے لگی۔ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی اس لیے اُردو ہماری زبان ہے۔ ہمارے آبا کی میراث ہے اور اسے اجنبی کہنا کسی طرح بھی روا نہیں۔

**اُردو اور پنجابی کا اشتراک** پنجابی اور اُردو میں کئی طرح سے اشتراک ہے:-

اول:- ان کے نوّے فی صد الفاظ مشترک ہیں۔ پنجابی کے کسی جملے کو لیجئے۔ حروفِ اضافت یعنی دی۔ دا۔ کو۔ کی۔ کا سے افعال کے وا۔ ندا کو نا سے بدل دیجئے۔ چند اور چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر دیجئے۔ اور وہ اُردو جملہ بن جائیگا۔ مثلاً۔

| پنجابی | اُردو |
| --- | --- |
| ۱۔ مزدوری کرنا اُس دا پیشہ اے | ۱۔ مزدوری کرنا اس کا پیشہ ہے۔ |
| ۲۔ اوہ گھوڑے تے سوار اے۔ | ۲۔ وہ گھوڑے پر سوار ہے۔ |
| ۳۔ خدا تینوں پُچھے۔ | ۳۔ خدا تم سے پوچھے۔ |
| ۴۔ کُرسی اِدھر چک لے آ | ۴۔ کرسی اِدھر اٹھا لاؤ۔ |
| ۵۔ میں نماز پڑھ کے تے دُودھ پچو کے آواں گا | ۵۔ میں نماز پڑھ کر اور دودھ دوہ کر آؤں گا |

بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آغاز میں پنجابی حروفِ اضافت بھی۔

کا، کے، کی تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو دیہاتی لوگ اپنی بستیوں کے نام مریدکے اور سادھوکے نہ رکھتے بلکہ کے کی جگہ دے استعمال کرتے۔ پنجاب میں اس شکل کے درجنوں نام ملتے ہیں۔ مثلاً پتّوکی، تدّوکی، رحیم کی، چوہڑی، چیچوکی ملیاں وغیرہ پھر ہمارے ہاں میکے (ماں کے گھر) پیکے (پے یعنی باپ کے گھر) نانکے (نانا کے گھر) دادکے (دادا کے گھر) کی اصطلاحات عام استعمال ہوتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کا۔ کے۔ کی اردو سے مخصوص تھے تو اہلِ پنجاب نے ان کا استعمال اس فیاضی سے کیوں اور کیسے کیا؟ کیا ان دیہاتیوں نے اپنی بستیوں کے نام دہلی سے منگوا لئے تھے؟

سوم:- اردو پنجابی کی صرف و نحو ایک۔ افعال کی گردان ایک:-

| اردو:- | پنجابی:- |
|---|---|
| ۱۔ وہ کرتا ہے۔ وہ کرتے ہیں۔ | ۱۔ اوہ کردا اے۔ اوہ کردے ہن |
| ۲۔ تو کرتا ہے۔ تم کرتے ہو۔ | ۲۔ تو کردا ایں۔ تسی کردے او |
| ۳۔ میں کرتا ہوں۔ ہم کرتے ہیں۔ | ۳۔ میں کرداہاں۔ اسی کردے ہاں |

چہارم:- تذکیر و تانیث کا قاعدہ ایک:-

| مذکر | اردو مؤنث | پنجابی مؤنث |
|---|---|---|
| اونٹ | اونٹنی | اونٹنی |
| فقیر | فقیرنی | فقیرنی |
| نٹ | نٹنی | نٹنی |
| ڈوم | ڈومنی | ڈومنی |
| زمیندار | زمیندارنی | زمیندارنی |

| مذکر | اردو مؤنث | پنجابی مؤنث |
|---|---|---|
| مُغل | مُغلانی | مُغلانی |
| کبوتر | کبوتری | کبوتری |
| گھوڑا | گھوڑی | گھوڑی |
| بیل | گائے | گاں ٥ |
| دُنبہ | بھیڑ | بھِڈ - بھیڑ |
| میراثی | میراثن | میراثن |
| تیلی | تیلن | تیلن |
| جوگی | جوگن | جوگن |

**پنجم:-** دونوں زبانوں کے اسمائے صفات کے آخر الف آتا ہے۔

| اُردو | پنجابی |
|---|---|
| لمّبا | لمبا - لمّا |
| اونچا | اُچّا |
| اَچھا | چنگا |
| ٹیڑھا | ڈِنگا - وِنگا |

کہاں تک بیان کروں۔ گرائمر کا کوئی پہلو لیجئے آپ کو دونوں زبانوں میں تقریباً مکمل اِتحاد ملے گا۔

## ہندی، اُردو، پنجابی

اُردو ادب کے بعض مورخین کہتے ہیں کہ اُردو اس بھاشا سے تعبیر ہوئی۔ جو دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ اس بات سے

کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ بھاشا نے اُردو کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ لیکن یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہے۔ کہ اُردو کا ابتدائی ہیولیٰ اُن دو صدیوں میں تیار ہوا تھا جب غزنوی پنجاب میں سریر آرا تھے۔ باوجودیکہ اس ابتدائی اُردو پر بھاشا آٹھ سو برس تک اثرانداز رہی پھر بھی آج اُردو بھاشا کی نسبت پنجابی سے قریب تر ہے۔

چند امثلہ ملاحظہ ہوں:۔

| اُردو | پنجابی | بھاشا |
| --- | --- | --- |
| کنگھی | کنگھی | کانگی |
| کل | کل | کال |
| مٹی | مٹی | ماٹی |
| پکنا | پکنا | پاکنا |
| پسلی | پسلی | پانسلی |
| چکی | چکّی | چاکی |
| پتھر | پتھّر | پاتھر |
| پیچھے | پچھے | پاچھے |
| گھنٹی | گھنٹی | گھانٹی |
| سچ | سچ | سانچ۔ سانچ |
| کچا | کچّا | کاچا |
| مچھر | مچھر | ماچھر |
| مکھی | مکھی | ماکھی |

پکھیں — پکھیں — پکھیال

بے کل — بے کل — بیاکل

**ترقی یافتہ صورت** موجودہ اردو پراتی پنجابی کی ترقی یافتہ صورت ہے یہ ارتقا ہر زبان میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اردو شعرا سے کو سیں یا سوں اور کو کو کوں باندھتے تھے۔ یہ صورت ذوقِ سلیم پہ گراں تھی چنانچہ رفتہ رفتہ یہ الفاظ غائب ہو گئے۔ ذوقِ سلیم، ضرورتِ اختصار اور.... تقاضۂ فصاحت و بلاغت وہ عوامل ہیں۔ جو زبان کی قطع و برید میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ اور ان سے کسی طرح مفر نہیں۔ ابتدائی اردو میں یہ عوامل صدیوں کارفرما رہے۔ لیکن اردو اور پنجابی میں کوئی ناقابلِ عبور خلیج حائل نہ کر سکے۔ آج یہ کہنا غلط ہوگا کہ اردو ایک اجنبی زبان ہے۔ بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ موجودہ اردو قدیم پنجابی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

اگر پیوند لگانے سے معمولی آم مالدہ یا قلمی بن جاتا ہے۔ تو کیا یہ مالدہ اپنے باغ میں ایک اجنبی پھل تصور ہوگا؟ زبان کا یہ اختلاف تو ہمارے گھروں میں بھی نظر آتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک بھائی مورخ ہے۔ تو اس کی زبان میں لونا پارٹ، بسمارک، پلاسی، ٹیپو، قادسیہ، واٹر لو جیسی اصطلاحات کی بھرمار ہوگی۔ دوسرا ریاضی دان ہے۔ تو وہ مثلث، مربع، زاویہ، عمود اور قطر کی رٹ لگائے گا تیسرا فلسفی و منطقی ہے۔ تو صغریٰ۔ کبریٰ۔ ممکن۔ محال۔ عرض اور واجب کی گردان کریگا۔ اور ان کا ان پڑھ بھائی کسی ایک کی بھی بات نہیں سمجھ سکے گا۔ تو کیا ان تعلیم یافتہ بھائیوں کی ترقی یافتہ زبان کو ہم اجنبی کہیں گے؟ یہی بات اردو کے

ساتھ ہوئی کہ اسے شبلی، حالی، سرسید، اکبر، سرشار، شرر، جگر، جوش اور اقبال جیسے ہزاروں علماء شعراء، فلسفی، مورخ، محدث، مفسر اور ادیب مل گئے، اور اس کا دامن علمی اصطلاحات، شستہ الفاظ و تراکیب اور چست محاورات سے بھر گیا اور دوسری طرف پنجابی کو وارث شاہ کے سوا اور کام کا آدمی نہ ملا اور وہ ٹھیکی سی زبان بن کر رہ گئی۔

**ابتدائی اردو کا سفر دہلی و دکن کی طرف** محمد غوری ۱۱۷۶ء میں داخل ہند ہوا پہلے سندھ اور ملتان پر قبضہ کیا ۱۱۸۶ء میں لاہور سے غزنویوں کو نکالا اور ۱۱۹۴ء میں گوالیار، بندھیل کھنڈ، بہار اور بنگالہ کو مسخر کیا ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور پنجاب ہی سے گزرا۔ ۱۵۲۶ء میں بابر کی گزرگاہ بھی یہی تھی اور ۱۵۵۴ء میں ہمایوں بھی یہیں سے ہو کر دہلی کی طرف بڑھا تھا۔ ان کشور کشاؤں کے ہمراہ پنجاب کے ہزارہا سپاہی اور درجنوں اہل علم تھے۔ جو اردو کا ابتدائی ہیولا ساتھ لیے دہلی پہنچے تھے۔ خسرو اور خضر خاں کی لشکر کشی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

دکن میں سب سے پہلے خلجی پہنچے اور پھر تغلق ۱۳۲۱ء میں محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا اور دہلی سے ساری فوج، حکام، امراء، شعراء وغیرہ کو دکن میں بلا لیا۔

اس اختلاط کا اثر یہ ہوا کہ وہ پنجابی نما اردو جو دہلی میں پروان چڑھ رہی تھی دکن میں بھی جڑ پکڑنے لگی۔ اس ابتدائی زبان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں پنجابی اسماء و افعال کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔

مثلاً:۔ ۱ء ــــ خسرو دہلوی ۱۲۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے خلجیوں اور تغلقوں کا

زمانہ تھا۔ خسرؔو ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ واودھ) میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجاب کی زبان سے نا آشنا تھے۔ لیکن باایں ہمہ ان کی شاعری میں کہیں کہیں ٹھیٹھ پنجابی الفاظ ملتے ہیں۔ جس کی توجیہہ یہی ہوسکتی ہے کہ ابتدائی حملہ آوروں کے ہمراہ پنجابی فوج بھی تھی۔ یہ الفاظ خسرؔو تک پہنچے اور اس نے کہیں کہیں اشعار میں استعمال کیے۔ مثلاً

من کہ بر سرِ نمی نہادم گُل
بار بر سرِ نہاد گفتا چُل

اے دہلی و اے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

---

ہندی گویند خربارا کمجُور
داکھ را توفارسی میدان انگور

۲۔ اسی زمانے میں شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (م ۱۲۶۶ء) پنجاب میں نظر آتے ہیں۔ جن کا کچھ پنجابی و اُردو کلام محفوظ ہے۔ پنجابی کلام کا نمونہ۔

آپ جاواں کہ قاصد گھلاں دلبر یار دے وَلے
دے ہن دیداودلبرا اساں دکھ لکھاں سر جھلے
ہجر تیرے وچ صبر نہ بلیا لکھ لکھ گیتے تلے
یار فرید او دہ من سمجھو لُوں لُوں صبر جہاں دے پلے

---

میں دلبر دل سجائے گردی ، لوگ جاون ولی تکے
لوگ تاں تکدے عید دے چن نوں جن ماہی دل تکے
یار میرا دے دور ٹھکانے پہنچ کوئی نہ سکے
یار فرید اوہی پہنچے صدق جنھاں دے پکے

یہ زبان اردو کے اتنی قریب ہے کہ اگر چند الفاظ مثلاً گھلاں ، دل تکے ، اساں ، ریلنے ، بلن ، نوں ، جنھاں وغیرہ کو اردو میں بدل دیا جائے تو یہی اشعار اردو اشعار بن سکتے ہیں :-

حضرت بابا فرید رح اس دور کی اردو میں بھی اشعار کہتے تھے نمونہ یہ ہے ۔

وقت سحر وقت مناجات ہے | خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا | خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
باتن تنہا چہ روی زیں زمیں | نیک عمل کن کہ یہی سات (ساتھ) ہے

۳ ۔ بابا فرید رح کا ذکر تو ضمناً آگیا ہے ۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ آغاز میں دہلی کے شعراء و ادبا پنجابی الفاظ استعمال کرنے پہ مجبور تھے ۔ کیونکہ ان کے پاس ابتدائی اُمردو ہزار ہا پنجابی الفاظ کے ہمراہ پہنچی تھی ۔ یہ الفاظ کئی سو برس تک دہلی میں رائج رہے میر تقی (۱۷۸۳ء) اور سودا ، خسرو سے چار سو برس بعد آئے تھے ، لیکن ان کے ہاں بھی کہیں کہیں پنجابی الفاظ ملتے ہیں ۔ میر تقی میر کا شعر ہے ۔

ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشے اور پیمانے پر

ہیگا خالص لاہوری پنجابی کا ہے ۔ اسی طرح سودا (م ۱۷۸۱ء) کے کلام

میں بھی جا بجا پنجابی ساخت کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ مثلاً

خاک وچوں ہیں عورتیں کیا کیا نہ بیبیں ویکھیاں
اے فلک باتیں تیری کوئی نہ بھلیاں ویکھیاں
وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جس نے وہ آنکھیں خمار آلود ملیاں دیکھیاں

۴ــــ محمد افضل جھنجھانوی، میر و سودا سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا آدمی ہے میرٹھ کے قریب ایک قصبہ جھنجھا میں پیدا ہوا۔ ۱۶۲۲ء میں وفات ہوئی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کا زمانہ پایا۔ اس کا کلام میر و سودا کی نسبت پنجابی کے زیادہ قریب ہے۔ مثلاً

| | |
|---|---|
| بہت مدت ہوئی آون نہ کینا | نہ کاگت ہی کسی کو لکھ نہ دینا |
| ارے آساں نہ جانوں عشق کرناں | تمن اس آگ میں ہر گز نہ سڑناں |
| جنوں ورملک جاں جھنڈا گڈایا | سمجھ اور بوجھ کا تھانا اٹھایا |
| پچھے سے بیٹھم کر منگل گاوتی ہیں | مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں |

(بارہ ماسہ)

۵ــــ جعفر زٹلی، جو عالمگیر کے سال جلوس (۱۶۵۹ء) میں پیدا ہوا تھا، کے اردو کلام کا نمونہ دیکھئے۔ زٹلی جھنجھانوی کا قریب العصر تھا۔

نہ ہو سکھ بیچ راحت میں سدا رہ محو طاعت میں
اجل بھی ہوگی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا

لشکتی باندھنے پاگاں محل ہیں لگ اور راگاں
وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک میں جانا
لذت کا کھا دیتے کھانا پہنے ریشمی بانا
انھوں کو موت نے بھانا کہ آخر خاک ہو جانا

۶ ـــــ ابراہیم فاروقی پندرھویں صدی عیسوی کا ایک مصنّف ہے۔ جسکی تصنیف شرف نامہ میں مُنگ (مونگ)، گانگھو (مشکھ)، گدڑی، کت (کھٹ) جیسے دو چند پنجابی الفاظ موجود ہیں۔ یہی حال اس کے معاصر ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا ہے۔

دکن کی اُردو | گو دکن پنجاب سے اندازاً دو ہزار میل دُور ہے اور دہلی بہت قریب لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دہلوی شعراء کی نسبت دکنی شعراء کا کلام پنجابی کے زیادہ قریب ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دہلی میں اُردو برج بھاشا سے جو پنجابی سے بہت ملتی جلتی تھی، فوراً متاثر ہوئی اور تیزی سے بدلنے لگی۔ لیکن دکن کے اِردگرد کوئی ایسی زبان موجود نہ تھی، جو اُردو، بھاشا یا پنجابی سے مماثل ہوتی۔ اور قصرِ اُردو کی تعمیر میں اینٹ گارے کا کام دیتی۔ اس لیے جس شکل میں بھی مدتوں استعمال ہوتی رہی تبدیلیاں تو ہوتی ہیں لیکن دہلوی اُردو کی نسبت بہت کم، نمونہ ملاحظہ ہو۔

۱ ـــــ دکن کے قدیم ترین اُردو مصنّف خواجہ گیسو دراز (م ۸۲۵ھ ۱۴۲۲ء) ہیں۔ اپنی تصنیف معراج العاشقین میں پنجابی سو اب سی بن چکا ہے (اسی نے آناسی جاناسی) کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

"...... آنکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ غفلت کے کان سوں غیر نہ سننا سو۔ وسواس کے نک سُوں بدبوی نہ لینا سو۔"

۲ ـــــــ محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء) :-

کہو رات کن سات کیتی ہیں باتاں

کہ چوتا ہے تم ہیں سے رنگِ خماری

ـــــــ

صعہ - پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر

۳ ـــــــ احمد دکنی محمد قلی شاہ کا درباری شاعر :-

جو نبیاں تے نا ہوے گنہ کا ظہور

تو کس دہات ہوئے نام تیرا غفور

ـــــــ

مجھے لوگ کہتے کہ دے سٹ تمے پرت

(چھوڑنا) (پرہیت)

پرت چھوڑ دینی کیسے ہے سکت

۴ ـــــــ سراج دکنی (م ۱۷۶۴ء)

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا

کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

(پیچھے)

۵ ـــــــ امین دکنی (م ۱۶۹۶ء)

توں لعل پی پچھوں دیدے امین کو

امین پی تے بھلا دے سب جگیں کو

ـــــــ

نبی جا کے امنوں نے عرض کینی
بڑائی رب نے تم کو آج دینی

---

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لینا
جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کینا

---

ع حقیقت سب تری ہیں تجھ کوں آکھی

۶ ——— مولانا نصرتی (م ۱۶۸۲ء) صاحب معراج نامہ

مضامین سوں جا بجا بات تول
دکھایا سکت فیض کا حق کے بول
یکیک فن میں کی سحر کی بہت چھند (ایک ایک)
خبیتا کی جیباں کو کیتا ہوں بند

۷ ——— ولی دکنی (م ۱۷۴۴ء) ابھی جو خالص اردو غزل کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں، کہیں کہیں پنجابی الفاظ استعمال کرتے ہیں:-

کیا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ جیسی کچھ مرا تدبیر اس میں

---

کروں کیا وقت نیئں ہے اب ملن کا
نہ کچھ فرصت ہے اب یا ناں کرن کا

## کیا پشتو، سندھی اور پنجابی قومی زبانیں بن سکتی ہیں؟

کسی زبان کی اہمیت کا اندازہ اُس کے لٹریچر سے لگایا جاتا ہے۔ پشتو ارتقاء کے ابتدائی مدارج طے کر رہی ہے۔ اُس کے پاس خوشحال خاں، بابا رحمان کا کلام اور چند دیگر متفرق کتابیں ہیں وبس۔ سندھی ادب سے تو میں آگاہ نہیں۔ البتہ پنجابی ادب کے طول و عرض سے ہر کوئی باخبر ہے۔ ہیر وارث شاہ، سوہنی مہینوال ... سسی پنوں، پکی روٹی، نور نامہ، کچھ کافیاں وغیرہ۔ کچھ غیر اہم سے مذہبی رسائل بس یہ ہے پنجابی ادب کی کل کائنات:۔

کسی زبان سیکھنے کا مقصد اُس زبان کے علوم تک رسائی ہے۔ زبان ایک کلید ہے جس سے اُس زبان کے علمی خزانے کھولے جاتے ہیں۔ اگر کسی خزانے کو کھولنے کے بعد اُس سے دس بیس گلی سڑی کتابیں نکلیں تو اس تکلیف فرمائی کا فائدہ؟ انگریزی میں تقریباً اڑھائی کروڑ کتابیں ہیں۔ عربی میں بھی اس کے لگ بھگ فارسی میں دس لاکھ اور اردو میں تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت، فقہ، شعر، ادب، موسیقی، افسانہ، فلسفہ، ریاضی، لغات، صرف و نحو، عروض و دیگر شعبہائے علم پر اندازاً چھ لاکھ کتابیں موجود ہیں جن کی تالیف و تصنیف پر پانچسو برس لگے۔ اور ہزاروں اہلِ قلم نے اِس کارِ خیر میں حصّہ لیا۔ ایسی عظیم الشان زبان کو چھوڑ کر پنجابی اور پشتو جیسی مفلس زبانوں کو قومی زبان بنانا۔ اور تمام قوم کو ہیر سسی پنوں اور خوشحال خان کی چند نظمیں پڑھنے پر لگا دینا۔ اپنا ہی خسارہ ہے

کسی اور قوم کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کے تحت پاکستانیوں کو اس وقت تک انگریزی پڑھنی ہوگی جب تک کہ اُردو تمام علوم وفنون میں خود مکتفی نہ ہو جائے۔

اس وقت انگریزی ہماری دفتری زبان بھی ہے اور یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی کی ان حیثیتوں کو جلد ختم کرنا ہماری حکومتوں کا فرض ہے۔ رہا اسے بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھانا تو یہ سلسلہ ابھی جاری رہنا چاہیے۔

**اُردو پڑھنے میں کوئی دِقت نہیں** اُردو اور پنجابی کے حروفِ ہجا ایک، نوّے فیصد الفاظ مشترک۔ صرف کا۔ دا اور چند اسماء کا فرق۔ پنجابی پڑھنا گویا اُردو سیکھنا ہے۔ پھر اُردو کراچی سے پشاور تک بلا تکلف بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ پشتون اُردو کو پشتو پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پشاور، مردان، نوشہرہ اور کوہاٹ کے سکولوں، کالجوں، دفتروں، عدالتوں بلکہ بازاروں تک میں لاکھوں آدمی اُردو بولتے نظر آتے ہیں۔ کراچی سندھ کا دارالخلافہ تھا لیکن آج وہاں ہر شخص اُردو میں گفتگو کر رہا ہے۔ یہی حال حیدرآباد سندھ کا ہے۔

**ایک اور پہلو** اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اُردو کا خمیر پنجابی، ہندی، فارسی اور عربی سے تیار ہوا ہے۔ فارسی اور عربی کی ہزار ہا تلمیحات، جو قدیم واقعات، پرانی تہذیبوں اور سبق آموز داستانوں کی یاد دلاتی ہیں۔ آج اُردو میں موجود ہیں۔ مثلاً برقِ طور، شعلۂ سینا، نارِ ابراہیم، مسیحا، لیلیٰ، بلقیس، سلیمان وغیرہ، علاوہ ازیں فارسی، عربی کے لاکھوں مترنم الفاظ، متبسم تراکیب اور دل کش تشبیہات ہمارے ادب کا حصہ ہیں۔ جن کی رنگینی سے ہمارے ابوالکلاموں، ظفر علیوں، شبلیوں اور حالیوں

نے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ اگر فارسی و عربی کے رنگین و عظیم الفاظ کا یہ ذخیرہ ان ادیبوں کے پاس نہ ہوتا تو ان کا قلم کبھی نہالِ گلبار نہ بن سکتا۔ پنجابی زبان کے خمیر میں یہ نقص ہے کہ اس کے بودے، کرخت اور بھپ بھسے الفاظ سے رنگین نثر تیار ہو ہی نہیں سکتی۔ بعض لوگوں نے قافیہ، ردیف اور تمثیل کے بل پر پنجابی میں چند اچھی نظمیں ضرور لکھی ہیں۔ لیکن گذشتہ ہزار برس میں اس زبان نے نہ کوئی ابوالکلام پیدا کیا۔ نہ ظفر علی، پنجابی ادیبوں کا رجحان یہ ہے کہ وہ فارسی و عربی الفاظ سے بچتے ہیں اور مقامی بولیوں سے کرخت نامانوس الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ ان کا یہی رجحان پنجابی نثر کو سلیس و رواں نہیں بننے دیتا میری مادری زبان پنجابی ہے۔ لیکن یقین مانئے۔ کہ مَیں آج تک کسی پنجابی تحریر کا ایک صفحہ تک پڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

پنجابی ادیبوں میں بڑے بڑے نقائص دو ہیں۔

اوّل :۔ کہ وہ عربی فارسی الفاظ سے بھاگتے ہیں۔

دوم :۔ کہ واہگہ پار کی سکھی پنجابی کی تقلید کرتے ہیں :۔

نتیجہ یہ کہ جو پنجابی، ہم لاہور سے پشاور تک بولتے ہیں، وہ ان کی تحریرات میں مفقود ہوتی ہے اور اسی لیے عوام کو پڑھنے اور سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے، اگر چند پنجابی عوام کو آپ ایک اُردو کہانی سُنائیں اور دوسری کسی پنجابی ادیب کی لکھی ہوئی۔ تو اوّل الذکر کو تو سب سمجھ جائیں گے۔ لیکن اس پنجابی کہانی کو شاید ہی کوئی پنجابی سمجھ سکے۔

ان واقعات کی روشنی میں یہ کہنا کہ یہاں اُردو ایک اجنبی زبان ہے اور یہ مقامی علاقائی زبانیں قومی زبانیں بننے کی اہلیت رکھتی ہیں، صحیح نہیں ——

اس مضمون کا بیشتر مواد علامہ محمود شیرانی کی (پنجاب میں اُردو) سے لیا گیا ہے

# دِلؔ اور آب و گِل کی دُنیا

دنیائیں دو ہیں، ایک یہ آب و گِل کی دنیا جو لالہ و گل مہ و انجم اور دشت و جبل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور دوسری مخفی دنیا، جو ہر چند اِن آنکھوں سے نظر نہیں آتی، لیکن اس کے وجود سے انکار ناممکن ہے۔ جب ہم اس کائنات پر ایک متجسانہ نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے ایک دانشِ اعلیٰ یا سپریم انٹیلجنس (Supreme Intellgence) کا احساس ہوتا ہے جو خلق و آفرینش کے حیرت انگیز کرشمے دکھا رہی ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن جیسی دو زہریلی گیسوں کی ترکیب سے پانی بنا رہی ہے۔ جس کے کروڑں آفتاب و مہتاب آزل سے فضائے نیلگوں میں محوِ پرواز ہیں۔ ان میں نہ تصادم ہوتا ہے اور نہ ان کی رفتار میں فرق آتا ہے۔ ہماری زمین ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوِ سفر ہے۔ اگر اس کی رفتار سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے لیل و نہار دس گنا طویل ہوتے۔ ایک سو بیس گھنٹوں کے لمبے دن میں ہم تمازتِ آفتاب سے جھلس جاتے درخت سوکھ جاتے، دریاؤں اور چشموں کا پانی ابلنے لگتا اور دوسری طرف اتنی طویل رات میں ہر چیز منجمد ہو جاتی ہمارے آفتاب سے ۱۲ ہزار درجے کی حرارت خارج ہو رہی ہے۔ اور یہ زمین سے اندازاً ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ اگر یہ حرارت دگنی ہوتی یا یہ فاصلہ نصف

ہوتا تو کائنات میں آگ بھڑک اٹھتی۔ آپ جانتے ہیں کہ سمندروں کا مدوجزر چاند کی وجہ سے ہے جو ہم سے اندازاً ڈھائی لاکھ میل دُور ہے۔ اگر یہ فاصلہ دس گنا کم ہوتا تو سمندر کی لہریں دس گنا اونچی ہوتیں اور ہر منٹ کے بعد ساری ہی زمین پانی میں ڈوب جاتی۔ یہ اور اس قسم کے بیشمار دیگر حقائق سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کائنات کا نظم ونسق ایک زبردست قوت ناظمہ کے ہاتھ میں ہے جو مہندس و محاسب ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہے۔ یہی قوت، بہاروں اور مہ پاروں کی خالق ہے نیز لالہ و گل اور مہ انجم ہیں اسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ حیات میں بڑی قوت ہے۔ جب ہم ایک باریک سا بیج کسی چٹان پر پھینک دیتے ہیں تو اس کی ننھی سی جڑ سنگین چٹانوں کا سینہ چیر کر نکل جاتی ہے۔ دیو دار کا سو فٹ اونچا اور چار سو من وزنی درخت کششِ ثقل، آندھیوں اور طوفان تینوں کا مقابلہ کر رہا ہے اور گرتا نہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس قوت کے سہارے قائم ہے؟ جواب ہے حیات۔ اللہ حیات کا سرچشمہ ہے۔ جب کوئی فرد اس منبعِ حیات سے رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ تو اس میں ایک نئی زندگی کروٹیں لینے لگتی ہے۔ اِس جسمانی زندگی سے عظیم تر، مہیب تر اور جمیل تر

آر۔ ڈبلیو۔ ٹرائن اپنی شہرہ آفاق کتاب ان ٹیون وِد دی انفائنٹ۔۔۔۔۔۔۔
(IN TUNE WITH THE INFINITE) میں کیا پتے کی بات کہتے ہیں۔

اِس کائنات کی مرکزی حقیقت حیات و قوت کا وہ منبع ہے جو ہر چیز میں زندگی بھر رہا ہے اللہ کی تخلیقی، تعمیری طاقتیں بعض ایسے قوانین کی معرفت عمل پیرا ہیں جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہیں۔
چمن کا ہر متبسم پھول اور فضا کا ہر برف کا گالا چند عظیم و غیر متبدل قوانین

کی تعمیل پر مجبور ہے۔ کائنات میں ایک ایسی طاقت موجود ہے۔ جو ان قوانین کی واضع ہے۔ اسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ یہ کائنات صرف اللہ سے معمور ہے وہی ہر چیز کا منبع و مرجع ہے اور اس سے الگ کوئی چیز موجود نہیں"

**قوت کا خزانہ** انسان کی طویل تاریخ اور اس کی تلاش و طلب پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ طاقت کے خزانے دو ہیں۔

اوّل:۔ یہ کائنات جس سے ہم پٹرول، کوئلہ اور بجلی لینے کے بعد آج جوہری توانائی حاصل کر رہے ہیں۔

دوم:۔ دل کی دنیا۔ جہاں مہیب توانائی کے ذخائر نہاں ہیں۔ وہی توانائی جو ایک ڈانٹ سے قلزم کو خشک اور چاند کو دو نیم کر سکتی ہے۔ جو چٹانوں کو چیر کر اُن سے چشمے نکال سکتی ہے۔ جو رب کائنات کو ایک بالشت کے فاصلے پر لا سکتی ہے۔ اگر یہ دونوں توانائیاں شاہراہِ زندگی پر ہم سفر ہو جائیں تو انسان اللہ کا نائب بن جاتا ہے۔ خالص مادی طاقت جس کے ساتھ رُوح کی داخلی طاقت شامل نہ ہو نہ تو کوئی انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور نہ دنیا کو پیامِ امن دے سکتی ہے۔ آج یورپ کے پاس مادی قوت کے بے پناہ وسائل موجود ہیں۔ لیکن روحانی لحاظ سے بحد مفلس و بے نوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُس کی قوت اُس بے لگام حبشی کی سی ہے جو شراب میں مست اور شمشیر بدست کسی بستی میں داخل ہو جائے۔ درست فرمایا تھا حکیم مشرق نے ۔

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب

پیامِ مشرق کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو"۔

انقلاب وہ آگ ہے جس کے شعلے سینے سے نکل کر جہانِ کہن کے کاشانے پر برستے ہیں حضرت خلیلؑ، کلیمؑ اور محمدؐ علیہم السلام نے عالمِ پیر کو خاکستر بنانے کے بعد جہانِ تازہ کی بنا ڈالی تھی۔ اور یہ شعلے اُن کے آتشکدۂ دل ہی سے نکلے تھے۔ اسی آگ کا دوسرا نام عشق ہے۔ جب ایک انسان اللہ سے رابطہ قائم کرنے لگتا ہے تو شروع میں اُسے جسمانی کوفت ہوتی ہے، بعد میں تعمیل عادت بن جاتی ہے پھر اُسے اِس رابطہ میں لذّت محسوس ہونے لگتی ہے، ایک قسم کی مبہم، پُراسرار اور آسمانی لذّت جو فکر و ذکر کے منازل طے کرنے کے بعد بہت عمیق ہو جاتی ہے اور دل ایک ایسا حرم بن جاتا ہے۔ جس میں اللہ کے سوا اور کوئی معبود سما ہی نہیں سکتا مادی عظمتیں حقیر نظر آنے لگتی ہیں۔ رُوح جلیل و جمیل بن جاتی ہے اور اللہ کے قرب کا احساس بڑھ جاتا ہے، یہی وہ منزل ہے جہاں بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور جب وہ تین سو تیرہ بے سروسامان سرفروشوں کو لے کر میدانِ بدر میں جاتا ہے تو آسمانوں کے پٹ کھل جاتے ہیں اور کئی ہزار مسلح فرشتے اس کی مدد کے لیے جنگاہ میں اُتر آتے ہیں۔ جب اس کے عساکر ایران و روم کا رُخ کرتے ہیں تو قیصر و کسریٰ کے تمام وسائلِ قوت و ہیبت بیکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں لینن اپنے ملک میں صرف ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھا تھا۔ ساڑھے تین کروڑ

زمینداروں اور سرمایہ داروں کو ذبح کرنے کے بعد بھی ابھی تک اُسے مکمل کامیابی نہیں ہوئی، دوسری طرف حضور پُرنور صلعم نے مدینہ کے دس سالہ قیام میں پانچ عظیم انقلابات بپا کیے۔ آپ نے لوگوں کا:۔

۱:۔ مذہب بدلا۔

۲:۔ زندگی کے متعلق اُن کا نقطہ نگاہ تبدیل کیا۔

۳:۔ نئے اخلاقی نظام کی بنیاد ڈالی

۴:۔ سلطنت دروینِ با خدمت گریست" (سید القوم خادمہم) کا نعرہ بلند کیا۔

۵:۔ ایک ایسا اقتصادی نظام جاری کیا جس سے دنیا نا آشنا تھی۔

سوال یہ ہے کہ حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ میں یہ طاقتیں کہاں سے آئی تھیں کہ جس طرف کا رخ کرتے تھے کامیابی اُن کے قدم چومتی تھی۔ جواب ہے، دل سے دل توانائی کا بہت بڑا مرکز ہے اور جو لوگ اس توانائی سے محروم رہتے ہیں انھیں دولت کے انبار اور سربفلک محل کبھی توانا نہیں بنا سکتے دولت دلِ زندہ کے ساتھ زینت ہے اور دلِ تیرہ کے ساتھ لعنت۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری
اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

نگاہِ شوق میسّر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

**تمثیل** | قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق ایک تمثیل دی ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ۔۔ (نور)

[اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ یہ نور اس چراغ دان کی طرح ہے جس میں ایک چراغ جل رہا ہو اور شیشے کے گوب میں رکھا ہو]

یہ کائنات شیشے کا ایک گلوب ہے جس سے نورِ الوہیت چھن چھن کر ہر چار سو پھیل رہا ہے۔ جس طرح رات کو کسی کمرے کا روشندان اُس قمقمے یا چراغ کی خبر دیتا ہے۔ جو کمرے کے اندر جل رہا ہو۔ اسی طرح آفتاب و مہتاب کے روشندان صاف صاف بتا رہے ہیں کہ حریمِ حیات میں کوئی بہت بڑا قمقمہ فروزاں ہے انسان کا روشندان اُس کی جبیں یا چہرہ ہے۔ جب اللہ کسی سینے میں گھر بنا لیتا ہے تو پیشانی سے عظمتِ ربانی کی تجلیاں پھوٹ نکلتی ہیں۔

خواجہ اجمیریؒ، داتا گنج بخشؒ اور بابا فرید شکر گنجؒ کی یہی وہ تجلیاں تھیں کو جنہیں بت پرست دیکھ پاتے تو زنار توڑ ڈالتے اور ربِ کعبہ کے سامنے سربسجود ہو جاتے۔ ان لوگوں کے نورانی چہروں نے وہ کام کیا جسے غزنوی، ایوبی اور ابدالی جیسے ہزارہا کشور کشاؤں کی تلواریں سرانجام نہ دے سکیں:۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ از فرِ فریدوں بہ

اللہ نے قرآن میں باخدا اور بے خدا بندوں کی علامت ہی یہ بتائی ہے کہ تم ان کو ان کے چہروں سے پہچان سکو گے۔

سِیمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ...... (فتح)

[نیک لوگوں کے چہروں پر سجدہ اور عبادت کے آثار ہیں]

یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمَاهُمْ ۝ ............ (رحمان)

[بدکار اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے]

کہتے ہیں۔ کاتبینِ قدرت ہر انسان کے اعمال لکھ رہے ہیں اور کہیں لکھتے ہوں یا نہ۔ صفحۂ جبین پر یقیناً لکھ رہے اور اس تحریر کو پڑھنے کیلئے کسی خاص آنکھ کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے ماحول پر نگاہ ڈالیں آپ کو ہر طرف جہالت اور گناہ میں بھرے ہوئے ہزارہا چہرے نظر آئیں گے اور کچھ ایسے بھی جنھیں علم و پاکیزگی نے منوّر کر رکھا ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ وہ حسین و جمیل بنے۔ لیکن اس کی راہ صرف ایک ہے یعنی اللہ سے عمیق رابطہ۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

[اللہ اہلِ ایمان کا دوست ہے اور انھیں تاریکیوں سے نکال کر دنیائے نور کی طرف لے جاتا ہے]

چہرے کے نور یا چمک کی کئی قسمیں ہیں۔

اوّل:- بچپن کی چمک جو دس بارہ برس تک ساتھ دیتی ہے۔ اس کے بعد جوانی کا نور آتا ہے۔ اگر جوانی کے نور کو سنبھال کر رکھا جائے تو یہ نور تیس پینتیس برس تک کی عمر تک ساتھ چلتا ہے۔ علم میں بھی ایک چمک ہے جو چالیس پینتالیس سال کی عمر تک رہتی ہے اس کے بعد صرف ایک ہی روشنی ساتھ دیتی ہے اور وہ ہے نورِ عبادت۔ مبارک ہیں وہ نفوس جو جوانی ہی میں اس روشنی کو حاصل کریں اور یہ

شمع دان بن جائیں۔ جن کے سینوں میں آسمانی شمعیں جل رہی ہوں۔

**وجدان** انسانی حواس صرف پانچ نہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی ایک حس موجود ہے۔ جس سے کوہستان کی بلند و پست چوٹیوں اور تاروں کی بکھری ہوئی محفل میں رشتۂ وحدت نظر آتا ہے اور کائنات میں ایک رُوح۔ ایک قوتِ ناظمہ اور مشیتِ قاہرہ کا احساس ہوتا ہے۔ اس حِس کا نام وجدان ہے اور وجدان کو چمکانے کا نام تصوف ہے۔ جسے خدا شناسی بھی کہتے ہیں:۔

خُودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

تصوّف کوئی فلسفیانہ نظریہ حیات نہیں بلکہ نظامِ حیات ہے۔ جس سے کائنات کے متعلق تصور ہی بدل جاتا ہے۔ قرآن کائنات کو بیکار نہیں سمجھتا بلکہ بار بار مشاہدہ موجودات کی ہدایت کرتا ہے اور پھر مرئی حقائق سے ایک غیر مرئی عالم کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض مذاہب نے دین کو دنیا اور رُوح کو مادہ سے الگ کر دیا تھا۔ لیکن اسلام رُوح و مادہ کو ایک ہی حقیقت کے دو پہلو قرار دیتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ وحدتِ رُوح و مادہ کا تصور اسلامی تمدن کا عظیم شاہکار ہے۔

زندگی کی تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ جلال اور جمال سے۔ ان ہر دو کے مظاہر بیشمار ہیں۔ جلال ایک طرف تو کہساروں، سمندروں اور آسمانوں میں پایا جاتا ہے اور دوسری طرف تلوار، سلطنت اور دولت میں لیکن جمال کا سب سے بڑا مظہر علم ہے اور جمال کا عشق۔ جب علم و عشق ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رہ زندگی پر روانہ ہوتے ہیں تو مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو جاتی ہیں۔

چو خود را در کنارِ خود کشیدم
بہ نورِ تو مقامِ خویش دیدم
دریں دیر از نوائے صبحگاہی
جہانِ عشق و مستی آفریدم

اللہ ایک چراغ ہے جو کائنات میں جل رہا ہے اور اس کا تصور وہ قمقمہ ہے جو سینۂ انسان میں فروزاں ہے۔ یہ دیا بجھ جائے تو قذب و نظر پہ تیرگیاں مسلط ہو جاتی ہیں اور اس تاریک ماحول میں حیات بھٹکنے لگتی اور بڑے بڑے حادثوں سے دو چار ہوتی ہے۔ میرے نقطۂ نگاہ سے انساں کا سب سے بڑا حادثہ اللہ سے کٹ جانا ہے۔

**مقناطیسیت** یورپ اور امریکہ میں علماء کی ایک بہت بڑی جماعت گذشتہ صدی کے اواخر سے دنیائے دل کے اسرار بے نقاب کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ ان میں سر ولیم کرکس، لارڈ ریلے، سر آرچی بالد، پروفیسر گلبرٹ پروفیسر ولیم جیمز، ڈاکٹر الیگزینڈر کانن اور ڈاکٹر کرنگٹن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی شخصیت سے کچھ غیر مرئی شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو محبت یا نفرت کا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اگر اعمال و خیالات میں پاکیزگی ہو تو ایسے آدمی سے لازماً محبت کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر کرنگٹن اپنی کتاب "پروجیکشن آف ایسٹرل باڈی" میں "ادرا" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

یہ ایک غیر مرئی کہربائی روشنی ہے جو انسانی جسم سے خارج ہوتی ہے

اس کا اثر یا تو جذب و محبت ہوتا ہے یا نفرت۔

ڈاکٹر الیگزینڈر کانن اپنی کتاب [The invisible influence]

میں اس حقیقت کی یوں تشریح کرتے ہیں۔

زمین کی طرح انسانی جسم سے بھی مقناطیسی لہریں خارج ہوتی ہیں جن کا اثر مختلف صورتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ جس شخص کے خیالات و اعمال میں پاکیزگی ہو اس کی خارج کردہ لہریں جذبِ محبت کا اثر پیدا کرتی ہیں۔ یہیں سے یہ مسئلہ کہ کیوں بعض لوگوں سے محبت اور بعض سے نفرت کی جاتی ہے۔ حل ہو جاتا ہے۔

تعمیرِ کعبہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

اے رب! میں اپنی کچھ اولاد تیرے مقدس گھر کے پاس اس ویران وادی میں بسا رہا ہوں تاکہ یہ صلوٰۃ قائم کریں (اور اس طرح لوگوں کو اللہ سے راہ و رسم پیدا کرنے کا طریقہ سمجھائیں) اے رب! لوگوں کے دل میری اولاد کی طرف مائل کر۔

سرورِ دو عالم صلعم ہر نماز کے بعد عموماً یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

رَبِّ حَبِّبِ النَّاسَ اِلَیَّ وَحَبِّبْنِیْ اِلَیْھِمْ

ترجمہ:۔ اے رب! لوگوں کو میرا اور مجھے لوگوں کا محبوب بنا]

محبوبیت کا یہ مقام بڑا عظیم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے بڑی کٹھن راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اور عام مشاہدہ یہ ہے کہ عبادت و طاعت کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ جنید و بایزید، اویس و سلمان اور دیگر ہزار ہا اہلِ دل اس منزل

تک اِسی راہ سے پہنچے تھے۔ شہرت و محبوبیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے بے شک چنگیز و ہلاکو۔ ہٹلر اور نپولین عالمگیر شہرت کے مالک تھے۔ لیکن وہ کسی ایک دل میں بھی اپنا مقام نہ بنا سکے اور دوسری طرف حسینؓ و حیدرؓ، فاروقؓ و صدیقؓ اور رومی و غزالی کا نام سنتے ہی کروڑوں مسلمانانِ عالم کی گردنیں تعظیماً جھک جاتی ہیں۔ بقولِ غالب۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اِک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

## جسمِ لطیف

دنیائے روح کے متعلق تازہ انکشاف یہ ہے کہ ہمارے اس جسمِ خاکی کے اندر ایک اور جسم اسی طول و عرض کا داخل ہے جو غیر فانی و ابدی ہے اسے انگریزی میں ایسٹرل باڈی اور ہماری زبان میں جسمِ لطیف کہتے ہیں۔ اسے ہم ہر رات خواب میں دیکھتے ہیں۔ نیند میں جسمِ خاکی بستر پہ بے حس و حرکت پڑا ہوتا ہے اور جسمِ لطیف اِدھر اُدھر گھوم رہا ہوتا ہے یہ جسمِ لطیف کہاں سے آتا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ یورپ کے ایک حکیم لیڈبیٹر اتنا ہی بتا سکے۔

پیدائش کیا ہے؟ اس مادی و جسمانی دنیا میں ورود اور موت کیا ہے؟
اثیری دنیا میں نیا جسم۔ یہ اثیری دنیا جسمانی دنیا کی طرح حقیقی چیز ہے۔
ایک اور مقام پر یہی حکیم کہتے ہیں۔
تم جسم نہیں بلکہ جسم کے باسی ہو۔ یہ اجسام محض خول ہیں جنہیں زندگی یوں ٹھکرا دیتی ہے۔ جس طرح کپڑے بدل لیے جائیں

زندگی کہاں سے آئی؟ اور کدھر جا رہی ہے؟ ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں۔ قرآنِ حکیم سے صرف اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ ہم سب اللہ کی طرف جا رہے ہیں۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔) اور ہماری آخری منزل اللہ ہے۔

غالباً اس منزل کی راہ اس خاکدان سے ہو کر آگے نکلتی ہے اور جسمِ خاکی جسمِ لطیف کا یہ عارضی بندھن اس لیے ہے کہ ہم پاکیزہ خیالات۔ بلند اعمال علم و عبادت سے جسمِ لطیف میں وہ قوت پیدا کر لیں کہ وہ منزل بہ منزل اپنے مرکز تک پہنچ جائے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ ...... (بروج)

[شفق کی قسم، رات اور اُن تاروں کی قسم جنھیں رات فراہم کرتی ہے نیز چاند کی قسم جب وہ بدرِ کامل بن جاتا ہے کہ تم سب منزل بہ منزل اوپر کو اٹھو گے۔]

اس مضمون کو لیڈبیٹر یوں پیش کرتے ہیں۔

+ نیک اعمال سے ہم رفتہ رفتہ ایک ایسے افق پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں رُوحِ کائنات سے شرفِ ہم کلامی حاصل ہو جاتا ہے

جسمِ لطیف کے متعلق ایک نہایت حیرت انگیز انکشاف یہ ہوا ہے کہ ہر گناہ، بیماری یا دکھ بن کر جسمِ لطیف سے لپٹ جاتا ہے اور وہاں سے بیماری

جسم خاکی میں منتقل ہوتی ہے۔ شروع میں تو یہ بات لیڈ بیٹر جیسے صوفی ہی کہا کرتے تھے لیکن اب امریکہ کے ایک طبی ڈاکٹر نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی وہ کہتا ہے

روح یا دماغ جسم کا قسمتی محافظ ہے گناہ کی وجہ سے روح برص اور دیگر امراض کا شکار ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ بیماریاں جسم میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف محبت نیک دلی، فیاضی اور رحم و مروت سے جسم میں ایسی صحت افزا زندگی بخش اور مصفی رطوبتیں پیدا ہوتی ہیں جو گناہ کے مرض آلود اثرات کو زائل کر دیتی ہیں۔

جب کوئی مریض حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جاتا تو پہلا سوال یہ ہوتا "کیا تم میرے پیغام کو تسلیم کرتے ہو۔ اور علاج کرنے کے بعد آئندہ کے لیے پرہیز یہ بتاتے "جاؤ اور آئندہ کے لیے گناہ مت کرو" [Go and sin no more]

قرآن حکیم بھی کچھ اسی طرح کی بات کہتا ہے۔ عربی زبان میں ایک لفظ "سیئہ" ہے جس کے معنی ہیں بدکاری، سزا، دکھ اور بیماری۔ اور اس کی جمع ہے۔۔ "سیئات" قرآن میں بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَات

[کہ حسنات یعنی نیک اعمال سیئات یعنی گناہ، دکھ اور بیماریوں کو دور کر دیتے ہیں۔]

یہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ اللہ کے نیک بندے جسمانی امراض کا بہت کم شکار ہوتے ہیں اور بدکار ذہنی پریشانیوں اور جسمانی امراض میں عموماً گرفتار رہتے ہیں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور پابندی عبادت کے ساتھ ساتھ

اسمائے حسنہ کا ورد اس سلسلہ میں بڑا مؤثر ہے اور غالباً اللہ نے اسے یہی حکم دیا تھا

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِہَا ۔

(اللہ کے نام بڑے ہی پیارے ہیں اسے انہی ناموں سے یاد کرو)

**ایک سوال** ہم مغربی پاکستان کی کسی بستی میں چلے جائیں۔ وہاں بلھے شاہ، فرید، باہو شاہ کی کافیوں کا چرچا پائیں گے۔ اسی طرح مولانا رومی کی مثنوی جامی کی یوسف زلیخا اور سعدی کی گلستان صدیوں سے پڑھی جا رہی ہے اور دوسری طرف خود ہمارے عہد میں ایسے سینکڑوں شعراء و ادباء موجود ہیں جن کی تخلیقات سے ان کے ہمسائے تک ناآشنا ہیں۔ انھیں نہ قبولِ عام حاصل ہے نہ رنگِ دوام۔ حالانکہ ان میں بعض کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں اور خیال میں بھی خاصی پرواز و ندرت ہے۔ بعض ایسے ادیب بھی ہیں جن کے نام سے تو سب آشنا ہیں۔ لیکن ان کا کلام عظمت و احترام سے محروم ہے مثلاً امام دین گجراتی وغیرہ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قبولِ عام و احترام کی کیا وجہ ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں مثلاً کہ ادیب کا اسلوب انوکھا تھا، شاعر کے خیالات میں پرواز تھی، موضوعِ کلام بلند تھا۔ وقس علی ہذا اسی سوال کا ایک جواب قرآن نے دیا ہے اور وہ یہ کہ۔

"اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا"

(مزمل)

اس آیت میں "اقوم" کا لفظ تشریح چاہتا ہے۔ اس کا مادہ ق۔و۔م (قوم) ہے جس سے مختلف مشتقات تیار ہوئے۔ مثلاً قیام، تقویم، اقامت

قَوام، قِوام، قیّم، قائم، استقامت، وغیرہ۔ اِن کے معنی جدا جدا ہیں۔ لیکن ایک مفہوم ایسا ہے جو اِن تمام میں مشترک ہے اور وہ ہے ثبات۔ مضبوطی یا استحکام تو اقوم کے معنی ہوں گے۔ "بہت مضبوط، پائیدار اور محکم"۔ اور آیت کا ترجمہ ہوگا۔ تحقیق شب خیزی نفس کو کُچلنے اور کلام کو محکم و پائیدار بنانے میں بہت ممّد ہے دعائے سحرگاہی کا نتیجہ کلام کا دوام و استحکام کیوں ہے؟ عقل سمجھنے سے قاصر ہے لیکن انسان کا تجربہ و مشاہدہ یہ ہے کہ ہمیشہ ایسا ہوتا رہا اور غالباً یا ہو اور بُلّھے شاہ کی قبولیت کی وجہ بھی یہی تھی۔ اقبالؔ بھی اس راز سے آگاہ تھے۔ فرماتے ہیں :-

عطّار ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

اور ساتھ ہی سحر خیز بھی تھے ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ایک خط میں جو مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام تھا، لکھتے ہیں :-

"صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں اور اس کے بعد نہیں سوتا سوائے اس کے کہ مصلّے پر اونگھ جاؤں"

اقبال نامہ حصّہ اول ۴۶-۵۰

اقبالؔ نے اللہ سے کبھی دولت و حشمت نہیں مانگی، بلکہ ہمیشہ شورِ رومیؔ و صدقِ سنائیؔ کی تمنا کی۔

عطا کن شورِ رومی، سوزِ خسرو
عطا کن صدق و اخلاصِ سنائیؔ

اور بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں یہ دولت حاصل ہوگئی تھی۔

بیا بمجلسِ اقبال یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

بیا

اگرچہ زادہ ہندم، فروغِ چشمِ من است
ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

اور اپنے کلام کے متعلق فرماتے ہیں۔

مسنج معنیٔ من در عیارِ ہند و عجم
کہ اصلِ ایں گہر از گریہ ہائے نیم شبی است

## پاکستان کے اہم مسائل

پاکستان کے اہم مسائل دو ہیں۔ اسٹیل اور اسپرٹ یعنی فولاد اور من کی دنیا۔ میرے خوابوں میں ایک ایسا پاکستان آباد ہے جس کے چپے چپے پر کارخانوں کی بلند چمنیاں دھواں اگل رہی ہوں اور ہر فرد ایک ایسا جراغ دان ہو جس کے سینے میں سوز و گداز کی شمع فروزاں ہو۔ یہ کام اہلِ قلم سے بہتر کون کر سکتا ہے، ایران کے ادیبوں اور شاعروں نے ایرانِ جدید کی تخلیق کی روسو، والٹیئر اور ہالبش نے انقلابِ فرانس کی بنا ڈالی۔ گوئٹے اور فان ہیمر نے جرمنی کو مشرقی سوز و گداز سے آشنا کیا۔ ایک کارل مارکس نے آدھی دنیا کا نقشہ بدل ڈالا اور ایک اقبال نے دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے سینوں میں آگ بھڑکا دی۔ -: اور اب :-

اے ادیبانِ پاکستان! مستقبل کا مورخ آپ کا منتظر ہے

# مسئلہ کشمیر کا حل

برطانیہ گزشتہ دو تین صدیوں سے مسلمانوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہوا ہے پہلے مغلوں کو پیٹا، پھر ترکوں کی خبر لی۔ اس کے بعد باقیماندہ مسلم ریاستوں کو صاف کیا اور اب دنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت "پاکستان" کے درپے ہے۔ کیا تقسیم ہند کے وقت برطانیہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ جس کے تمام دریا کشمیر سے آتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ ہمارے سینے میں یہ زہر آلود خنجر گھونپنے کے بعد ہمارا ہمدرد بن بیٹھا اور اپنے خرچ پر یہاں سینکڑوں مشیر بھیج دیئے۔ بایں ہدایت کہ خبردار! پاکستان کو صحیح مشورہ ہرگز نہ دینا۔ ان کی درسگاہوں سے انگریزی زبان کو کبھی نہ نکلنے دینا تاکہ یہ ہمیشہ ہماری آنکھوں سے دیکھتے اور ہمارے دماغ سے سوچتے رہیں۔ فولاد و خلا کے اس عہد میں اسے ایک چھٹانک فولاد نہ بنانے دینا۔ اس کے پہاڑ معادن اور بہترین فولاد سے لبریز ہیں۔ یہی کہے جانا کہ آپ کا فولا ناقص ہے مہنگا پڑے گا۔ باہر سے منگواؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔ اگر یہ قوم اسلحہ کا کوئی کارخانہ لگا بھی بیٹھے تو اسے چلنے نہ دینا۔ اور اگر وہ چلانے پر اصرار کرے تو اس میں اسلحہ کی جگہ لالٹین اور صابن بنانا۔ اگر کسی وقت فولاد کا کارخانہ لگانے پر مجبور ہو جاؤ۔ تو دو یا تین لاکھ ٹن کا پلانٹ لگانا۔ تاکہ پیداوار

کم اور خرچ زیادہ آئے اور فوجی ضروریات تو رہیں ایک طرف۔ ایک ضلع کی اہم سی ضروریات بھی پوری نہ کر سکے نیز خیال رکھنا کہ صنعتی اور فوجی طور پر یہ ملک نہایت کمزور رہے اور اپنی زرعی پیداوار بیچ کر ہم سے کاریں اور ریڈیو خریدتا رہے۔

برطانیہ ایک دولت مند ملک ہے صرف ایک لاکھ میل کا رقبہ، پانچ کروڑ کی آبادی اور اس کا سالانہ بجٹ اربوں پونڈ کا ہوتا ہے دوسری طرف پاکستان آبادی میں دگنا اور رقبے میں چار گنا ہے۔ لیکن اس کا بجٹ صرف دو ارب روپے یعنی چودہ کروڑ پونڈ سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دولت کہاں سے آ رہی ہے جواب یہ ہے کہ ربڑ اور ٹین ملایا سے، چاول، پٹ سن اور کھالیں پاکستان سے تیل عراق، ایران، کویت اور بحرین سے۔ اور سونا عرب سے جا رہا ہے۔ اگر یہ ممالک جاگ اٹھیں۔ اپنی دولت کو خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں۔ تو مغربی جرمنی، بلجیم، ہالینڈ، فرانس اور انگلینڈ بھوک سے ہلاک ہو جائیں۔ برطانیہ کی نجات اسی میں ہے۔ کہ ہر مسلم ریاست کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا رہے۔ تاکہ وہ داخلی مسائل کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے۔ ناصر کی چھاتی پر یہودی بٹھا دیا۔ ایران میں داخلی سازشوں کا جال بچھا دیا۔ عراق کے دامن میں کردوں کا کانٹا الجھا دیا۔ ترکی کو معاشی ابتری اور سیاسی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ پاکستان کو قضیہ کشمیر میں الجھا دیا۔ انڈونیشیا، کے کاشانے پر ہالینڈ کا ناگ چھوڑ دیا۔ اس طرح ہر مسلم ریاست کو کسی نہ کسی بپتا میں پھنسا کر خود برطانیہ زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ لطف یہ کہ انگریز جس ملک کو جتنا اُلو بناتا اور لوٹتا ہے وہ اس کا اتنا ہی گرویدہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسی قوم سے یہ امید، کہ وہ مسئلہ کشمیر میں ہماری امداد کرے گی۔ سانپ سے شہد کی توقع رکھنا ہے۔

**ہماری غلطیاں** مسئلہ کشمیر کو الجھانے میں خود ہم نے بھی کوئی کمی نہیں کی تقسیم ہند اور ریڈ کلف اوارڈ کے بعد اپنی افواج کی باگ ڈور جنرل گریسی کے حوالے کرنا پہلی غلطی تھی۔

۲۔ جب ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ کو ہندوستان کی فوجیں طیاروں کے ذریعے سرینگر میں اتر رہی تھیں۔ اس وقت جموں، پٹھانکوٹ روڈ پر قبضہ نہ کرنا دوسری غلطی تھی۔

۳۔ جب جہادِ کشمیر میں ہندوؤں کے چھکے چھوٹ چکے تھے اور وہ ہتھیار ڈالنے ہی والے تھے۔ اس وقت "گولی بند کرو" کا حکم دینا تیسری غلطی تھی۔

۴۔ جب ۱۹۴۸ء میں بھارت نے سلامتی کونسل کے سامنے دو مرتبہ استصواب پر اظہارِ رضامندی کر لیا تھا اور اس کے بعد ٹال مٹول شروع کر دی تھی تو اسے مہلت دیئے جانا اور کئی کئی سال تک اس مسئلہ کو نہ اٹھانا چوتھی غلطی تھی۔

۵۔ گزشتہ برسوں میں بھارت نے اپنے ہاں فولاد کے سات، اور اسلحہ کے چھ کارخانے لگائے ہیں۔ جو توپیں، ٹینک، جیٹ، اور بحری جہاز تک بنا رہے ہیں اور آج وہ از سرتا پا فولاد سے مسلح ہو چکا ہے۔ دوسری طرف ہم اس عرصے میں کاریں، ٹرانسسٹر اور کولڈ خریدتے اور جگہ جگہ گلبرگ اور سمن آباد بناتے رہے نتیجہ یہ ہمارے ہاں سامان عیش میں اضافہ ہوا اور بھارت ایک مہیب قوت بن گیا۔ ضعف اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ صرف رحم کی اپیل کر سکتا ہے۔ فولاد سے ہماری یہ المناک غفلت جو اب بھی جاری ہے۔ وہ جرم ہے۔ جس کے نتائج بڑے ہی عبرتناک ہوں گے۔

۶۔ مختلف ممالک میں ہمارے سفیر پچھلے پندرہ سال سے چپ چاپ

تنخواہیں لے رہے ہیں۔ اور اپنے فرائض سہ گانہ سے بالکل بے خبر ہیں۔

۱۔ پاکستان کے روابطِ دوستی متعلقہ ملک سے قائم اور مستحکم کرنا۔

۲ مسئلہ کشمیر کی وضاحت ... اور

۳۔ اسلامی تعلیمات کی عملی نمائش۔

دوسری طرف بھارت کشمیر پر اپنے غاصبانہ قبضے کے جواز میں ہر جگہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دنیا ہمیں جھوٹا اور بھارت کو سچا سمجھنے لگی ہے۔

۷۔ پچھلے تیرہ برس سے ہمارا گزارہ پھوکی اور بے جان دھمکیوں پر ہے کبھی درۂ خیبر کے کسی پٹھان کا فرضی بیان کہ۔

"ہم کشمیر پر پھر حملہ کرنے والے ہیں"

جلی حروف سے اخبارات میں شائع کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کشمیری مہاجر کی مُردہ سی دھمکی۔

۱۔ کہ کیا ان دھمکیوں کو عملی صورت دینے کی ہمت ہم میں ہے۔

۲۔ بھارت سے ہماری جنگ ناگزیر ہے۔ بھارت کو معلوم ہے کہ پاکستان کا ہر نوجوان سپاہی ہے اور اسے ایک سخت جنگ لڑنا ہو گی۔ اس لیے وہ شب و روز سامان جنگ اکٹھا کر رہا ہے۔ اور اس کے سات کارخانے اسی کام پر لگے ہوئے ہیں، کیا ہماری حکومت کو بھی یہ احساس ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک خوفناک دشمن سے ہے؟ اگر ہے تو وہ اس کے لیے کیا کر رہی ہے؟ ہمارا ایک ہی کارخانۂ اسلحہ ہے اور وہ بھی پائپ، شکاری کارتوس اور صابن بنا رہا ہے۔ تو کیا وقت پڑنے پر ہم گولہ بارود امریکہ اور برطانیہ سے منگوائیں گے؟

# علاج کار

اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے چند اقدام ضروری ہیں :۔
اوّل :۔ سیٹو اور سنٹو سے بیزاری کا اعلان۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روس کا رویہ بدل جائے گا۔

دوم :۔ چین سے دفاعی معاہدہ۔

سوم :۔ تمام امریکی و برطانوی مشیروں سے نجات۔

چہارم :۔ قوم کو ایک طویل اور خوفناک جنگ کے لیے تیار کرنا جگہ جگہ ٹریننگ کیمپ کھولنا۔ تمام آبادی کو فوجی تربیت دینا اور ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ کرنا۔

پنجم :۔ ہر قسم کا سامانِ جنگ جہاں سے بھی مل سکے فراہم کرنا۔

ششم :۔ فولاد کے دو تین بڑے بڑے مل لگانا جن کی سالانہ پیداوار ساٹھ لاکھ ٹن سے کم نہ ہو۔

اگر ہم ان خطوط پر آج سے تیاری شروع کر دیں اور دس سال کا ایک جامع منصوبہ بنا لیں تو پھر نہرو کشمیر کو نہیں روک سکتا۔

**سلامتی کونسل** یہ مت بھولیے کہ سلامتی کونسل سازشوں کا ایک عالمی اڈہ، ایک بے جان اور مخنث ادارہ ہے وہ وہیں حرکت میں آئیگی جہاں امریکہ و برطانیہ کا مفاد خطرے میں ہوگا۔ پاکستان جیسے مفلس بے دست و پا اور کمزور ملک کی اسے کیا پرواہ۔ اس لیے اس ادارے کے در پہ دستک دینا چھوڑیئے۔ اور اپنی طاقت

پر اعتماد کیجئے۔ آپ کے سامنے رُوس نے ہنگری پر قبضہ کیا۔ اس سے پہلے بھارت کشمیر اور حیدر آباد کو ہڑپ کر چکا تھا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے نہرو نے گوا ہتھیا لیا۔ فرانس سات برس تک الجیریا پر آگ اور موت برساتا رہا۔ کیا سلامتی کونسل کبھی ٹس سے مس ہوئی؟ اس کی جبین پہ کوئی شکن آیا؟ اگر نہیں آیا تو یقین کیجئے۔ کہ کل اگر بھارت پاکستان پر قابض ہو گیا تو کونسل کو قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

## ہٹلر کی مثال

ہٹلر کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے آٹھ برس کی قلیل مدت میں اپنی قوم کو جو تعداد میں پاکستان سے دو کروڑ کم تھی اتنا طاقتور بنا لیا کہ صرف دو ہلوں میں دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ پہلے ہلے میں وہ آسٹریا، بلجیم ہالینڈ اور فرانس کو روندتا ہوا ردبادِ انگلستان تک نکل گیا اور دوسرے میں سٹالن گراڈ پہ جا دم لیا۔ جان فروشی، شجاعت اور جفا طلبی میں ہماری قوم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا اگر اس قوم کو تربیت اور جدید ہتھیار مل جائیں تو پھر یہ سیلاب نہرو کی بزدل اور جنگ ندیدہ قوم سے نہیں رک سکتا۔ ہماری پارلیمان کا فرض ہے کہ وہ وزارتوں اور ملازمتوں کی تقسیم سے بلند ہو کر پاکستان کو ایک حصارِ سنگین اور قوم کو ایک محکم چٹان بنانے کی فکر کرے اور صدرِ مملکت کی خدمت عالیہ میں التماس ہے کہ قوم کو جفا طلب، سرباز اور میدان طلب بنانے کا پروگرام ابھی سے بنائیں۔ جدید اسلحہ فراہم کریں اور پانچ برس بعد بھارت کو للکاریں۔ کہ یا تو کشمیر چھوڑ دو اور یا ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان میں اترو۔ قائدِ ملت نے خالی مکہ ہوا میں لہرایا تھا اور واگہ سے خلیج بنگال تک ہندو جاتی کی نیند اڑ گئی تھی۔ اگر کل ہم مسلح ہو گئے تو بھارت ہر بات سننے اور ماننے کے لیے تیار ہو جائیگا۔

تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں پہلی ہجری سے ۳۵ ہجری تک اسلامی افواج کو اندازاً ساٹھ خوفناک جنگیں لڑنا پڑیں۔ ہر جنگ میں دشمن کی فوج تعداد میں کم از کم چار گنا۔ اور سامانِ حرب دس گنا زیادہ ہوتا تھا۔ ان میں سے اندازاً سنتالیس جنگیں کسرائے ایران، بیس شہنشاہ روم، اور باقی عرب قبائل اور یہودیوں کے خلاف ہوئیں۔ ہر جگہ مسلمان غالب آئے اور اعداء کو ہر مقام پر خوفناک شکست ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلسل پینتیس برس تک قلت کثرت کو اور بے سروسامانی، پُرسامانی کو کیسے شکست دیتی رہی؟ اگر یہ بات ایک یا دو مرتبہ ہوتی تو ہم اسے حسنِ اتفاق قرار دے دیتے۔ لیکن یہ معجزہ مسلسل پینتیس برس تک ہوتا رہا۔ اس لیے اربابِ فکر و نظر کا فرض ہے کہ وہ ان اسباب و عوامل کا سراغ لگائیں جو دشمنانِ اسلام کی ہزیمت اور ہمارے فتح و ظفر کا باعث بنے۔

یہ فقیر سالہا سال تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا اور اس حتمی نتیجے پر پہنچا کہ ہماری ان فتوحات کی وجہ صرف ایک تھی یعنی اللہ کی عبادت و صلوٰۃ۔ عبادت وہ توانائی ہے جو انجم و افلاک کی تمام مخفی طاقتوں کو جو سیلابوں، طوفانوں، سمندروں اور بجلیوں پر حکمران ہیں، مسخر کر لیتی ہے۔ انسان کو حیوانی پستیوں سے اٹھا کر آستانِ ذوالجلال تک پہنچا دیتی ہے۔ قیدِ اہرمن سے نکال کر بندۂ یزداں بنا دیتی ہے اور پھر اللہ اپنے پیارے بندوں کی سو طرح سے مدد کرتا ہے۔ کہیں فرشتے اتار کر۔ کہیں طوفان چلا کر، کہیں مقابل کے دل میں خوف ڈال کر۔ اگر محارب فریقین غیر مسلم ہوں تو اس صورت میں جنگ کا فیصلہ بہتر ہتھیاروں اور قلت و کثرت سے ہوتا ہے اور اگر یک جانب صحیح معنوں میں اسلامی لشکر ہو۔ خدا اور رسولؐ سے محبت

کرنے والا پاکباز، جذبۂ عشق و شہادت سے سرشار، تمام خطرات سے آزاد گولیوں کی بوچھاڑ میں نماز پڑھنے والا، لب پہ نعرۂ تکبیر اور دل میں عشقِ خدا اور رسولؐ تو ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ایسا لشکر ہر جگہ فتح و ظفر حاصل کرتا ہے۔

الا ان جند اللہ لھم الغالبون (القرآن)

[یاد رکھو۔ کہ اللہ کا لشکر لازماً اور یقیناً غالب رہتا ہے]

ہمارے لیڈر پچھلے پندرہ برس سے صرف ایک ہی کام کر رہے ہیں یعنی منصب اور وزارت کے لیے سازشیں، اسے گرانا، اُسے اٹھانا، یہاں سے پرمٹ لینا وہاں بیچنا۔ کچھ رشتہ دار بھرتی کرا لینا، نئی نئی موٹریں خریدنا، کوٹھیاں بنانا اور ووٹوں کا وقت آئے تو اپنے منشور میں اسلام کو آڑ بنانا۔

انھوں نے قوم کو طاقتور بنانے، فولادی مِل لگانے، اسلحہ بنانے مسئلہ زبان کو سلجھانے۔ اپنی ثقافت کو بنانے۔ اپنے ادب کو فروغ دینے اور مرحوم و مغفور اسلام کو زندہ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ۔

۱۔ پاکستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور حکام اعلیٰ اسلامی تعلیمات سے کوسوں دُور نکل گئے۔

۲۔ ان میں اور اللہ تعالیٰ میں پہاڑ حائل ہو چکے ہیں۔

۳۔ آج ہمارے پاس مادی طاقت ہے اور نہ روحانی قوت۔

فرمائیے۔۔ ان حالات میں ہماری حیات و بقا کی سبیل کون سی ہے۔

**ایک ہی راستہ** اب حالات یہ ہیں کہ ہمارے دوست ہمیں چھوڑ گئے۔ اور انہی دوستوں کے فریب میں آکر ہم فولاد کے مل نہ لگا سکے۔ نہ اسلحہ بنایا نہ قوم

کو سربازی کے لیے تیار کیا۔ اب مجھے انجامِ بد سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ ہم اپنا سر فوراً دہلیزِ یزداں پہ جھکا دیں۔ تمام گناہوں سے معافی مانگیں۔ عبادت کے پابند ہو جائیں اور آج ہی سے اُس فیصلہ کُن جنگ کی تیاری شروع کر دیں۔ جو موت کی طرح اٹل ہے۔

میں اپنے اُن وزراء اور حکامِ اعلیٰ سے جو اپنی تقریروں میں بار بار اسلام کا نام لیتے ہیں اور بھول کر بھی عبادت نہیں کرتے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ عبادت تعمیرِ اسلام کا بنیادی پتھر ہے۔ اور نماز کے بغیر اسلام کا کوئی خاکہ تیار نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ذکر و صلوٰۃ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کو سات سو مرتبہ دہرایا ہے۔ یہی چیز اب ہماری قوت و بقا اور استحکام کی ضامن ہے۔

## حکمرانِ پاکستان کا فرض

اے حکمرانِ پاکستان! قرآن عظیم میں کل ۶۲۳۶ آیات ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کے لیے ہے اور وہ یہ ہے۔

جب ہم اپنے منتخب اور پیارے بندوں کو حکومت دیتے ہیں تو وہ ان چار فرائض کو پوری طرح نبھاتے ہیں۔

اوّل:۔ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔

دوم:۔ ان کا مقصد دولت جمع کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ جو کچھ اپنے پاس بھی ہوتا ہے اللہ کی راہ میں دے دیتے ہیں۔

سوم:۔ نیکی کی تبلیغ کرتے ہیں۔

چہارم:۔ اور بدی سے حکماً روکتے ہیں۔

برادرانِ وطن !- وطن خطرے میں ہے۔ اِس لیے اللہ کے سامنے جُھک جاؤ۔ اور اپنے ممبروں، وزیروں، سیکرٹریوں اور حاکموں کو بھی اِسلام کا درس دو۔ اللہ آپ کی مدد کرے

# عورت کا صحیح مقام
# قرآن کی روشنی میں

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے بجا فرمایا تھا ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

حقیقتاً مسئلہ زن ایک نہایت ہی مشکل مسئلہ ہے۔ اسے جتنا سلجھاؤ یہ اتنا ہی الجھتا ہے۔ مغرب میں عورت کی آزادی، بے باکی، اور آوارہ گردی سے مردوں کے ہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔ اور مشرق میں وہ گھر کی چار دیواری اور زندانِ نقاب میں یوں محبوس ہے کہ اس پر رحم آتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس مشکل کا حل کیا ہے؟ اور قرآن حکیم اس معاملے میں ہماری کہاں تک راہنمائی کرتا ہے۔

**مسئلے کی صورت:**۔ مسئلہ زن کو سمجھنے کے لیے ہمیں چند سوالات کا حل قرآن سے تلاش کرنا ہوگا۔

۱۔ کیا ہمارا موجودہ برقع قرآن کی رو سے درست ہے؟

۲۔ کیا عورتوں اور مردوں کو ملنا جائز ہے؟

۲- عورتوں کی بہتری کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔؟

پردے کے متعلق قرآن شریف میں مندرجہ ذیل آیات ملتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ | اے نبی مسلمانوں سے کہیے کہ (وہ عورتوں سے ملیں تو آنکھیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ |
| قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ۔ | اسی طرح مُسلم خواتین کو حکم دیجئے کہ وہ مردوں کے سامنے آئیں، تو آنکھیں جھکالیں۔ اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ |

اِس آیت سے کہیں یہ مترشح نہیں ہوتا کہ عورتیں منہ پہ نقاب ڈال کر باہر نکلا کریں۔ بلکہ آنکھیں جھکا لینے کی ہدایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت بلا حجاب بھی پھر سکتی ہے۔ اگر آنکھیں جھکا لینے سے مراد پردہ لیا جائے تو پھر مردوں کو بھی پردہ اوڑھنا پڑے گا۔ اس لیے کہ آنکھیں جھکانے کا حکم مرد و زن ہر دو کے لیے ہے۔ اگر اس حکم کے ہوتے ہوئے مرد بلا حجاب پھر سکتا ہے۔ تو عورت کو کون سی چیز روکتی ہے۔

دوسری آیت

| | |
|---|---|
| وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ | عورتیں غیر محرموں کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ ہاں جو زینت خود بخود ظاہر ہو جائے اس کا کوئی حرج نہیں |

خود بخود ظاہر ہونے والی زینت کے متعلق علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس زینت سے مراد ہاتھ، پاؤں اور ہاتھوں کے زیور ہیں اور چہرے کو ننگا رکھنا ممنوع ہے۔ دوسرا گروہ جس میں حضرت ابنِ عباسؓ، ابن عمرؓ، حضرت انسؓ، ضحاکؒ اور سعید بن جبیرؒ وغیرہ شامل ہیں۔ اس زینت میں چہرے کو بھی شامل سمجھتا ہے۔ حضرت حسن بصری بھی اس خیال کے مؤید ہیں۔ سنن ابی داؤد اور موطا (امام مالک) میں چند احادیث بھی اس مضمون پر موجود ہیں کہ عورت چہرے پر نقاب ڈالنے کے لیے شرعاً مامور نہیں۔

اس وقت۔ ٹرکی۔ ایران، مصر، لیبیا، مراکش۔ ٹیونس۔ شام۔ سعودی عرب عراق، شرق اردن، فلسطین اور لبنان میں عورتوں کے چہروں پر نقاب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سارے جسم کو ایک بڑی چادر سے ڈھانپ لیتی ہیں اور چہرہ ننگا رکھتی ہیں۔ بہر حال اس آیت سے ہمارا مروجہ برقع ثابت نہیں ہوتا۔

تیسری آیت

| | |
|---|---|
| فَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ | خواتین کو چاہیے کہ اپنی اوڑھنیوں سے سینوں کو ڈھانپ لیں۔ |

چہروں کو نہیں بلکہ سینوں کو۔ اگر اللہ کا مقصد نسوانی چہروں کو چھپانا ہوتا تو وہ "جیوبھن" کی جگہ "وجوھھن" کے الفاظ استعمال کرتا۔

چوتھی آیت (جو ازواج نبی کے لیے مخصوص ہے)

| | |
|---|---|
| وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ | اے رسول! اپنی ازواج سے کہہ دو کہ وہ گھروں میں رہا کریں اور نسائے جاہلیت |

| کی طرح بن سنور کر باہر نہ نکلا کریں

یہ حکم صرف امہات المومنین کے لیے ہے۔ لیکن اگر اسے عام بھی سمجھ لیا جائے۔ تب بھی اس سے موجودہ برقع ثابت نہیں ہوتا۔ اس آیت کے دو حصے ہیں پہلے حصے کا مفہوم یہ ہے کہ "گھروں میں جم کر رہو" سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کے نزول کے بعد امہات المومنین اور دیگر مسلم خواتین جم کر گھروں میں بیٹھ گئی تھیں؟ اور کسی ضرورت کے لیے بھی باہر نہیں نکلتی تھیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ضروری حوائج کے لیے یقیناً باہر آتی تھیں۔ لیکن بن سنور کر نہیں۔ تو گویا اس آیت کا دوسرا حصہ پہلے کی تفسیر ہے۔

پانچویں آیت۔

| یا ایھا النبی قل لا زواجک | اے رسول اپنی بیویوں، بیٹیوں اور |
|---|---|
| وبنتک ونساء المومنین ان | دیگر مومنات کو حکم دیجئے کہ وہ باہر |
| یدنین علیھن من جلابیبھن | نکلیں تو ایک بڑی چادر خوب اچھی |
| | طرح اوڑھ لیا کریں |

اس آیت میں "یدنین" کا لفظ تشریح طلب ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی لکھے ہیں گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ ہم حیران ہیں کہ گھونگھٹ کا مفہوم کہاں سے نکال لیا۔ یدنین کا ماخذ "دنو" (دنیٰ دنواً) ہے۔ دنو کے معنی ہیں قریب کرنا، قریب آنا ......... قریب لانا۔ تو اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں۔

"کہ عورتیں ایک بڑی چادر کو اچھی طرح جسم کے قریب لائیں" مطلب

پر کر اچھی طرح اوڑھ لیں کہ زینت کا کوئی حصہ نظر نہ آئے۔

آیاتِ پردہ کا ماحصل۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتیں بن سنور کر باہر نہ پھریں۔ باہر نکلیں بھی تو ایک بڑی چادر سے مقاماتِ زینت مثلاً سینۂ زیور اور خوبصورت کپڑوں کو ڈھانپ کر نکلیں اور جب نامحرموں سے ملیں تو جا بہ جا آنکھوں کو جھکا لیں۔ ان ہدایات سے ہم مندرجہ ذیل نتائج نکال سکتے ہیں۔

اوّل:۔ ہمارا موجودہ پردہ قرآن سے ثابت نہیں۔

دوم:۔ عورتیں ایک بڑی چادر میں اندر باہر آسکتی ہیں۔

سوم:۔ وہ آنکھیں جھکا کر غیر محرموں سے گفتگو کر سکتی ہیں۔

چہارم:۔ اگر وہ حیا و عصمت کے تقاضوں کا خیال رکھیں تو زندگی کے ہر شعبے میں برابر حصہ لے سکتی ہیں۔ وہ چاہیں تو معلّم بنیں، فلسفہ سیکھیں، سیاسیات میں حصّہ لیں۔ سائنس پڑھیں۔ ڈاکٹر بنیں۔ تلوار چلائیں۔ ہوا میں اُڑیں، سمندر میں تیریں انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ بشرطیکہ حیا و عصمت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اللہ گناہ اور بے حیائی کا دشمن ہے۔ عورت کی بے حجابی کا دشمن نہیں۔ اگر ایک عورت پردے میں رہ کر عصمت بیچ رہی ہے تو کیا وہ اللہ کے عذاب سے محض اسلئے بچ جائے گی۔ کہ وہ بی بی بن کر اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ اللہ کا مقصد گناہ کو روکنا ہے مرد و زن کی آزادی پہ پابندی لگانا نہیں۔ اگر مرد و زن آنکھیں نیچی رکھ سکتے ہیں تو آزاد ہیں۔ ورنہ مرد کو جیل میں اور عورت کو گھر کی چار دیواری میں بطور سزا بند کر دیا جائے۔

# ایک تاریخی واقعہ

"جب راون سیتا جی کو اٹھا کر لے گیا تو سیتا راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیور ٹپکاتی گئیں۔ تاکہ پسماندگان کو سراغ لگانے میں آسانی رہے۔ یہ تمام زیور ایک بندر اٹھا کر رامچندر جی کے سامنے لے آیا۔ رامچندر جی نے اپنے چھوٹے بھائی لچھمن سے پوچھا۔ کیا تم ان زیوروں کو پہچانتے ہو؟ لچھمن پاؤں کے زیور الگ کر کے کہنے لگا۔ کہ میں ان زیوروں کو پہچانتا ہوں جب رامچندر جی نے باقی زیورات کو نہ پہچاننے کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگا۔ میری نگاہ آج تک بھابی کے پاؤں سے اوپر نہیں اٹھی۔

سبحان اللہ۔ کیا کردار ہے۔ ایک ہی گھر میں برسوں رہے۔ اکٹھا دیس نکالا ملا جنگل میں بھی شب و روز اکٹھے رہے۔ لیکن دیور کی نظر بھاوج کے پاؤں سے ایک لحہ کے لیے بھی اوپر نہ گئی۔ یہ ہے وہ بلند کردار جو قرآن اپنے پیروؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر آج ہم میں بھی اس قسم کے مرد پیدا ہو جائیں۔ تو ہماری عورتیں جنگلی ہرنیوں کی طرح خود بخود آزاد ہو جائیں اور سوسائٹی میں انھیں مناسب مقام مل جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں لچھمن بہت کم ہیں اور راون بہت زیادہ۔ لہٰذا ہمیں مجبوراً اپنی سیتاؤں کو حریص نگاہوں سے بچا کر رکھنا پڑتا ہے۔

عورتوں کی آزادی مانگنے والو! پہلے نیک اور شریف النفس بنو۔ نگاہیں نیچی رکھو۔ شرمگاہوں پہ حیا و عصمت کے پہرے بٹھاؤ۔ عورتیں خود بخود آزاد ہو جائیں گی۔

اگر ہمارا کردار کافرانہ ہو۔ اور ہم کسی سرخ دوپٹے کو دیکھ کر میلوں اس کا پیچھا کرتے ہوں۔ تو الصفا فائیسے کہ ہم کس بر تے پر اپنی معصوم بہنوں اور بیٹیوں کو باہر بھیجیں۔ ہمارا موجودہ پردہ اسلامی نہیں۔ بلکہ محض مجبوری اور ضرورت کا پردہ ہے میرا مقصد یہ نہیں کہ مسلم نوجوان اس قدر اخلاق گر چکا ہے۔ کہ وہ شب و روز عورت کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ بلکہ میں صرف ایک خطرے کا ذکر کر رہا ہوں۔

## عورتوں کی آزادی کے چند فوائد

مجھے اس سے انکار نہیں کہ خواتین کی آزادی میں کچھ خطرات بھی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی کچھ فوائد بھی ہیں۔ مثلاً جس محفل یا جلسے میں کوئی عورت آجائے۔ تو تمام مرد گفتگو میں متین۔ قہقہوں میں معتدل۔ حرکات میں مہذب اور بحث و مناظرہ میں میانہ رو بن جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں درج ہے۔

| | |
|---|---|
| فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ | تم ان عورتوں سے نکاح کرو جنھیں تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ |

موجودہ پردے کی صورت میں پسند و انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر مرد کو اپنی رفیقہ حیات پسند کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے تو اسکی خانگی زندگی عموماً بد مزگی۔ تصادم اور نامرادی کی ایک طویل داستان بن کر رہ جاتی ہے۔ انتخاب سے میرا مطلب مغربی انتخاب نہیں۔ بلکہ جانبین کو ایسے مواقع بہم پہنچانا ہیں کہ مرد و زن ایک دوسرے کو دیکھ سکیں۔ سیرت و صورت کا کچھ اندازہ لگا سکیں۔ اور اندھی شادی کے تلخ نتائج سے بچ سکیں۔

قدیم رسوم و رواجات میں پلے ہوئے بزرگ یقیناً میری اس تجویز پر

پر بُرا منائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تو کون ہوتا ہے ہماری لڑکیوں کو غیر محرموں سے پسند کرانے والا۔ ہم مر جائیں گے لیکن یہ بے غیرتی گوارا نہیں کریں گے ․․․․
میاں صاحب! مجھ پر ناراض ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میں تو قرآن پیش کر رہا ہوں اللہ کہہ رہا ہے۔ کہ تم ان عورتوں سے شادی کرو۔ جو تمہیں پسند آئیں۔ اگر ہم اپنے ہونے والے داماد کی نظروں سے بچی کو دور رکھا۔ اور شادی کے بعد اسے پسند نہ آئی تو دو ہی صورتیں ہوں گی۔ طلاق یا ایک ہی چار دیواری میں دو نامراد اور اداس روحیں عمر بھر اپنے والدین کو کوستی رہیں گی۔ انتخاب کا حکم اللہ نے دیا ہے۔
اگر آپ مسلمان ہیں اور قرآن کو مانتے ہیں تو پھر آپ کو یہ حکم بھی ماننا پڑے گا۔ آپ یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ قرآن کا یہ حکم میری غیرت سے متصادم ہوتا ہے اس لیے میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ یاد کیجئے وہ دن جب آپ کی شادی کا انتظام ہو رہا تھا اور آپ نہایت گھبراہٹ اور بے تابی میں اپنے رازداروں سے پوچھتے پھرتے تھے۔ خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ۔ لڑکی کالی ہے یا گوری۔ پتلی ہے یا موٹی۔ خوبصورت ہے یا بدصورت۔ قد و قامت موزوں ہے یا اونٹ کی نسل کی کوئی شہزادی ہے۔ عادات و اطوار کیسے ہیں۔ باسلیقہ ہے یا اجڈ۔ نرم خو ہے یا جھگڑالو۔ آپ یہ تمام سوال اسی لیے پوچھ رہے تھے کہ آپ کو پسند کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ میں صدہا ایسے گھرانوں سے واقف ہوں۔ جو محض اسلئے اجڑ گئے۔ کہ بیوی کے انتخاب میں شوہر کا دخل نہیں تھا۔ خود میرا گھر ایک مرتبہ اسی "خاندانی غیرت" کا شکار ہوا۔ دنیا میں بے شمار ایسے جوڑے موجود ہیں۔ جو بہ ظاہر آباد ہیں۔ لیکن ان کے سینے قبرستان سے زیادہ اداس ہیں

اسلام انسانی فطرت اور حکمت و دانش کا مذہب ہے۔ یہ وہ دستور العمل ہے جس کی ہر ہدایت لازوال مسرت و راحت کا پیغام ہے۔ اسی دستور العمل کے مصنف نے یہ حکم دیا تھا کہ بیویوں کے انتخاب میں تمہاری پسند کا دخل ہونا چاہیے۔ لیکن مفروضہ خاندانی غیرت اس حکم کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ اور آج نتائج آپ کے سامنے ہیں :-

مذکور ہے کہ حضور پُرنور جب لڑائیوں پہ جاتے تھے۔ تو ازواج مطہرات اور مُسلم خواتین کی کافی بڑی تعداد آپ کے ہمراہ ہوتی تھی۔ عورتوں کی موجودگی ہر مرد میں ہیرو بننے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام ہر میدان میں صبر و ثبات کا وہ عدیم النظیر مظاہرہ کیا کرتے تھے کہ آخر دشمن گھبرا کر بھاگ نکلتا تھا۔ صحابہ کو یہ بھی احساس ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم ہار گئے تو ہماری یہ خواتین دشمن کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ چنانچہ وہ اپنی عزت، غیرت اور ناموس کو بچانے کے لیے یوں جم کر لڑتے تھے کہ آسمان سے ملائکہ ان پر فتح و ظفر کے پھول برساتے تھے۔ یہ عورتیں مجاہدین کے لیے کھانا پکاتی تھیں۔ اور کئی دیگر خدمات بھی انجام دیتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مشک اٹھا کر کافی دور سے غازیوں کیلئے پانی لاتی تھیں۔ جب کوئی غازی زخمی ہو جاتا۔ تو اُسے اٹھا کر کیمپ میں لاتی اور اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ ایک زخمی سپاہی کا آدھا دکھ دور ہو جاتا ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ خود اس کی بہن، ماں یا بیوی اس کی تیمارداری کر رہی ہے۔

پچھلی جنگِ عظیم میں ہر مورچے کے قریب زخمیوں کے لیے عارضی ہسپتال قائم کئے گئے تھے۔ جن میں تیمارداری کے لیے عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔ کیونکہ

عورتوں کا نرم حساس دل دوسروں کی تکالیف سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اور ان کا سلوک بیمار سپاہیوں سے بہت زیادہ ہمدردانہ اور ہمشیرانہ ہوتا ہے۔

## عورتوں کا مطالبہ

عورتیں آئے دن یہ مطالبہ کرتی رہتی ہیں کہ ہمیں ہمارے حقوق دو۔ یعنی پردے سے باہر نکالو ہمیں اعلیٰ تعلیم دلاؤ۔ شوہر کے انتخاب اور اسے طلاق دینے کی اجازت دو جد وجہد حیات میں برابر کا شریک بناؤ۔ اور آبائی وراثت سے ہمارا حصہ الگ کرو۔

جہاں تک اللہ کا تعلق ہے۔ وہ ان مطالبات کو مدت سے منظور کر چکا ہے۔ پردے کے متعلق آپ قرآن کا فیصلہ سُن چکے۔ رسول کریمؐ نے حصولِ علم ہر مسلم اور مسلمہ کیلئے فرض قرار دیا ہے۔ خاوند کو طلاق دینے (خلع) کا حق اسے شرعاً حاصل ہے۔ لیکن چونکہ عورت فطرتاً کم حوصلہ زود رنج اور جلد باز واقع ہوئی ہے اور ممکن ہے۔ کہ وہ جلدی میں کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔ اس لیے اسے حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ شوہر سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ تو حاکم شرع کو اپنی کہانی سنائے۔ اگر حاکم مطمئن ہو جائے کہ عورت کی شکایات معقول ہیں تو وہ اسے شوہر سے علیحدہ کر دے۔

عام طور پر والدین خود ہی اپنی لڑکیوں کے لیے شوہر تلاش کرتے ہیں اور نکاح کے وقت بیٹی سے جبراً اختیارات لے کر اسے ایک نادیدہ و ناشنیدہ انسان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بیٹی کو خاوند پسند ہو یا ناپسند، ان کی بلا سے۔ انھوں نے تو سر سے بوجھ اتارنا تھا۔ میں کئی ایسی حسین۔ پاکیزہ مذاق، لطافت پسند اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے واقف ہوں۔ جنھیں دولت کے لالچ میں

ماں باپ نے جاہل، سیہ رُو، اُجڈ، غلیظ، بدصورت اور عمر رسیدہ شوہروں کے حوالے کر دیا۔ اور وہ گھر کے جیل خانہ میں پڑی اُداس زندگی کے آہستہ خرام دن گذار رہی ہیں۔

اس مسئلے پر شریعت کا نقطۂ خیال ہمارے سامنے ہے۔ شریعت کی رو سے نکاح اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک عورت "ہاں" نہ کہے۔ اگر کوئی لڑکی خاوند کو دیکھے سُنے بغیر ہاں کر دیتی ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی ہے۔ جس کا بعض اوقات اسے نہایت تلخ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ورنہ شریعت اسے اجازت دیتی ہے کہ "ہاں" کہنے سے پہلے تحقیق کرلے کہ اس کا ہونے والا شوہر کیا چیز ہے۔

**اعتراض** یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ خاوند کو اجازت ہے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر عورت کو طلاق دے کر ایک لمحے میں گھر سے نکال دے۔ لیکن عورت پہ یہ پابندی لگا دی ہے۔ کہ وہ عدالتوں میں خراب ہوتی پھرے۔ کیا یہ تفاوت خلاف انصاف نہیں۔

**جواب** (۱) عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جائیں۔ تو سارے سسرال میں بیوی کا کوئی ہمدرد باقی نہیں رہتا اس قسم کے ناسازگار ماحول میں بیوی مرعوب اور خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ اور اس میں یہ ہمت ہی نہیں رہتی کہ وہ شوہر کو طلاق دے۔ اس لیے عدالت کو کہا گیا ہے کہ وہ عورت کی مدد کرے۔

(۲) عورت فطرتاً جلد باز، زود رنج اور کم حوصلہ ہوتی ہے۔ اگر طلاق کے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوتے۔ تو ممکن تھا ذرا سی رنجش پہ طلاق

کا کلہاڑا شوہر کے سر پر دے مارتی اس لیے اسے ان اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔

۳۔ نیز ممکن تھا کہ شوہر بھی کسی وقت کسی چھوٹی سی بات پر بگڑ کر طلاق دے بیٹھتا۔ اس لیے قرآن نے حکم دیدیا کہ عورت تین طلاقوں سے حرام ہو گی۔ اور ہر طلاق ایک حیض کے بعد دی جا سکتی ہے۔ چونکہ طلاق کا مروّجہ طریقہ ہرگز قرآنی نہیں اس لیے اگر کوئی شخص ایک وقت میں یا دس دن میں اپنی بیوی کو دس لاکھ مرتبہ طلاق دے تب بھی یہ ایک طلاق سمجھی جائے گی۔ قرآنی طلاق کی صورت یہ ہے۔ کہ عورت کو طلاق دو جب اندازاً مہینہ گزر جائے۔ تو دوسری طلاق دو اور پھر مہینے کے بعد تیسری۔ اس عرصے میں شوہر جب چاہے اپنے فیصلہ کو بدل سکتا ہے۔ اگر اس عرصے میں خاوند بیوی کو چھو لے یا پیار محبت کی باتیں کر بیٹھے یا اس کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ جائے تو فقہا کے ہاں پچھلی طلاق یا طلاقیں خود بخود منسوخ ہو جاتی ہیں۔ طلاق کی یہ میعاد اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ خاوند کو مزید سوچنے اور رشتہ داروں کو مصالحت کرانے کے مواقع مل جائیں۔

اسی طرح عورت کو یہ حکم کہ طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے کچھ اسی قسم کی مصلحت کا حامل ہے۔ آخر عدالت میں جانے، عرضی دینے، شہادت پیش کرنے اور شوہر کے عذرات سننے پر دو چار مہینے تو ضرور صرف ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس عرصہ میں عورت اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کر لے۔ یا مرد اپنی غلط روش بدل ڈالے یا کوئی اور بہتر صورت نکل آئے۔ الغرض طلاق دینے میں میاں اور بیوی ہر دو پہ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جانبین کو اپنے فیصلے پہ نظرِ ثانی کرنے کے کافی مواقع دیے جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ پابندیاں تقاضائے انصاف ہیں۔

**وراثت** | آبائی وراثت میں عورت کا حصہ اگر مرد سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔

فرض کرو کہ ایک گھر میں ایک لڑکا ہے اور دو لڑکیاں۔ لڑکا نصف جائیداد کا وارث ہوگا اور نصف دیگر کی حقدار لڑکیاں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کو لڑکے کے برابر نہیں سمجھا گیا۔ لیکن حقیقت یوں نہیں۔ اگر حلت والدین کے بعد یہ لڑکیاں شادی نہ کریں، تو خرچ بھائی کے سر۔ اور اگر کریں تو پھر پدری جائیداد سے نصف لینے کے بعد زندگی بھر کا نان نفقہ شوہر کے سر۔ اگر مہینے میں ایک لڑکی کا خرچ پچاس روپے بھی ہو تو گویا کم از کم بیس تیس ہزار روپیہ شوہر سے لیا۔ مہر الگ، زیور کپڑا الگ اور اس کی جائیداد میں حصہ داری الگ پھر یاں ہی تو بیٹے کی جائیداد میں شریک ہو گئی۔ انصافاً کہو کہ کون فائدے میں رہا۔ بیٹا یا بیٹی۔ اور قرآن نے کس کو زیادہ حصّہ دلایا؟ یہ بھی یاد رہے کہ بیٹے کے گھر ایک بیوی بھی ہے اور چند بچے بھی۔ جن کا بوجھ اسی کے سر ہے۔

الغرض عورتوں کے تمام مطالبات قرآن نے آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر منظور کر لیئے تھے۔ اگر ان کے والدین اور شوہر قرآن کی مخالفت کریں اور اللہ کے صریح احکام کو توڑ کر اپنی بیویوں۔ بیٹیوں اور بہنوں پہ مظالم توڑیں۔ انھیں جائیداد۔ آزادی اور اعلیٰ تعلیم سے محروم کریں تو اس ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟

## عورت کے دکھوں کا واحد علاج

آج عورت مرد کے سامنے بے بس ہے۔ اور اس کی کئی وجوہات ہیں

اوّل رواج اور دیرینہ روایات۔ دوم۔ عورتوں کی ہمہ گیر بے علمی۔ سوئم عورتوں کی خاموشی۔

ان تمام دکھوں کا واحد علاج عورتوں کو تعلیم دلانا ہے۔ تعلیم کردار کو بلند، شخصیت کو بااثر اور زبان کو فصیح بنا دیتی ہے۔ علم سے تصورات حیات بدل جاتے ہیں۔ علم

روح میں بالیدگی - ایمان میں تازگی - دل میں حرارت اور جذباتِ عالیہ میں حرکت پیدا کرتا ہے -

ہمارا یہ فرض ہے کہ بچیوں کو بلند تعلیم دیں - اگر کسی شہر میں لڑکیوں کا کالج موجود نہ ہو - تو لڑکوں کے کالج میں انھیں بھیجیں - میں مانتا ہوں کہ لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے میں کچھ خطرات بھی ہیں - لیکن فوائد بہت زیادہ ہیں - اللہ نے شراب و قمار کو حرام کرتے ہوئے فرمایا تھا -

واثمھما اکبر من نفعھما | کہ ان کا نقصان فائدے سے زیادہ ہے

اور اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا تھا - دوسری طرف اگر لڑکیاں لڑکوں کے ہمراہ بیٹھ کر پڑھیں تو فوائد نقصانات سے بہت زیادہ ہیں - اس لیے یہ اقدام جائز ہوگا - بہر رنگ اگر ہماری بیٹیاں بلند علم کے زیور سے آراستہ ہو جائیں - تو پھر مردوں کو یہ ہمت نہیں ہوگی کہ وہ عورتوں کے جائز حقوق کو غصب کر سکیں - علم وہ طاقت ہے جو ہر رکاوٹ کو ہٹا کر اپنا راستہ خود ہموار کر لیتی ہے - اسلام نے حصول علم مرد و زن ہر دو کے لیے فرض قرار دیا - تاکہ ہر دو طاقتور بن جائیں - اور کوئی جانب دوسرے کو کمزور سمجھ کر اس کے حقوق پہ دست درازی نہ کر سکے -

# فدیۂ صیام

فدیہ کے معنی ہیں کفارہ، سزا، عوضانہ، جرمانہ، قرآن میں بعض فروگذاشتوں کے لئے فدیہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً

(۱) وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ (قرآن حکیم)

حج کے دوران میں جب تک قربانی اپنے ٹھکانے پہ نہ پہنچ جائے سر مت منڈواؤ۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ روزہ، صدقہ یا قربانی کی صورت میں فدیہ ادا کر کے سر منڈا سکتا ہے۔

(۲) زن و شوہر کو حکم ہے کہ وہ حُسنِ سلوک سے گذارہ کریں۔ لیکن اگر ناچاقی ہو جائے مصالحت کی کوئی صُورت نہ نکلتی ہو اور زوجہ طلاق لینے پر مُصر ہو تو فدیہ دے کر طوقِ زوجیت سے خلاصی کرا سکتی ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔

اگر یہ خطرہ ہو کہ زن و شوہر حدودِ الٰہی کی پابندی نہ کر سکیں گے۔ تو پھر بیوی فدیہ دیکر شوہر سے طلاق حاصل کر سکتی ہے اسمیں کوئی حرج نہیں

وضاحت کے لیے یہ دو مثالیں کافی ہیں۔ اِن آیات میں کسی نہ کسی لغزش کا ذکر کرنے کے بعد فدیہ کی صورت میں تلافی کی ہدایت کی گئی ہے۔ تو گویا فدیہ، کفارہ ہے کسی لغزش کا۔ یا کسی فرض کو سرانجام نہ دینے کا۔ اپنے فرض کو پورا نہ کرنے والا یقیناً مجرم ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی اِس کوتاہی کا وہی کفارہ ادا کر دے۔ جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ تو وہ اللہ کی نگاہ میں مجرم نہیں رہتا۔ احرام کی حالت میں سر منڈوانا جرم ہے۔ لیکن اگر کوئی حاجی مجبور ہو جائے اور کفارہ ادا کر دے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ اللہ کی نگاہ میں مجرم نہیں رہے گا۔

اِن تمہیدی سطور کے بعد آیئے ذرا آیاتِ صیام پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا تارک الصیام کوئی فدیہ دے کر اپنی کوتاہی کی تلافی کر سکتا ہے؟

قرآنِ حکیم میں صیام پر صرف چار آیات ہیں۔ جو پارۂ دوم کے چھٹے رکوع میں یکجا دی ہوئی ہیں۔

پہلی تین آیات ہیں:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ط فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ط وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط فَمَنْ تَطَوَّعَ

تم پر روزے اُسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے یہ اس لیے کہ تم متقی ہو۔ روزے چند دن ہیں۔ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو رمضان کے بعد گنتی پوری کرو۔ اور جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہیں (اور پھر نہیں رکھتے) وہ فدیہ ادا کریں یعنی ہر روزہ

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا
خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ
فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ
مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن
شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن
كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَ
لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ
عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

کے عوض) ایک غریب کو کھانا کھلائیں اگر وہ زیادہ خیرات کرنا چاہیں۔ تو ان کیلئے زیادہ اچھا ہے اور بہتر تو یہی ہے کہ تم (فدیہ کی جگہ) روزے رکھو اگر صاحبِ علم ہو۔ ماہِ رمضان میں قرآن نازل ہوا جو دنیائے انسانی کے لیے ہدایت۔ دلیلِ ہدایت اور فرقان ہے اگر تم رمضان کو پالو (سکانِ قطبین نہیں پا سکتے) تو روزے رکھو اور بحالتِ سفر و مرض باقی ایام میں گنتی پوری کر لو۔ اللہ تمہارا سکھ چاہتا ہے۔ دکھ نہیں چاہتا۔ گنتی کو پورا کرو اور اس ہدایت کے بعد اللہ کی عظمت بیان کرو۔ نیز شکریہ ادا کرو

آیاتِ بالا میں یُطِیْقُوْنَہٗ تشریح طلب ہے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ۔۔۔ اَطَاقَ یُطِیْقُ باب افعال ہے جس کا ایک خاصہ سلبِ ماخذ (نفی) بھی ہے۔ اس لیے یُطِیْقُوْنَ کی تفسیر ہوگی لَا یُطِیْقُوْنَ۔ یعنی جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے مثلاً۔ ضعیف، بوڑھے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں۔ وغیرہ۔

یہ تفسیر بوجوہ محلِ نظر ہے۔

اول۔ باب افعال کا خاصہ صرف سلبِ ماخذ ہی نہیں۔ بلکہ چند اور خواص بھی ہیں۔

مثلاً :-

تعدیہ[1] (لازم کو متعدی بنا کر دو معفول لانا)

تغییر[2] (کسی چیز کو صاحب ماخذ بنانا)

بلوغ[3] (ماخذ میں آنا)

مبالغہ[4] (کسی شے کی کیفیت پہ مبالغہ بیان کرنا)

وجدان[5] (کسی چیز کو ماخذ کے ساتھ متصّف پانا۔)

تعریض[6] (مفعول کو محلِ ماخذ میں لے جانا)

حینونت[7] (کسی چیز کا ماخذ کے وقت کو پہنچنا)

مطاوعت[8] (فعل کے بعد اس غرض کے لیے استعمال کرنا کہ مفعول فاعل کا اثر قبول کر چکا ہے۔ بَشَّرْتُہٗ فَابْشَرَ)

نسبت[9] بہ ماخذ (کسی چیز کو ماخذ کی طرف منسوب کرنا)

اِن تمام خواص کو چھوڑ کر یُطِیقُونَہٗ کو سلبی معنوں میں استعمال کرنے کے لیے کوئی قرینہ درکار ہے۔ جو یہاں موجود نہیں۔ مزید بر آں جب یُطِیقُونَ ایجابی معنوں میں استعمال ہو کر ایک مفید ہدایت ہم تک پہنچا رہا ہے اور یہ ہدایت کسی اور نص سے متصادم نہیں ہو رہی اور نہ تقاضائے تقویٰ کے خلاف ہے (تفصیل آگے آ رہی ہے) تو اسے سلبی معنوں میں استعمال کرنا محض تکلف ہے۔

دوم :- قرآن عربوں پر اُترا تھا۔ وہ اپنی زبان کے اسماء و افعال کے خواص سے پوری طرح آشنا تھے۔ اور الفاظ کے تمام پہلوؤں پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے ذرا تاریخ کی ورق گردانی کریں۔ اور دیکھیں کہ صحابہ کرام نے اس آیت . . . .

(وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهُ الخ) کا مفہوم کیا سمجھا تھا۔؟

بخاری میں درج ہے۔

وقال ابن نمیر حدثنا الاعمش حدثنا عمرو بن مرۃ حدثنا ابن ابی لیلیٰ حدثنا اصحاب محمد صلعم نزل رمضان فشق علیھم فکان من اطعم کل یوم مسکینا ترک الصوم ممن یطیقہ ورخص لھم فی ذلک فنسختھا وان تصوموا خیر لکم۔ فامروا بالصوم۔

(صحیح بخاری طبع مطبع عثمانیہ مصر ۱۳۵۱ھ کتاب الصوم ص ۲۲۸ ج اول)

ابن نمیر اعمش سے وہ عمرو بن مرہ سے۔ وہ ابن ابی لیلیٰ سے اور ابن ابی لیلیٰ صحابہ کرام سے راوی ہے کہ جب رمضان کے متعلق آیات اتریں اور صحابہ کو روزہ رکھنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ تو ان میں سے بعض کسی غریب کو کھانا کھلا دیتے اور طاقتِ صوم کے باوجود روزہ نہ رکھتے۔ رسول کریم نے انھیں اس سہولت کی اجازت دے رکھی تھی لیکن اس آیت وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (اگر تم روزہ رکھو تو بہتر ہے) نے اس سہولت (فدیۂ صیام) کو منسوخ کر دیا۔ اور تمام صحابہ روزہ دار بن گئے۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل نتائج واضح طور پر نکلتے ہیں۔

۱۔ حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام (جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔) سب نے يُطِيْقُوْنَ کا مفہوم يُطِيْقُوْنَ ہی سمجھا تھا۔ نہ کہ لَا يُطِيْقُوْنَ۔

۲۔ کہ حضور علیہ السلام نے اس آیت کے مطابق صحابہ کو اجازت دی تھی کہ جو لوگ روزہ نہ رکھنا چاہیں وہ فدیہ دیں۔

۳۔ کہ صحابہ اس سہولت سے مستفید ہوتے رہے۔ لیکن راوی کہتا ہے کہ

یہ رعایت وَاَنْ تَصُوْمُوْا کی آیت نے منسوخ کر دی تھی۔ راوی کی یہ رائے بہ وجوہ قابلِ اعتراض ہے۔

۱۔ یہ راوی کی اپنی رائے ہے۔ راوی ایک عام انسان ہے۔ اِس پر وحی نازل نہیں ہوتی۔ نہ اللہ نے اُسے تنسیخ آیات کے اختیارات دیئے ہیں۔ اور نہ رسالت پناہ کا کوئی ایسا فرمان موجود ہے کہ فلاں رُدی آیات کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس لیے راوی کا یہ فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تنسیخ آخری حربہ ہے۔ جو ایسے متباین و متعارض احکام پہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں کوئی تاویل تطبیق پیدا نہ کر سکے اور آیات زیرِ بحث میں تباین موجود ہی نہیں۔ آیات کا مفہوم اتنا صاف ہے کہ تصادم کا خیال تک نہیں آ سکتا۔ اللہ کہا فرما رہے ہیں کہ جو لوگ روزہ کی طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھتے ہوں۔ وہ فدیہ ادا کریں۔ لیکن اگر روزہ رکھ لیں تو بہتر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ راوی کو کونسی مشکل پیش آئی کہ ایک ہی آیت کا ایک ٹکڑا جو غالباً ایک سیکنڈ پہلے اُترا ہو گا منسوخ کر ڈالا۔ غالباً راوی نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ والا حصہ دو چار سال پہلے نازل ہوا تھا پھر وَاَنْ تَصُوْمُوْا اُترا اور وہ رعایت منسوخ ہو گئی۔ حالانکہ یہ دونوں ہدایات ایک ہی آیت میں موجود ہیں اور مضمون بھی ہر لحاظ سے مسلسل ہے۔ پھر ہم یہ کیسے فرض کر لیں کہ فدیہ والی رعایت کا اعلان دو چار سال پہلے ہوا تھا۔ اس تمام عرصہ میں یہ آیت نامکمل پڑی رہی اور ایک دن اچانک عرش کی بلندیوں سے یہ صدا گونجی کہ۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

فوراً اس آیت کا پہلا حصہ منسوخ ہو کر رہ جا پڑا۔ اور آیت مکمل ہو گئی۔

ہم اس راوی اور دیگر قائلین نسخ سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ اگر یہ رعایت منسوخ ہو گئی تھی تو رسول اللہ صلعم نے اسے قرآن میں کیوں رہنے دیا جس طرح (بقول بخاری) رجم کی آیت منسوخ ہونے کے بعد قرآن سے نکال دی گئی تھی۔ اسی طرح اس آیت کو بھی قلمزد کر دیا جاتا۔ یا قرآن کے ساتھ منسوخ شدہ آیات کی فہرست لگا دی جاتی تاکہ جو لوگ صحیح بخاری پڑھے ہوئے نہیں، وہ منسوخ شدہ آیت سے دھوکہ نہ کھا جائیں اور فدیہ کو صوم کا کفارہ نہ سمجھ بیٹھیں۔

اور یہ بھی تو سوچیئے کہ اگر اس رعایت کو منسوخ تصور کر لیں تو وَاَنْ تَصُوْمُوْا کا مفہوم کیسے سمجھ میں آئیگا۔ موجودہ صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہے۔

جو لوگ بلا عذر روزہ نہیں رکھتے وہ فدیہ دیں۔ لیکن روزہ فدیہ سے بہتر ہے

اگر پہلا حصہ اڑا دیں تو آیت صرف اتنی رہ جائے گی۔

"لیکن روزہ بہتر ہے"

سوال پیدا ہوگا کہ کس چیز سے بہتر ہے؟ پہلا حصہ تو منسوخ ہو گیا۔ فدیہ کا قصہ ختم ہو گیا۔ اب اس سوال کا آپ کیا جواب دیں گے۔؟ مجبوراً یہی کہیں گے کہ فدیہ سے بہتر ہے۔ تو گویا بغیر اس کے کوئی چارہ ہی نہیں۔ کہ فدیہ والی آیت کو زندہ اور قابل عمل حکم تسلیم کر کے اَنْ تَصُوْمُوْا کو اس کا ایک حصہ قرار دیں۔ یہی ہے فیصلہ صحیح بخاری کے شارح علامہ قسطلانی کا حدیث زیر نظر کی شرح لکھتے ہوئے فرماتے ہیں

قَوْلُهٗ فَنَسَخَهَا وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ فِيْ كَوْنِهٖ نَاسِخًا نَظَرٌ۔

(بخاری حاشیہ ص۲۲۳)

(رازی کی یہ رائے کہ ان نصوص مذکورہ سے رعایتِ فدیہ منسوخ ہوگئی ۔ محلِ نظر ہے)

۳ ۔ بغرضِ بحث ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ اللہ نے پہلے فدیہ والی آیت اتاری اور پھر منسوخ کر دی ۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ پہلی اتاری کیوں تھی ۔ آپ یہی کہیں گے ۔ کہ عربوں کو بتدریج روزے کی طرف مائل کرنے کے لیے ۔ کہ انھوں نے پہلے کبھی رکھے نہیں تھے ۔ بہت اچھا! لیکن کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں ، کہ یہ رعایت صرف چند صحابہ کو کیوں دی گئی ۔ اور بعد کے کروڑوں نومسلم اس سے کیوں محروم کر دیئے گئے ۔ اگر صحابہ نومسلم ہونے کی وجہ سے روزے کو ایک مشکل فرض سمجھتے تھے ۔ تو ایران ، ہندوستان ، افریقہ ، چین اور روس کے نومسلموں کے متعلق یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ یہ سب کے سب روزہ داری کے ہنر میں بڑے مشاق واقع ہوئے تھے اور انھیں کسی رعایت یا سہولت کی ضرورت نہ تھی ۔ اور کیا خیال ہے ۔ اُس نوجوان مسلم کے متعلق جو سنِ بلوغ کو پہنچ کر جون کے سخت رمضان میں پہلی مرتبہ روزے رکھتا ہے ۔ اُسے روزے کی سابقہ مشق نہیں ہوتی ۔ وہ رعایت فدیہ کا کیوں مستحق نہیں ۔ اور چند صحابہ میں اس نوازش کا استحقاق کہاں سے پیدا ہو گیا تھا؟ اگر آپ یہ کہیں کہ اللہ نے پہلے یہ رعایت دی اور جب دیکھا کہ صحابہ کرام اس سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کوئی روزہ نہیں رکھتا ۔ تو یہ رعایت واپس لے لی ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نہ تو خدا کو صحابہ کی استعداد و صلاحیت کا علم تھا اور نہ وہ اس رعایت کے نتائج سے (خاکم بدہن) آگاہ تھا ۔ اس لیے ایک غلط حکم جاری کر کے واپس لے لیا ۔ تاکہ نظامِ ملت درہم برہم نہ ہو جائے ۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس غلط منطق کے نتائج کتنے پریشان کن ہیں ۔

۴ ۔ اللہ کا دعویٰ ہے ۔

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (قرآن)

(ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے)

لیکن حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ آیۂ رجم قرآن میں موجود تھی اور بعد میں کسی نے نکال دی (موطا و بخاری) سورۂ واللیل کی آیت میں تحریف ہو چکی ہے (صحیح مسلم) شہدائے بئرِ معونہ کے متعلق جو آیات اتری تھیں۔ وہ آج قرآن میں موجود نہیں (بخاری و مسلم) حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلوٰۃِ الْعَصْرِ کی آیت منسوخ ہو گئی اور العصر کی جگہ الوسطیٰ نے لے لی ہے (مسلم) فدیۂ صیام والی آیت منسوخ ہو چکی ہے (بخاری) اور دیگر بیسیوں آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ اگر یہ احادیث درست ہیں تو پھر اللہ کا وعدۂ حفاظتِ قرآن کہاں گیا۔ اور ہم کس منہ سے دنیا کو کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا قرآن ہر لحاظ سے مکمل، صحیح، جامع اور محفوظ ہے۔ ایسا محفوظ۔ کہ

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ

(جس میں باطل کسی رہ سے داخل نہیں ہو سکتا)

اگر قرآن کی کئی آیات غائب ہو چکی ہیں۔ بعض محرف ہیں اور بیسیوں دیگر موجود ہیں۔ لیکن قابلِ عمل نہیں یعنی منسوخ ہیں۔ تو پھر قرآن کا دعویٰ صحت و حفاظت کیسے درست ہو سکتا ہے۔

(۵) ہمارے عام علماء میں دِقتِ نظری کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔ جہاں کہیں دو آیات کے مفہوم میں ظاہری تصادم نظر آیا۔ جھٹ ایک آیت منسوخ کر دی۔ حالانکہ تمام الہامی صحائف کا اسلوبِ بیان قدرے پیچیدہ ہوتا ہے۔ اور ایک سطحی النظر انسان کو جا بجا متصادم افکار و احکام ملتے ہیں اس ظاہری تصادم کو حصولِ علم۔ غور و فکر

اور حقائق کونی کے مطالعہ سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ امام فخر الرازی کے زمانے میں نہ تو علم میں یہ وسعت تھی۔ اور نہ اسرارِ آفاق یوں عریاں ہوئے تھے۔ اس لیے قرآن کا طالب العلم متصادم نظریوں سے گھبرا کر ناسخ و منسوخ کی پناہ لیا کرتا تھا۔ آج کے آدم جدید کا دست رسا مصنفِ قرآن کے دامنِ جلال تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج کہ اُس نے ستاروں کی بکھری بکھری محفل۔ کوہساروں کی بلند و پست چوٹیوں اور کائنات کے غیر مربوط مناظر میں وحدت و نظم اور ربط و ہم آہنگی کی ایک دنیا دیکھ لی ہے صحیفۂ الٰہی کی سطحی بے آہنگی اُسے کیوں کر پریشان کر سکتی ہے۔

اگر ہم اس ظاہری تصادم کی بنا پر آیات کو منسوخ کرنے بیٹھیں تو سارے قرآن سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ مثلاً یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جس اللہ نے قرآن میں... رسُول صلعم اور صحابہ کرام کی تعریف کی ہے۔ وہ خود تمام تعریفوں کا مستحق نہیں ہو سکتا اس لیے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (تمام تعریفوں کے قابل اللہ ہے) کو منسوخ سمجھیے۔ اسی طرح۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ منسوخ ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ خدا نے آدم کو فرشتوں کا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو اُس کے بھائیوں کا مسجود بنا ڈالا تھا۔ اللہ ایک جگہ یُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ وَیَہْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ (جسے اللہ چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) کا اعلان کرتا ہے اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ مَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ (جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کرے اور جس کا چاہے گمراہ بنے) اس لیے ایک آیت کو منسوخ تصوّر کرنا پڑیگا غرض دس بیس نہیں سینکڑوں مقامات قرآن میں ایسے ہیں۔ جن میں سطحی تصادم نظر آتا ہے۔ تو کیا ہم ان تمام آیات کو منسوخ کر ڈالیں۔ اور ساتھ ہی قرآن کی

صحت، حفاظت، تکمیل اور جامعیت کا ڈھنڈورہ بھی پیٹے جائیں۔

## ایک مثال

فرض کیجیے کہ فضائی فوج کا سالار ایک ہوا باز کو چند تحریری ہدایات دے کر کہتا ہے۔ کہ جاؤ گلگت کی محصور فوج کو راشن پہنچاؤ۔ اگر راہ میں بلند پہاڑوں، برفوں، بجلیوں، بادلوں وغیرہ کی وجہ سے کوئی دقت پیش آئے یا دشمن کے طیارے حملہ کر دیں۔ یا کہر میں پھنس جاؤ۔ تو ان ہدایات کو پڑھو۔ یہ ہدایات ہر لحاظ سے مکمل ہیں اور ان کے ساتھ راہ کا نقشہ بھی شامل ہے۔

ہوا باز ہدایت کو غور سے پڑھتا ہے۔ اور پھر مندرجہ ذیل گفتگو ہوتی ہے:۔

**ہوا باز:۔** لیکن حضور! آپ نے ہدایات میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ دن کے ڈیڑھ بجے سری نگر کے اڈے پر اترو۔ کیا وہ دشمن کے قبضے میں نہیں؟

**سالار:۔** ہاں ہے! لیکن یہ ہدایات منسوخ سمجھو۔

**ہوا باز:۔** تو کیا میں اسے کاٹ دوں؟

**سالار:۔** ہرگز نہیں۔ اگر ایک لفظ بھی کاٹا تو تمہارا کورٹ مارشل کر دیا جائیگا۔

**ہوا باز:۔** یہ عجیب ہے۔ کہ منسوخ ہدایات کو نہ تو میں کاٹ سکتا ہوں اور نہ اس پر عمل کر سکتا ہوں۔ آخر اس ہدایت کو لکھنے کا مقصد کیا تھا؟

**سالار:۔** بکو مت۔ ورنہ ........

**ہوا باز:۔** لیکن کیا حضور میں ایک الگ کاغذ پر یہ لکھ کر فلاں ہدایت بیکار ہے۔ اسے کتابچہ ہدایات کے ساتھ منسلک کر سکتا ہوں۔؟

**سالار:۔** ہرگز نہیں۔

(ہوا باز دیگر ہدایات کا مطالعہ کرتا ہے)

ہواباز :- اور حضورؐ یہ چند ایک ہدایات بڑی عجیب ہیں۔

سالار :- (کڑک کر) مثلاً

ہواباز :- مثلاً یہ کہ ہوا میں جب چاہو پٹرول بند کر دو۔ پہاڑوں میں زیادہ سے زیادہ دس فٹ کی بلندی پر اڑ سکتے ہو۔ چلتے طیارے میں جب چاہو سو جاؤ۔ اور ..... ...

سالار :- خرافات بند کرو یہ سب منسوخ شدہ ہدایات ہیں۔

ہواباز :- لیکن حضور۔ جب اس کتابچہ میں اس قدر منسوخ یعنی ناقابل عمل ہدایات درج ہیں تو کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ ہدایت نامہ صحیح اور مکمل کیسے ہوا ؟

سالار :- ہم تمھیں حکم دیتے ہیں کہ بحث بند کرو طیارہ میں بیٹھو اور چلتے بنو۔

ہواباز :- لیکن جناب والا ! میں ایسے ہدایت نامہ کے ساتھ کیسے روانہ ہو سکتا ہوں۔ جس میں بیسیوں ناقابلِ عمل خطرناک اور منسوخ ہدایات درج ہیں۔ اور پھر کوئی ایسی فہرست بھی ساتھ شامل نہیں۔ جس سے میں منسوخ وغیرہ ہدایات میں امتیاز کر سکوں۔ ان ہدایات کے ساتھ اڑنا خودکشی سے کم نہیں۔ اس لیے مجھے تعمیل ارشاد سے معذور سمجھا جائے ؟

انصافاً کہیے کہ کیا آپ اس سالار کو صحیح الدماغ انسان تصوّر کریں گے ؟ اگر نہیں، تو پھر کیا رائے ہے ان حضرات کے متعلق جو ایک طرف تو قرآن کی اکملیت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں۔ اور دوسری طرف بیسیوں احکام کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔

**آیۂ نسخ کی تفسیر** ہمارے مفسّرین نے جب قرآن میں یہ آیت دیکھی :-

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

ہم جب کوئی آیت (دلیل - ورس - نشان - منظر) مٹا یا بھلا دیتے ہیں، تو ویسی ہی یا اس سے بہتر آیت لے کر آتے ہیں - ، تو لگے قرآن کی آیات کو منسوخ کرنے - حالانکہ اس آیت کا تعلق سلسلۂ تخلیق سے تھا۔ سمندر کے ابتدائی جرثومۂ حیات سے لے کر انسان تک سینکڑوں انواع منصّۂ شہود پر آئیں اور غیر نافع ہو جانے کی وجہ سے مٹ گئیں۔

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ

(کشمکش حیات میں صرف مفید اشیا باقی رہ سکتی ہیں)

پھر سلسلۂ ارتقا کی تکمیل کے بعد بھی ہزارہا اقوام محض اس لیے ناپید ہو گئیں۔ کہ ان کا وجود غیر مفید ثابت ہو گیا تھا۔ اللہ کی یہ سنّت آغازِ آفرینش سے کارفرما ہے اور رہے گی۔ اور اِس سنّت کی تشریح سے وہ سینکڑوں کتب لبریز ہیں جو ماہرینِ تخلیق نے بود و نبود حیات پہ لکھیں اور بدستور لکھ رہے ہیں۔

اگر اس آیت کا تعلق تنزیل سے بھی ہو تو بھی قرآن کی آیات کو منسوخ کرنا اپنے گھر کو خود آگ لگانا ہے۔ آخر قرآن سے پہلے بھی سینکڑوں صحیفے مختلف انبیاء پہ نازل ہوئے تھے - جن میں سے بعض انسانی حافظوں سے اُتر گئے۔ مثلاً صحیفۂ ابراہیم آج کہیں موجود نہیں - حالانکہ قرآن میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور بعض کی وقتی ہدایات منسوخ ہو گئیں - مثلاً یہود وادیٔ سینا میں رہ کر طعامِ واحد کھانے پر مامور تھے جس کے خلاف انھوں نے احتجاج بھی کیا تھا (لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ)

اور آیۂ زیرِ بحث میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ بعض صحائف ناپید ہو جانا یا بعض وقتی ہدایات کا منسوخ ہو جانا نوعِ انسانی کی رفتارِ ترقی کو نہیں روک سکتا۔ اس لیے کہ ہم قرآن میں اُن بنیادی اور اصولی صدا قتوں کو جن کا ذکر صحیفۂ ابراہیم میں تھا۔ دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ اور عہدِ موسیٰ و عیسیٰ علیہ السلام کی وقتی ہدایات کو نظر انداز کر کے تمہیں بہتر ہدایات دے رہے ہیں۔ ایسی ہدایات جو تمام زمانوں میں تمام طبقاتِ انسانی کے لیے کار آمد ہوں گی۔

جب آیۂ نسخ کی تفسیر کئی طرح سے ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس آیت کا اطلاق قرآن پہ کریں۔ اور اس کتابِ عظیم میں قطع و برید شروع کر دیں۔ جس کے متعلق ہمارا دعوٰی یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل محفوظ اور جامع و مانع ہے اور پھر قطع و برید بھی ایک ہی آیت کے دو ٹکڑوں میں کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تخیل۔ کہ اللہ نے کہا۔

"اے مسلمانو! اگر تم میں کوئی شخص بلا عذر روزہ نہ رکھے۔ تو وہ فدیہ دے"

اور ابھی فقرہ ختم نہیں ہونے پایا تھا۔ کہ فرما دیا:۔

"اور یاد رکھو کہ اس آیت کا پہلا حصہ منسوخ ہے"

اس کی مثال یوں ہے۔ کہ ایک ہیڈ ماسٹر طلبہ کو کہے۔ کہ جو لڑکا سکول میں نہیں آئے گا۔ اُس کو ایک آنہ یومیہ جرمانہ ہو گا۔ لیکن اس حکم کا پہلا حصہ منسوخ ہے" فرمائیے طلبا کیا سمجھیں گے۔ اور ہیڈ ماسٹر کی دماغی حالت کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔؟

**سلب ماخذ** اگر ہم یطیقونہ کو سلبی معنوں میں ہی لیں۔ تو آیت کا ترجمہ یہ ہو گا۔

"جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ فدیہ ادا کریں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بہتر ہے۔

حیرت ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو روزہ کی ترغیب دے رہا ہے جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک ظالم افسر کسی گاؤں میں داخل ہو کر بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو حکم دے کہ ہر فرد ایک ایک من کا پتھر اٹھا کر دو فرلانگ دُور پھینک آئے اور جو بچے یا بوڑھے اتنا وزن نہیں اٹھا سکتے وہ جوانوں کو اجرت دیکر یہ کام کرالیں۔ لیکن اگر یہ لوگ بچے اور ضعیف بوڑھے اپنا وزن خود اٹھائیں تو بہتر ہے۔

کیا اس حکم میں کوئی معقولیت ہو سکتی ہے۔ جب وہ افسر دیکھ رہا ہے کہ چھوٹے بچوں اور سال خوردہ بوڑھوں میں اس وزن کو اٹھانے کی طاقت ہی موجود نہیں، تو انھیں بوجھ اٹھانے کی ترغیب دینا چہ معنی۔؟

اسی طرح جب اللہ جانتا ہے کہ پیران کہن رسیدہ سے طاقتِ صوم کلیتہً سلب ہو چکی ہے۔ تو پھر انھیں ترغیبِ صوم دینے کا مطلب؟ اس لیے ہم اس بدیہی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ اس آیت کے مخاطب وہی لوگ ہیں۔ جن میں روزہ کی طاقت تو ہے لیکن رکھتے نہیں۔

**تفاسیر و تراجم** میں نے آیۂ زیرِ بحث کے سلسلے میں مختلف تراجم و تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ بعض مترجمین بخاری کی مذکورہ بالا حدیث سے مرعوب ہو کر نسخ کے قائل رہے۔ کچھ "یُطِیقُونَہ" کو سلبی معنوں میں لے رہے تھے۔ کچھ "یُطیقُونَ" کی تفسیر "یُطوقُونَ" کر رہے ہیں (یعنی جو لوگ روزہ

میں تکلیف محسوس کرتے ہوں وہ فدیہ دیں۔ الچھ آیت کا ترجمہ تو وہی پیش کر رہے تھے جو میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن من مانی تشریحات سے کام لے رہے تھے۔ یہ سنیئے یہ کہانی ان حضرات کی زبانی سنیئے۔

۱۔ مولانا نذیر احمد دہلوی۔

"اور جن (بیماروں اور مسافروں) کو کھانا دینے کا مقدور ہے۔ ان پر ایک روزہ کا بدلہ ایک محتاج کو کھانا کھلا دینا ہے۔"

(ترجمۃ القرآن مولانا نذیر احمدؒ)

اس ترجمہ کو سمجھنے کے لیے اصل آیت کو پھر دیکھئے۔ وہاں درج ہے کہ بیمار اور مسافر رمضان کے بعد گنتی پوری کر لیں۔ مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں۔ کہ فدیہ کا حکم انہی مسافروں یا بیماروں کے لیے ہے کہ یہ لوگ بھی فدیہ دیں اور بعد میں روزے بھی رکھیں۔ ہم لفظِ فدیہ کی تشریح کے ضمن میں یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں۔ کہ فدیہ کسی فروگذاشت کا کفارہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ قاتل سے فدیہ (خون بہا) بھی لے لیں۔ اور پھر اُسے پھانسی پہ بھی لٹکا دیں۔ یا ایک قیدی کا فدیہ لے کر اُسے جیل ہی میں ٹھونسے رکھیں۔ یا اپنی بیوی سے فدیہ لے کر اُسے زنجیرِ زوجیت میں بدستور باندھے رکھیں۔ عربی کے مشہور لغت المنجد میں لفظِ فدیہ کا مفہوم امثلہ سے یوں واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ فدی الرجل من الاسر

فلاں نے قیدی کو قید سے فدیہ دے کر چھڑا لیا۔

۲۔ فَدَتِ المرأۃ نفسَھا من زوجھا

بیوی نے فدیہ دیکر اپنے آپ کو قید زوجیت سے آزاد کرالیا۔

۳- الفِداءُ والفِدیٰ والفدیۃ ما یُعطیٰ من مالٍ ونحوہٖ عوضاً عن المفدیٰ

فداء۔ فدیٰ و فِدیٰ و فدیہ سے مراد وہ رقم وغیرہ ہے جو کسی کے عوض ادا کی جائے۔

اِس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صوم اور فدیۂ صوم یک جا جمع نہیں ہو سکتے اگر کسی روزہ دار نے فدیہ ادا کر دیا ہے تو وہ صوم کا مکلّف نہیں رہا۔ مولانا نذیر احمد سے ترجمہ میں غلطی اس لیے سرزد ہوئی، کہ لفظِ فدیہ کا مفہوم پوری طرح اُن پر واضح نہ تھا آخر مسافر اور مریض سے کونسا قصور سرزد ہوا ہے۔ کہ وہ روزے بھی رکھیں اور فدیہ بھی ادا کریں۔ نہ سفر اپنے اختیار میں نہ مرض اپنے بس کی بات۔ اگر حکومت کا کوئی ملازم رمضان میں تبدیل ہو جائے یا کوئی شخص بیمار پڑ جائے۔ تو ان کا کیا قصور؟ تبدیلی کی صورت میں قصور حکومت کا ہے۔ اور مرض اللہ کی طرف سے ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ لوگ پہلے جرمانہ ادا کریں اور پھر روزے رکھیں۔ کیوں؟

کیا "یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الیُسرَ" (اللہ تمھیں ہر ممکن سہولت دینا چاہتا ہے۔) کا مفہوم یہی ہے؟

اِس ترجمہ پر ایک اور اعتراض بھی وارد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ علمائے لِسان کے ہاں مرجع ضمیر سے پہلے ضمیر کا ذکر ایک عیب ہے۔ جس سے کلامِ الٰہی لازماً مبرّا ہونا چاہیے۔ لیکن مولانا نذیر احمد "یُطِیقُونَہٗ" کی ضمیر کا مرجع فدیہ کو قرار دے کر قرآن میں اضمارِ قبل از ذکر کا عیب پیدا کر رہے ہیں۔

(۲) علامہ جلال الدین محمد بن احمد المحلّی الشافعی اپنی مشہور تفسیر "جلالین" میں

یُطِیقُوْنَ کو سلبی معنوں میں لیتے ہیں۔ اور اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد :-

"اور جو لوگ ایسے ہوں کہ ان کے لیے روزہ رکھنا ناقابل برداشت ہو تو ان کے لیے ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔"

(ترجمۃ القرآن حصہ اوّل ص ۲۶۹)

مولانا آزاد نے بھی یطیقون کو سلبی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

(۴) مولانا محمد علی لاہوری یطیقون کو لیطوقون کا مترادف سمجھ کر لکھتے ہیں:

And those who find it hard to do so may seek redemption by feeding a poor man

[اور جنہیں روزہ گراں گزرتا ہو۔ وہ ایک غریب کو کھانا کھلا کر اس فرض سے بچ سکتے ہیں]

(۵) علامہ عبداللہ یوسف علی (انگریزی ترجمہ قرآن)

[اور جنھیں روزہ رکھنے میں تکلیف ہوتی ہو۔ وہ ایک غریب کو کھانا کھلا کر روزے سے بچ سکتے ہیں۔]

(۶) حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی :-

"اور جن کو طاقت ہے تو بدلا ہے۔ ایک فقیر کا کھانا" (ترجمہ شاہ عبدالقادر)

حاشیہ پر اس کی تفسیر یوں درج ہے :-

"اور جن کو طاقت ہے۔ یعنی بلا عذر ہیں "اور چاہیں کہ پھر قضا کریں تو بالفعل ہر روزے کے بدلے ایک فقیر کو کھانا کھلا دیں۔

اِن حاشیہ نویس بزرگ سے کوئی پوچھے۔ کہ یہ پھر قضا کریں۔ اور بالفعل کہاں سے نکال لائے۔ اللہ نے صرف مریض اور مسافر کو قضا کی اجازت دی تھی۔ اور آپ ہر فرد کو قضا کی رعایت سے سرفراز فرما رہے ہیں؟

(۷) مولانا اشرف علی تھانوی۔

"اور جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں۔ اُن کے ذمے فدیہ ایک غریب کا کھانا ہے۔"

(بیان القرآن ۱۳۵۳ھ ج ۱ ص ۱۰۲)

اس ترجمہ کی تفسیر یوں کرتے ہیں :-

"اور دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی۔ یہ ہے کہ جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی روزہ رکھنے کو جی نہ چاہے۔ تو ان کے ذمے کا فدیہ یعنی بدلا ایک غریب کو کھانا کھلا دینا ہے۔"

مولانا اشرف علی تھانوی نے آیت کا ترجمہ ہر لحاظ سے صحیح کیا تھا۔ لیکن تفسیر میں "جو بعد میں منسوخ ہو گئی" کی بحر لگا کر حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

(۸) حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی۔

"اور اُوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں۔ اس (روزے) کی بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔" .... .... مفہوم صاف ہے

(۹) حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی:-

"اور جن کو طاقت ہے روزے کی اُن کے ذمے بدلہ ہے۔ ایک فقیر کا کھانا"

ترجمہ صاف ہے۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی۔ حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ یہ رعایت بعد میں منسوخ ہو گئی تھی۔

"وعلی المطیقین للصیام ان افطروا فدیۃ طعام مسکین"

[جواہر القرآن طبع ۱۳۵۰ھ ج ا ص ۱۲۵]

(اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ اور پھر بھی نہیں رکھتے وہ فدیہ دیں۔ یعنی ایک غریب کو کھانا کھلا دیں۔)

اس آیت کی تفسیر یوں لکھتے ہیں۔

وعلی الذین یطیقونہ فیطوقونہ ای یصومونہ بجھد ومشقۃ .... فدیۃ ای جزاء لما وقع من تقصیر فی العبادۃ۔

(اور جن لوگوں کو روزے میں اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ روزہ اُن کے گلے میں مصیبت کا ڈھول بن جاتا ہے۔ وہ فدیہ دے کر گلو خلاصی کرا سکتے ہیں۔ اور یہ فدیہ اس تقصیر فی العبادت کا بدلہ سمجھا جائے گا۔)

چونکہ جناب ائمۃ القراء نے "یطیقونہ" کی ایک قرأت "یطوقونہ" بھی لکھ دکھی ہے۔ اس لیے ہمارے بعض مفسرین یطیقون کی تفسیر یطوقون کرتے ہیں۔ اور یہی علامہ طنطاوی نے کیا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت یطیقون کو پیش نظر رکھا۔ اور تفسیر

ہیں یُطِیْقُوْنَہٗ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ لا یطیقون اور یطوّقون کے مفہوم میں زمین و آسمان کا فرق ہے لا یطیقون سے مراد صرف ضعیف اور سن رسیدہ بوڑھے ہیں اور یطوّقون سے مراد وہ لوگ جنھیں روزہ تکلیف دیتا ہو۔ خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ چونکہ گرمیوں کا روزہ تقریباً ہر آدمی کے لیئے تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ اِسی لیے ہر آدمی فدیہ دے سکتا ہے۔

**رعایت فدیہ ضروری ہے** چونکہ اسلام تمام زمانوں، تمام انسانوں اور تمام ملکوں کا مذہب ہے۔ اِس لیے فدیہ کی رعایت مندرجہ ذیل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔

اوّل:۔ ان ہزارہا امیدواروں کے لیے جن کے امتحانات رمضان کے معاً بعد شروع ہو رہے ہوں، تاکہ وہ کما حقہٗ تیاری کر سکیں اور ناکام نہ ہو جائیں۔

دوم:۔ ان باشندگانِ منطقہائے حارہ کے لیے جن کیلئے روزہ ایک مصیبت بن جاتا ہو۔

سوئم:۔ اُن انجن ڈرائیوروں کے لیے جو جون کی دوپہر کو سندھ اور بھکرؔ کے صحراؤں میں ٹرینیں لیے جا رہے ہوں۔

چہارم:۔ ان مزدوروں کے لیے جو کوئلے، پٹرول اور فولاد کے کارخانوں میں کام کر رہے ہوں، اگر یہ لوگ کام بند کر دیں۔ تو قوم کو کروڑوں روپیہ کا نقصان ہو۔

پنجم:۔ اُن کسانوں کے لیے جو مئی اور جون کی لُوئیں ہل چلانے پر مجبور ہوں۔

ششم:۔ اُن مزدوروں کے لیے جو گرمی کی دوپہر میں سڑک کھودنے اور بوجھ اٹھانے پر مامور ہوں۔

ہفتم :- ان فوجیوں کے لیے جو سرحدوں پہ متعین ہوں اور جنھیں خطرہ ہو کہ اگر روزے کی وجہ سے ذرا ڈھیلے پڑ گئے تو دشمن ہلہ بول دیگا۔

ہشتم :- اُن ملازمینِ حکومت کے لیے - جن کا روزہ انھیں سُست بنا دیتا ہو اور وہ کام نہ نکال سکتے ہوں - پنجاب سیکرٹریٹ کے ہر شعبے میں ہر روز سینکڑوں خطوط اور مسلیں آتی ہیں - اگر دس کلرک روزے کی وجہ سے سُست ہو جائیں - تو ظاہر ہے کہ مسلوں کے انبار جمع ہو جائیں گے کام تقریباً رک جائے گا - اور حکومت بدنام ہو جائیگی :-

نہم :- ان معلّمین کے لیے جو جماعت میں اِس ڈر سے بولنا بند کر دیتے ہوں کہ کہیں گلے کی رگیں خشک نہ ہو جائیں - اور پیاس نہ بڑھ جائے - ایسے معلّم جہاں ترکِ فرائض کے مجرم بنتے ہیں - وہیں وہ طلبہ کو مہینہ بھر بیکار رکھ کر نقصان پہنچاتے ہیں -

دہم :- ناروے - سکاٹ لینڈ ، فن لینڈ اور سویڈن کے اُن باشندوں کے لیے جن کے ہاں دن ۱۸ ، ۱۹ اور ۲۰ گھنٹوں کا ہوتا ہے - دقس علیٰ ھٰذا -

---

**فدیہ وصوم کا موازنہ** | اللہ نے روزے کا مقصد تقویٰ بتایا ہے لعلکم تتقون روزے اس لیے فرض کیے گئے کہ تم متقی بنو - اور تمھارے کردار میں پاکیزگی آ جائے -

اس حقیقت سے ہر مُسلم آشنا ہے اور بیسیوں احادیث اس موضوع پر موجود ہیں کہ ایک بد کردار انسان کا روزہ بیکار محض ہے - اگر ایک شخص

روزہ رکھ کر جھوٹ بولتا، وعدے توڑتا، رشوت کھاتا، اور جُوا کھیلتا ہے، غیبت اور غمازی اُس کا پیشہ بن چکا ہے۔ تو وہ بیشک روزہ نہ رکھے۔ اس لیے کہ روزہ کا مقصد زبان، آنکھ، دل اور دماغ پر پہرے بٹھانا ہے۔ اور جو روزہ اس مقصد کے لیے مفید نہیں روزہ نہیں۔ کچھ اور بلا ہے۔ پاکیزگی خواہشات پر قابو پانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان کی سب سے بڑی خواہش زراندوزی ہے۔ ہم نے زندگی میں بارہا دیکھا ہے کہ بعض لوگوں نے جان دیدی۔ لیکن پیسہ نہ دیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ چند ٹکوں کی خاطر بڑے بڑے خوبصورت نوجوان آگ میں کود پڑے۔ آپ میں سے اکثر دو جنگ ہائے عظیم دیکھ چکے ہیں۔ انگریز نے لاکھوں نوجوان ہمارے ملک سے سترہ روپے پر خرید کر جنگ کی بھٹی میں جھونک دیئے۔ ان نوجوانوں نے سترہ روپوں کو اتنی بڑی دولت سمجھا۔ کہ ان کی خاطر مرگ و ہلاکت کے کھولتے ہوئے جہنم میں کُود پڑے۔

ایک چور آبادی سے دُور غاروں میں رہتا ہے۔ جہان بھر کے مصائب جھیلتا ہے رات کو میلوں سفر کر کے دبے پاؤں کسی فصیل سے کُود کر کسی گھر میں داخل ہوتا ہے۔ گھر والوں کو بے رحمانہ قتل کرتا ہے سارا شہر اس کا محاصرہ کرتا ہے۔ وہ گالیاں، اینٹ پتھر، لاٹھیاں اور گولیاں کھاتا ہوا پھر میلوں بھاگتا ہے۔ جانتے ہو کس لیے؟... صرف مال کے لیے۔ مال بڑی پیاری چیز ہے۔ اتنی پیاری کہ ادھر حضورؐ علیہ السلام کی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر ایک پورے قبیلے نے اللہ کی راہ میں مال پیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ... قرآن :۔

(مال کی حرص و محبت تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے)

پاکستان میں ایسے امراء و اغنیا کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ جو مسلم ہونے کے باوجود زکواۃ کا ایک پیسہ تک ادا نہیں کرتے۔ قوم پہ بڑی سے بڑی مصیبت بن جائے، وہ ایک کوڑی تک نہیں دیتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دولت بڑی پیاری چیز ہے۔ چونکہ اسلام اس طرح کی تمام انسانی خواہشات کو کچلنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے اس نے زکواۃ کو مذہب کا اصل الاصول بنا دیا۔ اور اعلان کیا:-

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

(کہ جب تک ہماری راہ میں اپنی پیاری دولت خرچ نہیں کرو گے کبھی کامیاب نہیں ہو گے)

اور ساتھ ہی دھمکایا کہ ہم تمھاری جمع کردہ دولت سے تمھارے اجسام کو داغیں گے اور تم پر ذلت و لعنت برسائیں گے۔ صحابہ کرام خدائی منشا کے سانچے میں یوں ڈھل چکے تھے کہ شہنشاہی میں بھی فقری کو ترجیح دیتے تھے۔ روم و ایران کے خزائن، مصر و شام کے بے پایاں دفائن۔ اُن کے قدموں میں پھینک دیئے گئے تھے۔ لیکن اُن تقوٰی شعاروں نے ان انبار ہائے دولت کی طرف نگاہ تک اٹھانا نگاہ کی توہین سمجھی اور تمام خواہشات کو کچلتے ہوئے معالیِ حیات کی طرف اِس انداز سے بڑھے کہ انسان تو ایک طرف ملائکہ و ربّ الملائکہ تک نے بھی اُن پر تمجید و ثنا کے پھول برسائے۔

ان تفاصیل سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ انسان میں مال کی محبت کتنی

شدید ہے۔ اور اس سے مال لینا گویا گوشت سے ناخن جدا کرنا ہے

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حصولِ پاکیزگی میں روزہ بہترین عبادت ہے۔ لیکن فدیہ بھی تو کوئی ایسی ویسی نیکی نہیں۔ اگر حکومت پاکستان تمام بے روزوں سے فدیہ جمع کرنے کا انتظام کرے تو پاکستان میں ایک بھی غریب نہ رہے۔ پاکستان کی موجودہ آبادی دس کروڑ ہے۔ جن میں مکلّفین روزہ کی تعداد چھ کروڑ سے کم نہیں ہوگی۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ روزہ والوں کی تعداد کہیں بھی پانچ فی صدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے پاکستان میں صرف ۵۰ لاکھ مسلمان روزے رکھتے ہیں۔ اور ساڑھے پانچ کروڑ فدیہ اور روزہ ہر دو ہضم کر جاتے ہیں۔ اگر ایک غریب کے طعام کا خرچ فی وقت آٹھ آنے اور یومیہ ایک روپیہ ہو تو صرف ایک روزہ خور کا فدیہ ماہ رمضان تیس روپے بنتا ہے۔ اس حساب سے ساڑھے پانچ کروڑ روزہ خوروں کا فدیہ ایک ارب پچھتر کروڑ بنے گا اور یہ رقم اتنی بڑی ہے کہ اس سے ملک کی غربت کا مسئلہ صرف ایک سال میں حل ہو سکتا ہے۔

لیکن یاد رکھیئے کہ فدیہ ادا کرنا آسان نہیں۔ اگر ایک گھر میں بیوی سمیت پانچ بالغ افراد ہوں تو ان کے فدیہ کی رقم ایک سو پچاس روپیہ بنتی ہے۔ اور یہ اتنی بڑی رقم ہے جسے ایک متوسط الحال عیالدار کسی صورت میں ادا نہیں کر سکتا۔ اگر ہماری حکومت اور رائے عامہ ہر مسلمان کو صوم یا فدیہ صوم پہ مجبور کر دے۔ تو روزہ خوروں کی بہت بڑی اکثریت از رہِ فدیہ سے بچنے کیلئے یا تو روزہ دار بن جائے گی۔ اور یا اسلام چھوڑ جائے گی۔

# خاتمہ

میری اِس تحریر کا مقصد مسلمانوں سے روزے چھڑانا نہیں۔ بلکہ قرآنِ عظیم کے ایک بھولے ہوئے حکم کو پھر زندہ کرنا ہے۔ کہ مسلمانوں پر دو میں سے ایک چیز فرض ہے۔ صوم یا فدیہ صوم۔

جو لوگ روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ضرور رکھیں، کہ یہ بڑی نیکی ہے۔ اور جو نہ رکھیں، اُن سے حکومت، مُسلم لیگ یا رضا کاروں کی جماعت، فدیہ وصول کرنے کا انتظام کرے۔ اور جو بزرگ نہ روزہ رکھیں اور نہ فدیہ دینا چاہیں بہتر ہے کہ وہ اسلام چھوڑ کر سناتن دھرم اختیار فرمالیں۔ کہ اسلام میں نفس پرستوں اور زرپرستوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

# شریعت کیا ہے

آج ملک کے ہر گوشے سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے کہ پاکستان میں شریعت کو نافذ کرو۔ لیکن آج تک کسی عالم کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ شریعت کے مفہوم پر روشنی ڈالے اور ہمیں بتائے کہ شریعت سے کیا مراد ہے؟ آیا شریعت سے مراد صرف قرآن ہے۔ یا اس میں حدیث اور فقہا کا اجتہاد بھی شامل ہے؟ اگر صرف قرآن مراد ہے، تو چشم ما روشن ۔ دل ما شاد۔ اور اگر حدیث و فقہا اجتہاد بھی شاملِ شریعت ہے، تو ایسی شریعت محلِ نظر ہے

**حدیث** | رسول اکرم صلی اللہ وعلیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں خود حضور اور صحابہ رضؓ کی توجہ کا مرکز قرآن تھا۔

ایک مرتبہ حضرت صدیق رضؓ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا۔

تم آج حدیث کے متعلق اختلاف رکھتے ہو۔ آئندہ نسلوں میں یہ اختلاف اور بڑھ جائے گا۔ لہذا آنحضرت صلعم سے کوئی روایت نہ کرو۔ اور اگر کوئی پوچھے تو کہو۔ کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز کیا ہے اُسے جائز اور جو ناجائز قرار دیا ہے، اُسے ناجائز سمجھو:۔

( تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبی )

حضرت عمر رضؓ اس معاملہ میں اِس قدر متشدد تھے۔ کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ

ابوالدردا اور ابوذر جیسے جلیل القدر صحابہؓ کو روایتِ احادیث کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔

"تم لوگ زیادہ حدیثیں بیان نہ کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ لوگ اللہ اور رسول کی تکذیب کریں" (توجیہہ)

ایک مرتبہ کاتب الوحی حضرت زید بن ثابت امیر معاویہ کے دربار میں گئے۔ اور امیر کی فرمائش پر کوئی حدیث سنائی جسے کاتب دربار نے قلمبند کر لیا۔ آپ نے وہ کاغذ لیکر پھیر ڈالا۔ اور فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے احادیث لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی۔

علامہ ذہبی اپنی مشہور تصنیف تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ حضرت صدیقؓ نے ۵۰۰ احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ لیکن ایک صبح اُسے جلا ڈالا۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے احادیث جمع کرنے کا ارادہ کیا پہلے مہینہ بھر سوچتے رہے۔ پھر استخارہ کیا۔ اور اس کے بعد فرمایا۔

"پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہو گئی تھیں۔ کہ انھوں نے اپنے رسولوں کی احادیث لکھ لی تھیں۔ پھر انہی احادیث پہ جھک پڑی تھیں اور کتاب الٰہی کو چھوڑ دیا۔

(مختصر جامع بیان العلم)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے تمام صحابہ سے کہا کہ جس صحابی کے پاس کوئی حدیث لکھی ہوئی موجود ہو وہ لے آئے۔ چنانچہ صحابہؓ ایسی تمام احادیث لے آئے۔ اور آپ نے اِس تمام ذخیرے کو نذر آتش کر دیا۔

[طبقات ابن سعد جز و خامس ص ۱۴۳]

عبداللہ بن یسار کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت علیؓ نے اپنے خطبے میں فرمایا۔ کہ ہر شخص گھر پہنچتے ہی اپنے ذخیرۂ احادیث کو جلا ڈالے۔

(مختصر جامع بیان العلم صـ ۳۳)

حضرت علیؓ، عمرؓ، ابوبکرؓ سے زیادہ رسول کا شیدائی اور کون ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں نے ذخیرۂ احادیث کو اس لیے تلف نہیں کیا تھا۔ کہ معاذ اللہ ان لوگوں کو اقوالِ رسول سے عناد تھا۔ بلکہ اس لیے کہ ان اقوال میں کہیں تو تحریف ہو گئی تھی اور کہیں اہلِ غرض کے اپنے اقوال شامل ہو گئے تھے۔ اور احادیث کا چشمۂ شفاف مکدّر ہو کر رہ گیا تھا۔ رسول اکرم صلعم کے اقوال سے سرتابی کی جرأت کِسے ہو سکتی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ صحیح اقوال کے انبار میں اقوال رسولؐ کو ڈھونڈنا مشکل ہو گیا تھا جب امام بخاری۔ وفات (سنہ ۲۵۶ھ) امام مُسلم (وفات سنہ ۲۶۱ھ) محمد عیسیٰ الترمذی (وفات سنہ ۲۷۹ھ) ابوعبداللہ بن تبرید القزوینی المعروف بہ ابن ماجہ (وفات سنہ ۲۷۳ھ) ابوداؤد سجستانی (وفات سنہ ۲۷۵ھ) اور احمد بن شعیب النسائی (وفات سنہ ۳۰۳ھ) نے تدوین وتعدیلِ احادیث کا کام شروع کیا۔ تو ان لوگوں کے سامنے ۱۴ لاکھ احادیث کا طومارِ عظیم موجود تھا جن میں سے امام بخاری نے صرف ۲۷۵، انتخاب کیں اور باقی سب کو مُسترد کر دیا۔ یہی حال دیگر حضرات کا ہے۔ ان حضرات نے انتخابِ احادیث میں جن اصولوں کو سامنے رکھا۔ ان میں سے اہم دو تھے۔

اوّل۔ روایت۔ یعنی جن راویوں کے ذریعے حدیث رسولؐ تک پہنچ رہی ہے وہ قابلِ اعتماد ہوں۔

دوم:۔ درایت۔ کہ حدیث کا مضمون قرآنی نصوص عقل اور اللہ کی سنتِ جاریہ

سے متصادم نہ ہو۔

اصول تو نہایت عمدہ ہیں۔ لیکن ہمارے ائمہ حدیث اُن روایات میں بے بس ہو جاتے ہیں۔ جو بعض لوگوں نے معتبر راویوں کی سند سے وضع کی تھیں۔

**فقہ** | اللہ نے قرآن کی وساطت سے انسان کو صرف وہیں تک راہ ہدایت دکھائی ہے جہاں تک اُس کی عقل کام نہیں کر سکتی تھی یا انسانی عقول میں شدید اختلاف تھا۔ اور جہاں کہیں انسانی عقل کام کر سکتی تھی۔ ایسے تمام مسائل میں انسان کو آزادی دے دی کہ حق و انصاف کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ضروریات کا حل خود تلاش کر لے۔ بطور مثال سُور۔ سُور اور شراب کے متعلق ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ اللہ نے ان کی حرمت کا قطعی فیصلہ فرمایا اور دیگر اشیاء کے متعلق صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا ہے۔ کہ :-

كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ | ہماری پاکیزہ اشیاء کھاؤ

ہم نے کیکڑے۔ سانڈے۔ کچھوے۔ گدھے اور دیگر بیشمار اشیاء کو غلیظ سمجھ کر حرام قرار دے دیا ہے۔ اور فاختہ، مرغابی، کبوتر، مچھلی اور دیگر پاکیزہ طیور و حیوانات کو حلال بنا لیا ہے۔ یہ بھی انسانی دماغ کی کارستانی۔

ایک اور مثال لیجئے۔ انسانی جرائم کی فہرست کافی لمبی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے صرف پانچ جرائم کی سزا بیان فرمائی ہے۔ یعنی قتل، زنا، بہتان زنا، چوری اور بغاوت کی۔ قتل کے لیے موت، زنا کے لیے سو دُرّے۔ بہتانِ زنا کے لیے اسّی دُرّے۔ چوری کے لیے قطع ید۔ اور بغاوت کے لیے موت یا جلا وطنی یا قطع اعضاء۔ اور باقی جرائم مثلاً مار پیٹ، گالی گلوچ، توہین۔ فریب، شراب نوشی، قمار بازی۔ جائداد کی تلفی

اغلام اور خیانت وغیرہ کی سزا کا فیصلہ انسانی دماغ پر چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے فقہاء نے ان تمام تفاصیل کا فیصلہ کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری قرار دی ہیں۔

اوّل :- کہ ایسی کوئی سزا اصولِ قرآنی کے خلاف نہ ہو۔

دوم :- تمام قوم اس پر متفق ہو۔

پہلی چیز کو قیاس اور دوسری کو اجماع کہتے ہیں۔ قیاس کا مطلب تو صاف ہے۔ کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت قرآن اور صحیح احادیث میں اُس کی نظائر تلاش فرمایئے یا یہ دیکھئے کہ آپ کا فیصلہ حق و انصاف کے تقاضوں کو نہیں توڑتا۔ اور کسی صریح نص سے تو متصادم نہیں ہوتا۔ باقی رہا اجماع تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کسی فیصلے پر تمام علمأ کا اتفاق ہو۔ اجتہادی مسائل میں علمأ کبھی متفق نہیں ہوئے اور نہ آئندہ ہوں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ قوم اپنے بہترین دماغ منتخب کرے جو اللہ اور اُسکے رسولؐ کی منشا سے آگاہ ہوں۔ اور یہ دماغ مل کر اجتہادی مسائل پہ غور کریں اور ان تمام کا فیصلہ کریں۔ جن کے متعلق خدا اور رسولؐ خاموش ہیں۔ مثلاً جھوٹے فریب شراب نوشی کی سزائیں مقرر کریں۔ تجارت وغیرہ کے لیے قانون بنائیں۔ ریلوں۔ موٹروں ہوائی جہازوں، بیمہ کمپنیوں۔ عدالتوں، مدرسوں اور دیگر بیشمار اداروں کے لیے قواعد وضع کریں۔ یہی اجتہاد اور اجتماع ہے۔

:- قوم کو چاہیے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی محنت سے فائدہ اُٹھائے اور اس سلسلے میں بڑے بڑے ماہرینِ قانون مثلاً "ابو حنیفہؒ"، امام شافعیؒ، امام مالکؒ وغیرہ کے اجتہاد کو سامنے رکھے۔ جہاں کہیں اُن کے وضع کردہ قواعد پسند آ جائیں۔ انھیں اپنا لے۔ ورنہ اپنی راہ خود نکالے۔

**اجتہادی مسائل میں اختلاف** | ہر فرد کو زندگی میں نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں۔ جتنے مسائل پیش آئیں، اتنے ہی حل چاہییں۔ اور جتنے تنازعے پیدا ہوں اُتنے ہی فیصلے درکار ہیں۔ چونکہ قرآن میں بہت کم تنازعات کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ تمام قرآنی احکام کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ نہیں۔ اس لیے انسان ہمیشہ اجتہاد سے کام لیتا رہا۔ اجتہاد میں اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔ اور ایسا اختلاف کوئی بُری چیز نہیں۔ حضورِ پُر نورؐ کی طرف یہ قول منسوب ہے۔ کہ

"اگر مجتہد اجتہاد میں غلطی کر جائے تو وہ ایک اجر کا مستحق ہے ورنہ دو اجر کا"۔

اسی اجتہاد کی بنا پر بعض جلیل القدر صحابہؓ کے فیصلوں میں بھی اختلاف تھا۔ مثلاً

۱۔ امام محمد ابو حنیفہ سے وہ حماد سے اور حماد ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ۔ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا۔ لیکن مہر معیّن نہیں کیا تھا۔ وہ مجامعت سے پہلے مر گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اُس عورت کو پُورا مہر دلوا دیا۔ حضرت علیؓ کا فیصلہ یہ تھا۔ کہ عورت وراثت میں حقدار ہے۔ اسکے لیے عِدّت بھی ضروری ہے۔ لیکن وہ مہر کی مستحق نہیں۔

۲۔ ایک مطلقہ عورت نے عدّت کے زمانے میں نکاح کر لیا حضرت عمرؓ نے شوہر کو کوڑے لگائے۔ دونوں میں علیحدگی کرا دی۔ اور عورت کو حکم دیا۔ کہ پہلے عدّت کا زمانہ پورا کرے۔ اور پھر اگر دوسرے شوہر نے مقاربت کی ہے۔ تو دوسری طلاق کی عدّت بھی پوری کرے۔ اور ساتھ ہی دو کر

شوہر سے اُس کا نکاح حرام قرار دیدیا۔ لیکن حضرت علی کا خیال یہ تھا کہ پہلی عدّت کے بعد دوسرا شوہر اُس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

۳۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابت نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے نکاح کرلے تو وہ صرف دو طلاقوں سے حرام ہو سکتی ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ حرام ہونے کے لیے تین طلاقیں چاہییں۔

۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی حضرت عثمانؓ نے عدّت گزرجانے کے بعد اُسے ترکہ سے حصّہ دلایا لیکن حضرت عمر کی رائے یہ تھی۔ کہ عورت صرف عِدّت کے زمانے میں ترکہ سے حِصّہ لے سکتی ہے۔ بعد میں نہیں۔

۵۔ اگر کسی حاملہ عورت کا شوہر مرجائے۔ تو حضرت عمر کے ہاں اُس کی عدّت وضعِ حمل تک ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کا قول یہ ہے کہ۔ چار ماہ دس دن اور وضعِ حمل تک جو نسا زمانہ لمبا ہو وہی زمانۂ عدّت تصور ہوگا۔

۶۔ رسول کریمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک وقت میں تین طلاقیں ایک طلاق کے برابر تصور ہوتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ انھیں تین قرار دیکر عورت اور مرد میں علیحدگی کرا دیتے تھے۔

اجتہادی مسائل میں حضرت عمرؓ کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اخیافی بھائی۔ ماں اور باپ کی موجودگی میں حقیقی بھائیوں کو وراثت سے محروم کر دیا۔ اور اگلے سال سب کو شریکِ وراثت بنا لیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔

" وہ اس فیصلے کے مطابق تھا جو ہم نے پچھلے سال کیا تھا۔ اور یہ اِس فیصلے کے مطابق ہے جو ہم اس سال کر رہے ہیں۔"

[ تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری ص ۱۲۲ ]

اس طرح کے کئی سو مسائل ہیں جن میں صحابہ کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ چونکہ کوئی فیصلہ قرآن سے متصادم نہیں ہوتا تھا اور نہ تقاضائے حق و انصاف کے خلاف تھا اس لیے ہر فیصلے کو درست سمجھنا چاہیے۔

**اختلافِ فقہا** رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے تقریباً ایک سو برس بعد دنیائے اسلام میں چار بڑے بڑے مجتہد پیدا ہوئے۔ جن کے جلو میں چند چھوٹے چھوٹے مجتہد بھی آئے۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) نعمان بن ثابت المعروف بہ امام حنیفہ کوفی (۸۰ھ۔ ۱۵۰ھ) اس زمانے میں تین اور بڑے بڑے فقیہہ بھی کوفہ میں موجود تھے۔ یعنی سفیان بن سعید ثوری۔ شریک بن عبداللہ النخعی (۹۵ھ۔ ۱۷۷ھ) اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (۷۴ھ۔ ۱۴۸ھ) ان سب کا اجتہادی مسائل میں شدید اختلاف رہتا تھا ابن ابی لیلیٰ شہر کے سرکاری قاضی تھے۔ اور جب کوئی فیصلہ صادر کرتے تھے تو امام ابو حنیفہ ان کے خلاف فتویٰ دے دیتے تھے۔

امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد چار تھے (۱) ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری (۱۱۳ھ۔ ۱۸۳ھ) (۲) زفر بن ہذیل بن قیس کوفی (۱۱۰ھ۔ ۱۵۸ھ) (۳) محمد بن حسن بن فرقد شیبانی (۱۳۲ھ۔ ۱۸۹ھ) اور (۴) حسن بن زیاد لولوی (وفات ۲۰۴ھ) یہ شاگرد صرف مقلد ہی نہیں تھے

بلکہ بعض اوقات اپنے اجتہاد سے بھی فتویٰ دیتے۔ اور اپنے استاد کے خلاف چل جاتے تھے۔ ابو یوسف اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں پہلے استاد کی رائے درج کرتے ہیں اور پھر اپنا فیصلہ دے کر استاد سے وجہ اختلاف بتاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور تصنیف "خلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ" میں کسی مسئلے کے متعلق پہلے امام ابو حنیفہ کی رائے درج کرتے ہیں اور پھر اپنا فیصلہ دیتے ہیں۔ یہ فیصلہ کبھی امام ابو حنیفہ کی تائید میں ہوتا ہے اور کبھی خلاف۔ جب ابو یوسف اور محمدؒ اہل حجاز کی حدیثوں سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے اپنے استاد کے بیشتر فیصلوں کو مسترد کر دیا:۔

ان شاگردوں کے آگے بھی کئی شاگرد تھے۔ مثلاً ابراہیم بن رستم مروزی وفات (۲۱۱ھ) بشر بن غیاث المریسی (وفات ۲۲۸ھ) بشر بن ولید کندی وفات (۲۳۸ھ) عیسیٰ بن ابان بن صدقہ (وفات ۲۲۱ھ) وغیرہ۔ یہ لوگ بھی بعض معاملات میں اپنے اساتذہ کے خلاف چلتے تھے۔ بشر بن غیاث المریسی تو امام شافعی سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ فقیہہ ہے جس نے کہا تھا کہ گدھا حلال ہے۔

۲- امام مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر مدنی (۹۳ھ - ۱۷۹ھ) بڑے پایہ کے محدث اور فقیہہ تھے۔ لیکن امام شافعی نے اپنی تصنیف کتاب الام میں نیز ابو یوسف نے اپنی تحریرات میں امام مالک کی سخت تردید کی ہے۔ اور بعض مسائل تو ایسے ہیں کہ ساری خدائی ایک طرف، امام مالک دوسری طرف۔ مثلاً امام امالک کے نزدیک چوری کے ملزم کو چوری کا اقرار کرانے کے لیے بدنی سزا دینا جائز ہے لیکن باقی تمام فقیہہ اس کے مخالف ہیں۔ اسی طرح امام مالک کے ہاں ایک

مفقود الخبر شوہر کی بیوی چار سال کے بعد نیا نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن باقی امام اس کی اجازت نہیں دیتے۔

امام مالک کے بیسیوں شاگرد تھے مثلاً ابو عبد اللہ۔ عبد الرحمٰن بن القاسم العتقی (وفات ۱۹۱ھ) اشہب بن عبد العزیز، القیسی العامری الجعدی (۱۴۰ھ۔ ۲۰۴ھ) ابو محمد عبد اللہ بن وہب بن مسلم قرشی (۱۲۵ھ۔ ۱۹۷ھ) وغیرہ۔ یہ سب لوگ بھی بعض مسائل کے متعلق نہ صرف آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔ بلکہ بعض معاملات میں استاد کی رائے کو بھی مسترد کر دیتے تھے۔

۳۔ ابو عبد اللہ محمد بن ادریس بن عباس الشافعی (۱۵۰ھ۔ ۲۰۴ھ) بلند درجے کے محدث، فقیہہ اور مجتہد تھے۔ لیکن اجتہادی مسائل میں دوسرے فقہا سے اختلاف کا یہ عالم تھا۔ کہ جب مامون الرشید نے آپ کو بغداد میں طلب کیا تو وہاں امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد سے آپ کے کئی مناظرے ہوئے۔ حنفی و شوافع کا اختلاف اظہر من الشمس ہے۔ خود امام شافعی کے تلامذہ میں بعض ایسے لوگ پائے جاتے تھے۔ جو استاد سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک ابو ثور ابراہیم بن خالد بن الیمان الکلبی البغدادی (وفات ۲۴۰ھ) تھا۔ جو وصیت کو قرض پر مقدم سمجھتا تھا۔ اور امام شافعی مؤخر۔ اگر خریدے ہوئے مال میں عیب نکل آئے تو امام شافعی کا فیصلہ ہے کہ اسے فوراً واپس کر دو۔ لیکن ابراہیم یہ کہتے ہیں۔ کہ بائع کی رضامندی ضروری ہے۔ اسی طرح اگر جنگل میں دو مسافر سمت قبلہ کے متعلق مختلف الرائے ہو جائیں تو ابراہیم کہتے ہیں کہ ان میں ہر ایک۔ دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن۔ ان کے استاد کی رائے یہ ہے

کہ ہر مسافر اُس سمت کو رخ کر کے نماز پڑھے - جسے وہ قبلہ سمجھتا ہے۔

امام احمد بن حنبل اور ابو علی الحسین بن علی الکرابیسی بھی امام شافعی کے شاگرد تھے - لیکن ان دونوں میں مسئلہ خلق قرآن پر شدید اختلاف رہتا تھا۔ ابن حنبل قرآن کے الفاظ و معانی کو غیر مخلوق سمجھتے تھے - اور الکرابیسی یہ فرمایا کرتے تھے کہ قرأت قرآن مخلوق ہے - اور ابن حنبل اس چیز کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے -

امام شافعی کے ایک اور شاگرد احمد بن یحییٰ بن عبد العزیز البغدادی المتکلم کی رائے یہ تھی کہ طلاق بالصفات (مثلاً یہ کہنا کہ جب اگلا مہینہ آئے تو میری بیوی مجھ پر حرام ہو جائے) جائز نہیں اور کسی شرط سے طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن ابن سبکی اور ابن حزم کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے -

۴ :- امام احمد بن حنبل بن ہلال (۱۶۴ھ - ۲۴۱ھ) کا شمار فقہا سے زیادہ محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ کی مسند میں چالیس ہزار سے زیادہ حدیثیں ہیں - جب معتزلیوں کے نظریوں سے متاثر ہو کر مامون الرشید نے علمائے اسلام کو خلق قرآن کا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دی تو آپ کے بڑے بڑے شاگرد بھی آپ کو چھوڑ گئے - اور سلطنت کے تقریباً تمام علماء آپ کے مخالف ہو گئے -

اجتہادی مسائل میں ہمارے فقہا و محدثین میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے ایک ہی مقدمہ میں علمائے عراق کا فیصلہ کچھ ہوتا تھا اور علمائے مصر و شام کا کچھ اور - اور یہ اختلاف آج ہماری عدالتوں میں بھی ملتا ہے - ہند و پاکستان

میں ابھی تک تعزیرات ہند ابھی تک رائج ہے۔ کتاب قوانین ایک ہی ہے لیکن مختلف عدالتوں سے ایک ہی معاملہ کے متعلق مختلف فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ آج سے بیس برس پیشتر دو ہندوؤں نے پیغمبر اسلام کے متعلق توہین آمیز تحریرات شائع کیں۔ ایک پنجابی تھا۔ یعنی راجپال۔ اور دوسرا "ورتمان" کا ایڈیٹر غالباً یوپی سے تعلق رکھتا تھا۔ یوپی کی عدالت نے "ورتمان" کو سزا دی۔ اور پنجاب ہائیکورٹ نے راجپال کو بری کر دیا۔ جرم ایک تھا، قانون ایک تھا۔ دونوں عدالتیں انگریزی کی تھیں۔ لیکن ایک جج کا فیصلہ دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک ہی قانون کا مفہوم ایک جج نے کچھ اور سمجھا اور دوسرے نے کچھ اور۔ ہم کسی جج پر بدنیتی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ اس لیے کہ ایک ہی قانون کی مختلف تشریحیں ہو سکتی ہیں۔ یا استنباطِ مسائل و استخراجِ نتائج میں اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف کبھی بھی قابلِ مذمت نہیں سمجھا گیا۔

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی قرآن کے صریح احکام کے خلاف کبھی نہیں جا سکتی۔ لیکن جہاں قرآن خاموش ہے وہاں ہمارے دستور سازوں کو آزادی ہے کہ چاہیں تو کسی مجتہد کی پیروی کر لیں اور یا اپنے مسائل کا حل اپنی ضروریات کے مطابق خود تلاش کریں۔

ہمارے علما سلطنتِ عباسیہ کے زوال تک اجتہاد سے کام لیتے رہے۔ یہ تقلید کا مرض اُس وقت شروع ہوا۔ جب مختلف خطوں کے امراء نے صرف اُن علماء کے وظائف باندھنے شروع کیے۔ جو کسی بڑے مجتہد کی تقلید میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اب کسی عالم کو کیا پڑی تھی۔ کہ وہ اجتہاد کی "مصیبت"

میں پھنس کر اپنی تنخواہ گنوا بیٹھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب قرآن کی جگہ طلبہ نے کسی خاص امام کی فقہ کو پڑھنا شروع کیا۔ آزادیٔ رائے ختم ہوگئی۔ اور جب کوئی فقیہہ کتاب لکھنے بیٹھتا تھا تو اپنے امام کے بعض فتاوے ہی کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتا۔ امام کی رائے سے انحراف یا آزادانہ سوچنا اس کے ہاں بہت بڑا جرم تھا یہ تقلید ہمارے علماء کے رگ و ریشہ میں یوں سرایت کر گئی۔ کہ متاخرین نے فقہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ قرآن متروک ہو گیا۔ مکاتب میں فقہ کا درس دیا جانے لگا۔ اور ان مجتہدین کو اتنا بڑا درجہ دیدیا گیا کہ رسول اکرم صلعم کی طرح ان کی ذات اور تعلیم پہ بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا۔ دورِ تقلید کے ایک بہت بڑے پیشوا، امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جو آیت یا حدیث ہمارے امام کے اجتہاد سے متصادم ہوتی ہو اس کی یا تو کوئی تاویل کرو اور یا اُسے منسوخ سمجھو۔ ہمارے موجودہ علماء اُسی دورِ تقلید کی یادگار ہیں۔ اور اس لیے یہ حضرات کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص امام ابو حنیفہ وغیرہ کے بعد اجتہاد کے دروازے کسی اور کے لیے بھی کھلے رکھے۔ اور نہ ہی وہ اجماع کے مفہوم میں وسعت پیدا ہونے دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اجماع ستونِ فقہ ہے اور اجماع سے مراد گذشتہ علماء کا اجماع تھا۔ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سالہ تاریخ میں سے صرف دس ایسے علماء کا نام لیجئے کہ جو کسی ایک اجتہادی مسئلے پر بھی متفق ہوئے ہوں تو غالباً نہیں بتا سکیں گے۔ ان حالات میں کیا اجماع کا صحیح مفہوم یہ نہیں، کہ قوم کے بہترین دماغ مل کر بیٹھ جائیں۔ اور تمام اجتہادی مسائل کو اپنی قابلیت اور قوتِ فیصلہ سے طے کریں؟ قرآن حکیم میں کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں کہ امام ابو حنیفہ کے بعد سوچنا بند کر دو۔ اور ان

کے فیصلوں کے مطابق کورانہ چلے چلو۔

عہدِ حاضر کا وہ انسان جو ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ جو ایک لمحے میں اپنی آواز چاند کی دنیا تک پہنچا رہا ہے۔ جس نے سورج کی شعاعوں کو مسخر اور کائنات کی تمام طاقتوں کو مغلوب کر رکھا ہے۔ کیا آپ اتنا نااہل اور جاہل سمجھتے ہیں۔ کہ وہ امام شافعی اور ابو حنیفہ کی قیادت کے بغیر زندگی کے معمولی معمولی معاملات کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتا۔

**نفاذِ شریعت کا مقصد**

ہمارے پاس قرآن شریف موجود ہے جس میں ہماری فلاح و نجات کا مکمل دستور العمل درج ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ حضرات قرآن سے یوں بھاگتے ہیں۔ جیسے کوا تیر سے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے بعض احکام تعزیراتِ پاکستان میں درج کر دیئے گئے تو اس سے فرق کیا پڑے گا۔ کیا لوگ زیادہ نیک محض اس لیے بن جائیں گے کہ قرآن جزوِ تعزیرات بنا دیا گیا ہے؟ فرض کیجئے تعزیرات میں درج ہو جاتا ہے کہ نماز چھوڑنے والا ایک ماہ قید کی سزا پائیگا۔ کیا حکومت اتنی پولیس مقرر کر سکے گی۔ کہ وہ ہر گاؤں میں ہر دیہاتی کی نگرانی کر سکے؟ میرا مقصد یہ ہے کہ جب تک لوگ اپنی بہتری کی خود کوشش نہ کریں، حکومت کی آئین سازی مفید نہیں سکتی۔ آخر حکومت اللہ سے تو بڑی نہیں۔ جب اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے، تو حکومت کے قوانین کی کیوں پرواہ کرنے لگے۔

رشوت کا انسداد، قیامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ، اوامر کی تبلیغ اور نواہی کا استیصال حکومت کا فرض ہے اور یہی مقصدِ شریعت ہے

اگر ہر وزیر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھے۔ وزارتی بلندیوں سے اتر کر انسانی سطح پہ آجائے۔ ہر مظلوم کی شکایت ایک انگریز کے کان سے نہیں بلکہ ایک سچے مسلمان کے کان سے سُنے۔ ہر ضلع میں عام دربار لگا کر ہر مظلوم کو آزادی سے فریاد کرنے کا موقع دے۔ بے انصاف حُکّام اور قصوروار دفتریوں کو فوری سزا دے۔ بھیس بدل کر پولیس کی نگرانی کرے۔ ہر بھوکے کو روٹی یا روزگار دے۔ گداگری بند کر کے گداگروں کو جیلوں میں دستکاریاں سکھائے۔ انصاف، علم، احسان، صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے محاسن کو عام کرے تو سمجھو کہ شریعت کا مقصد پورا ہو گیا۔

ہم کیا تھے ——— اِس مضمون کو دیکھئے
ہم کیا ہیں ——— اپنے آپ کو دیکھئے
——— اور
پھر سوچئے کہ ہمیں کیا ہونا چاہیے۔ - - - - - - ؟

# ہم

# اور

# ہمارے اسلاف

# حکایاتِ اسلاف

## جہاد

۱۔ جنگِ اُحد (شوال ۳ھ) میں جب مشہور ہو گیا کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ تو بد دلی میں حضرت عمرؓ تلوار پھینک کر زمین پہ بیٹھ گئے۔ اِس اثنا میں ایک صحابی ابنِ نضرؓ، ان کے پاس سے گزرے اور اس شکستہ ہمتی کی وجہ پوچھی۔ تو حضرت عمرؓ فرمانے لگے۔ کہ حضورؐ کی شہادت کے بعد اب کیا لڑنا ہے۔ ابن نضرؓ فرمانے لگے۔ اگر واقعی رسولؐ شہید ہو گئے ہیں۔ تو ان کے بعد زندہ رہ کر ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہ کہہ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کفار کے ہجوم میں داخل ہو گئے اور اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہید ہو گئے۔

---

(۲) حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ کو اپنی بیوی عاتکہ سے اس قدر محبت تھی کہ وہ ایک دفعہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہؓ کو حکم دیا کہ تمھاری بیوی تم کو اللہ سے دور لے جا رہی ہے اس لیے اسے طلاق دیدو

تعمیل حکم کے بغیر چارہ ہی کیا تھا۔ طلاق کے بعد عبداللہ نے عاتکہ کے فراق میں نہایت درد انگیز اشعار لکھے۔

[اسد الغابہ بہ تذکرہ عاتکہ]

---

(۳) ایک مرتبہ رسول اللہ نے جہاد کے لیے منادی کرائی۔ جب قافلہ روانہ ہونے لگا۔ تو ایک نہایت ضعیف صحابی بھی شامل ہو گئے۔ اور اپنی خدمت کے لیے تین دینار پر ایک نوکر بھی ساتھ لے گئے۔

[ابوداؤد کتاب الجہاد]

---

۴۔ ایک بدو اسلام لانے کے بعد صحابہ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ ایک لڑائی میں کچھ مال غنیمت ملا۔ تو حضور نے بدو کو بھی حصّہ دینا چاہا۔ بدو نے کہا میں مالِ غنیمت کے لیے اسلام نہیں لایا۔ بلکہ اس لیے کہ حلق میں تیر کھا کر شہادت کا مقام بلند حاصل کردں۔ اللہ کی شان ایک جنگ میں وہ ٹھیک حلق پر تیر کھا کر شہید ہو گیا۔ اور حضور نے اپنا جبّہ کفن کے لیے عنایت فرمایا۔

(نسائی کتاب الجنائز)

---

۵۔ جنگِ بدر (رمضان ۲ھ) میں جب دشمنوں کی فوجیں قریب آگئیں تو حضور نے آواز دی "اٹھو اور وہ جنّت حاصل کرو۔ جس کی وسعت ارض و سما کے برابر ہے۔ اس اعلان کے وقت عمیر بن الحمام انصاری کھجوریں کھا رہے

شوہر سے اُس کا نکاح حرام قرار دیدیا۔ لیکن حضرت علی کا خیال یہ تھا کہ پہلی عدت کے بعد دوسرا شوہر اُس سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔

۳۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ نے فتوی دیا کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے نکاح کرلے تو وہ صرف دو طلاقوں سے حرام ہو سکتی ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کی رائے یہ تھی کہ حرام ہونے کے لیے تین طلاقیں چاہییں :-

۴۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی حضرت عثمانؓ نے عدت گزرجانے کے بعد اُسے ترکہ سے حصہ دلایا لیکن حضرت عمر کی رائے یہ تھی۔ کہ عورت صرف عدت کے زمانے میں ترکہ سے حصہ لے سکتی ہے۔ بعد میں نہیں۔

۵۔ اگر کسی حاملہ عورت کا شوہر مرجائے۔ تو حضرت عمر کے ہاں اُس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کا قول یہ ہے کہ۔ چار ماہ دس دن اور وضع حمل تک جونسا زمانہ لمبا ہو وہی زمانۂ عدت تصور ہوگا۔

۶۔ رسول کریمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک وقت میں تین طلاقیں ایک طلاق کے برابر تصور ہوتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ انھیں تین قرار دیکر عورت اور مرد میں علیحدگی کرادیتے تھے۔

اجتہادی مسائل میں حضرت عمرؓ کی آزادی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اخیافی بھائی ماں اور باپ کی موجودگی میں حقیقی بھائیوں کو وراثت سے محروم کردیا۔ اور اگلے سال سب کو شریکِ وراثت بنالیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔

" وہ اس فیصلے کے مطابق تھا جو ہم نے پچھلے سال کیا تھا۔ اور یہ اِس فیصلے کے مطابق ہے جو ہم اس سال کر رہے ہیں "

[ تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری ص ۱۲۲ ]

اس طرح کے کئی سو مسائل ہیں جن میں صحابہ کے فیصلے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ چونکہ کوئی فیصلہ قرآن سے متصادم نہیں ہوتا تھا اور نہ تقاضائے حق و انصاف کے خلاف تھا اس لیے ہر فیصلے کو درست سمجھنا چاہیے۔

**اختلافِ فقہا** رسول اکرم صلی اللہ و علیہ والہ وسلم کی رحلت کے تقریباً ایک سو برس بعد دنیائے اسلام میں چار بڑے بڑے مجتہد پیدا ہوئے۔ جن کے جلو میں چند چھوٹے چھوٹے مجتہد بھی آئے۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) نعمان بن ثابت المعروف بہ امام حنیفہ کوفی (۸۰ھ - ۱۵۰ھ) اس زمانے میں تین اور بڑے بڑے فقیہہ بھی کوفہ میں موجود تھے۔ یعنی سفیان بن سعید ثوری۔ شریک بن عبداللہ النخعی (۹۵ھ - ۱۷۷ھ) اور محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (۷۴ھ - ۱۴۸ھ) ان سب کا اجتہادی مسائل میں شدید اختلاف رہتا تھا ابن ابی لیلیٰ شہر کے سرکاری قاضی تھے۔ اور جب کوئی فیصلہ صادر کرتے تھے تو امام ابو حنیفہ ان کے خلاف فتویٰ دے دیتے تھے۔

امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد چار تھے (۱) ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری (۱۱۳ھ - ۱۸۳ھ) (۲) زفر بن ہذیل بن قیس کوفی (۱۱۰ھ - ۱۵۸ھ) (۳) محمد بن حسن بن فرقد شیبانی (۱۳۲ھ - ۱۸۹ھ) اور (۴) حسن بن زیاد لولوی (وفات ۲۰۴ھ) یہ شاگرد صرف مقلد ہی نہیں تھے

بلکہ بعض اوقات اپنے اجتہاد سے بھی فتویٰ دیتے۔ اور اپنے استاد کے خلاف چل جاتے تھے۔ ابو یوسف اپنی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" میں پہلے استاد کی رائے درج کرتے ہیں اور پھر اپنا فیصلہ دے کر استاد سے وجہ اختلاف بتاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور تصنیف "در خلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ" میں کسی مسئلے کے متعلق پہلے امام ابو حنیفہ کی رائے درج کرتے ہیں اور پھر اپنا فیصلہ دیتے ہیں۔ یہ فیصلہ کبھی امام ابو حنیفہ کی تائید میں ہوتا ہے اور کبھی خلاف۔ جب ابو یوسف اور محمدؒ اہل حجاز کی حدیثوں سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے اپنے استاد کے بیشتر فیصلوں کو مسترد کر دیا:۔

ان شاگردوں کے آگے بھی کئی شاگرد تھے۔ مثلاً ابراہیم بن رستم مروزی وفات (۲۱۱ھ) بشر بن غیاث المریسی (وفات ۲۲۸ھ) بشر بن ولید کندی وفات (۲۳۸ھ) عیسیٰ بن ابان بن صدقہ (وفات ۲۲۱ھ) وغیرہ۔ یہ لوگ بھی بعض معاملات میں اپنے اساتذہ کے خلاف چلتے تھے۔ بشر بن غیاث المریسی تو امام شافعی سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ اور یہی وہ فقیہہ ہے جس نے کہا تھا کہ گدھا حلال ہے۔

۲۔ امام مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر مدنی (۹۳ھ۔ ۱۷۹ھ) بڑے پایہ کے محدث اور فقیہہ تھے۔ لیکن امام شافعی نے اپنی تصنیف کتاب الام میں نیز ابو یوسف نے اپنی تحریرات میں امام مالک کی سخت تردید کی ہے۔ اور بعض مسائل تو ایسے ہیں کہ ساری خدائی ایک طرف، امام مالک دوسری طرف۔ مثلاً امام مالک کے نزدیک چوری کے ملزم کو چوری کا اقرار کرانے کے لیے بدنی سزا دینا جائز ہے لیکن باقی تمام فقیہہ اس کے مخالف ہیں۔ اسی طرح امام مالک کے ہاں ایک

مفقود الخبر شوہر کی بیوی چار سال کے بعد نیا نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن باقی ائمہ اِس کی اجازت نہیں دیتے۔

امام مالک کے بیسیوں شاگرد تھے مثلاً ابو عبداللہ۔ عبدالرحمٰن بن القاسم العتقی (وفات ۱۹۱ھ) اشہب بن عبدالعزیز، القیسی العامری الجعدی (۱۴۰ھ۔ ۲۰۴ھ) ابو محمد عبداللہ بن وہب بن مُسلم قرشی (۱۲۵ھ۔ ۱۹۷ھ) وغیرہ۔ یہ سب لوگ بھی بعض مسائل کے متعلق نہ صرف آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔ بلکہ بعض معاملات میں استاد کی رائے کو بھی مسترد کر دیتے تھے۔

۳۔ ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس الشافعی (۱۵۰ھ۔ ۲۰۴ھ) بلند درجے کے محدث، فقیہہ اور مجتہد تھے۔ لیکن اجتہادی مسائل میں دوسرے فقہا سے اختلاف کا یہ عالم تھا۔ کہ جب ماموں الرشید نے آپ کو بغداد میں طلب کیا تو وہاں امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمدؒ سے آپ کے کئی مناظرے ہوئے حنفاؤ شوافع کا اختلاف اظہر من الشمس ہے۔ خود امام شافعی کے تلامذہ میں بعض ایسے لوگ پائے جاتے تھے۔ جو استاد سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک ابو ثور ابراہیم بن خالد بن الیمان الکلبی البغدادی (وفات ۲۴۰ھ) تھا۔ جو وصیت کو قرض پر مقدم سمجھتا تھا۔ اور امام شافعی مؤخر۔ اگر خریدے ہوئے مال میں عیب نکل آئے تو امام شافعی کا فیصلہ یہ ہے کہ اُسے فوراً واپس کر دو۔ لیکن ابراہیم یہ کہتے ہیں۔ کہ بائع کی رضامندی ضروری ہے۔ اسی طرح اگر جنگل میں دو مسافر سمت قبلہ کے متعلق مختلف الرائے ہو جائیں تو ابراہیم کہتے ہیں کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ان کے استاد کی رائے یہ ہے

کہ ہر مسافر اُس سمت کو رخ کر کے نماز پڑھے۔ جسے وہ قبلہ سمجھتا ہے۔

امام احمد بن حنبل اور ابو علی الحسین بن علی الکرابیسی بھی امام شافعی کے شاگرد تھے۔ لیکن ان دونوں میں مسئلہ خلقِ قرآن پر شدید اختلاف رہتا تھا۔ ابنِ حنبل قرآن کے الفاظ و معانی کو غیر مخلوق سمجھتے تھے۔ اور الکرابیسی یہ فرمایا کرتے تھے کہ قرأتِ قرآن مخلوق ہے۔ اور ابنِ حنبل اس چیز کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

امام شافعی کے ایک اور شاگرد احمد بن یحییٰ بن عبدالعزیز البغدادی المتکلّم کی رائے یہ تھی کہ طلاق بالصفات (مثلاً یہ کہنا کہ جب اگلا مہینہ آئے تو میری بیوی مجھ پر حرام ہو جائے) جائز نہیں اور کسی شرط سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ لیکن ابن سبکی اور ابن حزم کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

۴:۔ امام احمد بن حنبل بن ہلال (۱۶۴ھ۔ ۲۴۱ھ) کا شمار فقہا سے زیادہ محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ کی مُسند میں چالیس ہزار سے زیادہ حدیثیں ہیں۔ جب معتزلیوں کے نظریوں سے متاثر ہو کر مامون الرشید نے علمائے اسلام کو خلقِ قرآن کا عقیدہ قبول کرنے کی دعوت دی تو آپ کے بڑے بڑے شاگرد بھی آپ کو چھوڑ گئے۔ اور سلطنت کے تقریباً تمام علماء آپ کے مخالف ہو گئے۔

اجتہادی مسائل میں ہمارے فقہا و محدثین میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے ایک ہی مقدمہ میں علمائے عراق کا فیصلہ کچھ ہوتا تھا اور علمائے مصر و شام کا کچھ اور۔ اور یہ اختلاف آج ہماری عدالتوں میں بھی ملتا ہے۔ ہند و پاکستان

میں ابھی تک تعزیرات ہند ابھی تک رائج ہے۔ کتاب قوانین ایک ہی ہے لیکن مختلف عدالتوں سے ایک ہی معاملہ کے متعلق مختلف فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ آج سے بیس برس پیشتر دو ہندوؤں نے پیغمبر اسلام کے متعلق توہین آمیز تحریرات شائع کیں۔ ایک پنجابی تھا۔ یعنی راجپال۔ اور دوسرا "ورتمان" کا ایڈیٹر غالباً یوپی سے تعلق رکھتا تھا۔ یوپی کی عدالت نے "ورتمان" کو سزا دی۔ اور پنجاب ہائیکورٹ نے راجپال کو بری کر دیا۔ جرم ایک تھا، قانون ایک تھا۔ دونوں عدالتیں انگریزی کی تھیں۔ لیکن ایک جج کا فیصلہ دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک ہی قانون کا مفہوم ایک جج نے کچھ اور سمجھا اور دوسرے نے کچھ اور۔ ہم کسی جج پر بدنیتی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ اس لیے کہ ایک ہی قانون کی مختلف تشریحیں ہو سکتی ہیں۔ یا استنباطِ مسائل و استخراج نتائج میں اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ اختلاف کبھی بھی قابلِ مذمت نہیں سمجھا گیا۔

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی قرآن کے صریح احکام کے خلاف کبھی نہیں جا سکتی۔ لیکن جہاں قرآن خاموش ہے وہاں ہمارے دستور سازوں کو آزادی ہے کہ چاہیں تو کسی مجتہد کی پیروی کریں اور یا اپنے مسائل کا حل اپنی ضروریات کے مطابق خود تلاش کریں۔

ہمارے علما سلطنتِ عباسیہ کے زوال تک اجتہاد سے کام لیتے رہے۔ یہ تقلید کا مرض اس وقت شروع ہوا۔ جب مختلف خطوں کے امراء نے صرف ان علماء کے وظائف باندھنے شروع کیے۔ جو کسی بڑے مجتہد کی تقلید میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اب کسی عالم کو کیا پڑی تھی۔ کہ وہ اجتہاد کی "مصیبت"

میں پھنس کر اپنی تنخواہ گنوائے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب قرآن کی جگہ طلبہ نے کسی
خاص امام کی فقہ کو پڑھنا شروع کیا۔ آزادیٔ رائے ختم ہوگئی۔ اور جب کوئی
فقیہہ کتاب لکھنے بیٹھتا تھا تو اپنے امام کے بعض فتاوے ہی کو اپنے الفاظ میں
دہرا دیتا۔ امام کی رائے سے انحراف یا آزادانہ سوچنا اس کے ہاں بہت بڑا جرم تھا
یہ تقلید ہمارے علمائ کے رگ و ریشہ میں یوں سرایت کر گئی۔ کہ متاخرین نے فقہ ہی کو سب
کچھ سمجھ لیا۔ قرآن متروک ہوگیا۔ مکاتب میں فقہ کا درس دیا جانے لگا۔ اور ان مجتہدین
کو اتنا بڑا درجہ دیدیا گیا کہ رسول اکرم صلعم کی طرح ان کی ذات اور تعلیم پہ بھی ایمان لانا ضروری
قرار دیا گیا۔ دورِ تقلید کے ایک بہت بڑے پیشوا، امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخی نے تو
یہاں تک کہہ دیا کہ جو آیت یا حدیث ہمارے امام کے اجتہاد سے متصادم ہوتی ہو اس
کی یا تو کوئی تاویل کر دو اور یا اُسے منسوخ سمجھو۔ ہمارے موجودہ علماء اُسی دورِ تقلید
کی یادگار ہیں۔ اور اس لیے یہ حضرات کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص امام
ابوحنیفہ وغیرہ کے بعد اجتہاد کے دروازے کسی اور کے لیے بھی کھلے رکھے۔ اور نہ
ہی وہ اجماع کے مفہوم میں وسعت پیدا ہونے دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اجماع ستونِ
فقہ ہے اور اجماع سے مراد گذشتہ علمار کا اجماع تھا۔ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ
اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سالہ تاریخ میں سے صرف دس ایسے علمائ کا نام لیجئے کہ
جو کسی ایک اجتہادی مسئلے پر بھی متفق ہوئے ہوں تو غالباً نہیں بتا سکیں گے۔ ان حالات
میں کیا اجماع کا صحیح مفہوم یہ نہیں، کہ قوم کے بہترین دماغ مل کر بیٹھ جائیں۔ اور تمام
اجتہادی مسائل کو اپنی قابلیت اور قوتِ فیصلہ سے طے کریں؟ قرآن حکیم میں
کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں کہ امام ابوحنیفہ کے بعد سوچنا بند کر دو۔ اور ان

کے فیصلوں کے مطابق کورانہ چلے چلو۔

عہد حاضر کا وہ انسان جو ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ جو ایک لمحے میں اپنی آواز چاند کی دنیا تک پہنچا رہا ہے۔ جس نے سورج کی شعاعوں کو مسخر اور کائنات کی تمام طاقتوں کو مغلوب کر رکھا ہے۔ کیا آپ اتنا نا اہل اور جاہل سمجھتے ہیں۔ کہ وہ امام شافعی اور ابو حنیفہ کی قیادت کے بغیر زندگی کے معمولی معاملات کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتا۔

**نفاذِ شریعت کا مقصد** ہمارے پاس قرآن شریف موجود ہے جس میں ہماری فلاح و نجات کا مکمل دستور العمل درج ہے۔ لیکن ہمارے تعلیم یافتہ حضرات قرآن سے یوں بھاگتے ہیں۔ جیسے کوا تیر سے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے بعض احکام تعزیراتِ پاکستان میں درج کر دیئے گئے تو اس سے فرق کیا پڑے گا۔ کیا لوگ زیادہ نیک محض اس لیے بن جائیں گے کہ قرآن جزوِ تعزیرات بنا دیا گیا ہے؟ فرض کیجئے تعزیرات میں درج ہو جاتا ہے کہ نماز چھوڑنے والا ایک ماہ قید کی سزا پائیگا۔ کیا حکومت اتنی پولیس مقرر کر سکے گی۔ کہ وہ ہر گاؤں میں ہر دیہاتی کی نگرانی کر سکے؟ میرا مقصد یہ ہے کہ جب تک لوگ اپنی بہتری کی خود کوشش نہ کریں، حکومت کی آئین سازی مفید نہیں سکتی۔ آخر حکومت اللہ سے تو بڑی نہیں۔ جب اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے اور ہم اُس کی پرواہ نہیں کرتے، تو حکومت کے قوانین کی کیوں پرواہ کرنے لگے۔ رشوت کا انسداد، قیام صلوٰۃ و زکوٰۃ، اوامر کی تبلیغ اور نواہی کا استیصال حکومت کا فرض ہے اور یہی مقصدِ شریعت ہے۔

اگر ہر وزیر حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھے۔ وزارتی بلندیوں سے اتر کر انسانی سطح پہ آجائے۔ ہر مظلوم کی شکایت ایک انگریز کے کان سے نہیں بلکہ ایک سچے مسلمان کے کان سے سُنے۔ ہر ضلع میں عام دربار لگا کر ہر مظلوم کو آزادی سے فریاد کرنے کا موقع دے۔ بے انصاف حُکام اور قصوروار دفتریوں کو فوری سزا دے۔ بھیس بدل کر پولیس کی نگرانی کرے۔ ہر بھوکے کو روٹی یا روزگار دے۔ گداگری بند کر کے گداگروں کو جیلوں میں دستکاریاں سکھائے۔ انصاف، علم، احسان، صلوٰۃ و زکوٰۃ جیسے محاسن کو عام کرے تو سمجھو کہ شریعت کا مقصد پورا ہو گیا۔

ہم کیا تھے ——— اِس مضمون کو دیکھئے

ہم کیا ہیں ——— اپنے آپ کو دیکھئے

——— اور

پھر سوچئے کہ ہمیں کیا ہونا چاہیے ---------؟

# ہم

# اور

# ہمارے اسلاف

# حکایاتِ اسلاف

## جہاد

۱۔ جنگِ اُحد (شوال ۳ھ) میں جب مشہور ہو گیا کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ تو بددلی میں حضرت عمرؓ تلوار پھینک کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں ایک صحابی ابن نضرؓ ان کے پاس سے گزرے اور اس شکستہ ہمتی کی وجہ پوچھی۔ تو حضرت عمرؓ فرمانے لگے۔ کہ حضورؐ کی شہادت کے بعد اب کیا لڑنا ہے۔ ابن نضرؓ فرمانے لگے۔ اگر واقعی رسولؐ شہید ہو گئے ہیں۔ تو ان کے بعد زندہ رہ کر ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہ کہہ کر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ کفار کے ہجوم میں داخل ہو گئے اور اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہید ہو گئے۔

---

(۲) حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ کو اپنی بیوی عاتکہ سے اس قدر محبت تھی کہ وہ ایک دفعہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہؓ کو حکم دیا کہ تمہاری بیوی تم کو اللہ سے دور لے جا رہی ہے اس لیے اسے طلاق دیدو

تعمیل حکم کے بغیر چارہ ہی کیا تھا۔ طلاق کے بعد عبداللہ نے عاتکہ کے فراق میں نہایت درد انگیز اشعار لکھے۔

[اسد الغابہ بہ تذکرہ عاتکہ]

---

(۳) ایک مرتبہ رسول اللہ نے جہاد کے لیے منادی کرائی۔ جب قافلہ روانہ ہونے لگا۔ تو ایک نہایت ضعیف صحابی بھی شامل ہو گئے۔ اور اپنی خدمت کے لیے تین دینار پر ایک نوکر بھی ساتھ لے گئے۔

[ابوداؤد کتاب الجہاد]

---

۴۔ ایک بدو اسلام لانے کے بعد صحابہ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ ایک لڑائی میں کچھ مالِ غنیمت ملا۔ تو حضور نے بدو کو بھی حصہ دینا چاہا۔ بدو نے کہا میں مالِ غنیمت کے لیے اسلام نہیں لایا۔ بلکہ اس لیے کہ حلق میں تیر کھا کر شہادت کا مقام بلند حاصل کروں۔ اللہ کی شان ایک جنگ میں وہ ٹھیک حلق پر تیر کھا کر شہید ہو گیا۔ اور حضور نے اپنا جبہ کفن کے لیے عنایت فرمایا۔

[نسائی کتاب الجنائز]

---

۵۔ جنگِ بدر (رمضان ۲ھ) میں جب دشمنوں کی فوجیں قریب آگئیں تو حضور نے آواز دی کہ اٹھو اور وہ جنت حاصل کرو۔ جس کی وسعت ارض و سما کے برابر ہے۔ اس اعلان کے وقت عمیر بن الحمام انصاری کھجوریں کھا رہے

۲۱- ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے تمام گورنروں کے سامان کا جائزہ لیا - اور سب کا مال سرکاری خزانے میں داخل کر کے صرف جوتوں کا ایک ایک جوڑہ رہنے دیا -

(فتوح البلدان صـ۳۹۲)

---

۲۲- فتح خیبر کے بعد رسول کریمؐ اور اہلِ خیبر میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رُو سے زرعی پیداوار نصف نصف کر لی گئی تھی جب کھیتیاں تیار ہو گئیں تو حضورؐ نے عبد اللہ بن رواحہ کو تقسیم پیداوار کے لیے بھیجا - آپ نے پیداوار کے دو حصے کیے اور اہلِ خیبر کو اختیار دیا کہ وہ جو حصہ چاہیں لے لیں - ان لوگوں نے عورتوں کے زیور جمع کر کے آپ کو رشوت دینا چاہی - آپ نے فرمایا - مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اسلام کے دشمن ہو - لیکن یہ یقین مجھے بے انصافی کی ترغیب نہیں دے سکتا - تم نے رشوت پیش کر کے مجھے اشتعال دلایا ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ اس اشتعال کے باوجود میں انصاف کو نہیں چھوڑوں گا یہ سن کر یہودیانِ خیبر نے کہا - خدا کی قسم زمین و آسمان اِسی عدل و انصاف کے بل پر قائم ہیں -

(موطائے امام مالک کتاب المساقات)

---

۲۳- غیر مسلم شور مچاتے ہیں کہ اسلام ان پر جزیہ لگاتا ہے - حالانکہ اسلام جو کچھ مسلمانوں سے وصول کرتا ہے - مثلاً عشر - زکوٰۃ ، صدقہ وغیرہ وغیرہ

راس جزیہ سے بہت زیادہ ہے۔

جزیہ کی مقدار خلفائے راشدین کے زمانے میں یہ تھی۔

۱۔ سرمایہ دار۔ ۴ درہم ماہوار (درہم ۳۰ ۔ کے برابر ہوتا ہے)

۲۔ متوسط جماعت ۲ درہم ماہوار۔

۳۔ نسبتاً غریب ایک درہم ماہوار۔

حضرت ابوبکرؓ نے نادار، معذور اور بیکار غیر مسلموں کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ چونکہ غیر مسلموں کی حفاظت مسلمانوں کے فرائض میں شامل تھی۔ اور ان کے لیے فوج میں بھرتی ہونا ضروری نہیں تھا۔ اس لیے یہ معمولی سا ٹیکس ان سے وصول کیا جاتا تھا اور وہ لوگ اس ٹیکس کے عوض تمام رعایات سے مستفید ہوتے تھے

---

۲۳۔ جب بعض حالات کی بنا پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو حمص چھوڑنا پڑا، تو آپ نے شہر کے تمام یہود و نصاریٰ کو بلا کر فرمایا کہ ہم نے تم سے جزیہ تمھاری حفاظت کی خاطر لیا تھا۔ چونکہ اب ہم جا رہے ہیں اور تمھاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ اپنا جزیہ واپس لے لو۔ اس پر یہود اور نصاریٰ نے قسم کھا کر کہا کہ اگر ہمیں اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا، تو ہم تمھیں ہی انتخاب کریں گے۔

---

۲۴۔ حضرت عمرؓ نے وفات سے پہلے غیر مسلموں کے متعلق فرمایا تھا۔ میں اپنے جانشین کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ غیر مسلموں سے کیے ہوئے معاہدے نباہے۔ ان کی حفاظت کے لیے جان تک لڑا دے اور انھیں تکلیف نہ دے۔

حضرت خالد نے جس قدر معاہدے غیر مسلموں سے کئے تھے۔ اُن میں یہ تحفّظات لازماً موجود ہوتے تھے۔

۱۔ کہ ان کی عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔

۲۔ انھیں اختیار ہو گا کہ وہ جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں۔ صرف اوقاتِ نماز کا خیال رکھیں۔

۳۔ وہ جب چاہیں مذہبی جلوس نکالیں۔

۴۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے الگ نہیں کیا جائیگا۔

(کتاب الخراج)

---

۲۵:۔ ایک مرتبہ غیر مسلموں کا ایک وفد حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا کہ کیا میرے حکام آپ کو تنگ تو نہیں کرتے، انھوں نے جواب دیا۔

| | |
|---|---|
| ما رأینا منھم الا دفاءً وملکۃً | ہم نے ان میں وفاداری اور بہترین سلوک کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا |

(طبری ص۲۵۶۰)

---

۲۶۔ خلفا نے کئی غیر مسلموں کو ملکی عہدے دے رکھے تھے۔ حضرت عمرؓ

نے ابو زید نامی ایک عیسائی کو گورنر مقرر کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی کو اپنا میر منشی بنایا تھا۔ امیر معاویہؓ کے دربار میں سب سے زیادہ با اقتدار شخص ابن آثال نصرانی تھا جس کو انھوں نے حمص کا کلکٹر مقرر کیا تھا۔ خلفائے عباسیہ کے درباروں میں تو عیسائیوں کو بہت زیادہ نفوذ حاصل تھا۔

(یعقوبی ج ۲ ص ۲۶۵)

---

۲۷۔ جب شام کے ایک شہر عربسوس کے عیسائیوں نے معاہدے کو توڑ کر رومیوں سے ساز باز شروع کر دی اور ان کو جلا وطن کرنا ضروری سمجھا گیا، تو حضرت عمرؓ نے وہاں کے حاکم عمیر بن سعد کو ہدایت کی کہ جلاوطنی سے پہلے عیسائیوں کو ان کی تمام جائیداد اور سامان کی دگنی قیمت ادا کر دو اور ایک سال کی مہلت دو۔

(فتوح البلدان ص ۶۳)

---

# ہمارے اسلاف کی دیانتداری

۱۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیمار ہو گئے اور دوا کے لیے شہد کی ضرورت پڑی۔ اتفاقاً بیت المال سے تھوڑا سا شہد مل گیا۔ استعمال سے پہلے عوام کو جمع کیا اور منبر پر چڑھ کر فرمانے لگے۔ کہ یہ شہد مسلمانوں کا

کا ہے۔ اگر آپ سب مجھے اجازت دیں۔ تو میں لے لوں۔ ورنہ مجھ پر حرام ہے
(نزہتہ الابرار تذکرہ عمرؓ)

---

۲۔ ایک بار حضرت عمرؓ حج کو گئے اور آمد و رفت پر ۸۰ درہم (تقریباً ۱۷ روپے)
خرچ ہو گئے۔ اس پر انہیں اتنا افسوس ہوا کہ ہاتھ ملتے اور فرماتے ہ۔

| | |
|---|---|
| مَا خُلِقْنَا اَنْ نُسْرِفَ فِیْ مَالِ اللّٰهِ :- | ہم اس لیے نہیں پیدا کیے گئے کہ اللہ کے مال کو یوں بیدردی سے اڑاتے پھریں۔ |

اسد الغابہ ج ۴ صہ ۷۲

---

۳۔ ایک دفعہ شاہِ روم کا قاصد آیا۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے عطر کی
ایک شیشی ہدیتہً ملکہء روم کو بھیجدی۔ اس نے جواباً وہی شیشی موتیوں سے
بھر کر واپس کی۔ حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو آپ نے موتی بیچ کر اُن کی قیمت بیت المال
میں داخل کر دی اور عطر کی اصل قیمت اپنی بیگم کے حوالے کی

---

۴ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے تجارت کی غرض سے اونٹ خریدے اور
انھیں فربہ کرنے کے بعد منڈی میں فروخت کرنے کے لیے گئے۔ اور سے
حضرت عمرؓ آ گئے۔ اونٹوں کو دیکھ فرمانے لگے کہ لوگوں نے تمھیں امیر المومنین
کا بیٹا سمجھ کر اپنی چراگاہوں میں اونٹ چرانے کی اجازت دی۔ اس

بیلے یہ لو اونٹوں کی اصل قیمت اور اونٹ بیت المال میں داخل کرو۔

---

۵ - ایک مرتبہ کسی رئیس نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے لیے ہدیۃً دو چادریں بھیجیں۔ حضرت علیؓ خطبہ دے رہے تھے کہ بیٹوں پر نظر پڑ گئی۔ فوراً چادریں چھین کر بیت المال میں داخل کرا دیں۔

(نزہۃ الابرار تذکرہ حضرت علیؓ)

---

۶ - ایک دفعہ اصفہان سے کچھ مال آیا جس میں کچھ گھی اور شہد بھی تھا گھی اور شہد حضرت علیؓ کی دختر ام کلثوم نے لے لیا حضرت علیؓ کو علم ہوا تو آپ نے قیمت وصول کر کے خزانے میں جمع کر دی۔

(نزہۃ الابرار تذکرہ حضرت علیؓ)

---

۷ - سیدۂ عالم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیسنے سے چھالے پڑ گئے تھے۔ مشک میں پانی بھر بھر کر کندھوں اور سینے پر تسموں کے نشان بھی، جھاڑو دینے کی وجہ سے کپڑے میلے ہو جاتے اور چولہا پھونکنے سے بالوں میں راکھ پڑ جاتی۔ ایک مرتبہ جب آپ نے والدِ محترم حضرت سرورِ دو عالم سے خدمت کے لیے ایک نوکر مانگا۔ تو حضور غصے میں فرمانے لگے۔ بیت المال فقراء و یتامیٰ کا حق ہے۔ اور تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔

---

۸- ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ کو سونے کا ایک ہار دیا رسول اکرم صلعم نے دیکھ لیا تو فرمایا۔ کیوں فاطمہ! تم لوگوں سے یہ کہلانا چاہتی ہو کہ رسول کی بیٹی نے آگ کا ہار پہن رکھا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے فوراً ہار اتار پھینکا۔

---

۹- ایک مرتبہ سرور کائنات ایک لڑائی سے واپس آئے تو حضرت فاطمہؓ نے خوشی میں دروازے پر رنگین پردے لٹکا دیئے اور حضرت حسن اور حضرت حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنا دیئے۔ آپ جونہی گھر میں داخل ہوئے ابروئے نبوت پر شکن پڑ گئے اور فرمایا۔

"اے اللہ! میں نہیں چاہتا کہ میرے اہل بیت دنیوی آلائشوں سے آلودہ ہوں"۔ حضرت فاطمہؓ نے پردے فوراً چاک کر دیئے اور کنگن اتار ڈالے۔

(ابوداؤد ونسائی۔)

---

۱۰- ذلقعد ۱۴ھ۔ ۶۳۶ء میں منحل کے مقام پر جو شرق اردن کے شہر طبریہ سے ۱۲/۱۱ میل دور ہے۔ رومی اور اسلامی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئیں۔ جنگ سے پہلے عیسائیوں کی درخواست پر حضرت ابو عبیدہ نے معاذ بن جبل کو شرائط صلح پر بحث کرنے کے لئے بھیجا۔ جب وہ رومیوں کے آراستہ و پیراستہ دربار میں پہنچے تو قالینوں کو الٹ کر زمین پر بیٹھ گئے۔

اور فرمانے لگے کہ جو فرش غریبوں کا حق چھین کر تیار کیا گیا ہو، میں اُس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

---

۱۱۔ ایک دفعہ غنیمت کا مال آیا تو حضرت عمرؓ کی دختر اور سرورِ کائنات کی زوجہ مطہرہ حضرت حفصہ بھی کچھ لینے کے لیے آئیں۔ حضرت عمرؓ کی نگاہ اُن پر پڑی تو طیش میں آکر بولے۔ "حفصہ تم کیوں آئیں؟ تم اپنے باپ کے مال سے تو حصہ لے سکتی ہو۔ یہ مالِ غنیمت ہے تمھارے باپ کا نہیں۔ حضرت حفصہؓ خفیف سی ہو کر چلی گئیں۔

(مسند امام حنبل)

---

# ہمارے بزرگوں کی سادگی انکسار اور قناعیت

۱۔ ایک سفر میں جب صحابہ کرام کھانے کا انتظام کرنے لگے تو سرورِ دو عالم نے فرمایا۔ کہ میں جنگل سے ایندھن اکٹھا کروں گا۔ تمام صحابہ نے بیک زبان التماس کی کہ آپ آرام فرمائیں ہم سب کام کریں گے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا! اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا۔ جو ساتھیوں سے بڑا بنتا ہو۔

زرقانی ص ۳۰۶

---

(۲) ایک دفعہ حضورؐ کی تشریف آوری پر صحابہ تعظیم کے لیے اٹھے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو کہ یہ اہلِ عجم کے آداب ہیں۔

(ابنِ ماجہ)

---

(۳) ایک مرتبہ ایک شخص کاشانہ نبوت میں آیا اور ہیبتِ رسولؐ سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ ڈرو مت کہ میں ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی:۔

---

(۴) ایک دفعہ ایک صحابی نے حضورؐ کو میرے آقا کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا۔ "میں عبداللہ کا بیٹا ہوں، اور اللہ کا قاصد۔ بس اس سے زیادہ مجھے ہرگز نہ سمجھو":۔

(صحیح مسلم)

---

(۵) جب بنی عامر کے نمائندے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ایک نے کہا "آپ ہم سے افضل ہیں" حضورؐ نے فرمایا "بات کہنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔ کہ تمھاری زبان شیطان کے قابو میں تو نہیں":۔

(ابو داؤد)

---

(۶) جب محرم ۷ھ (۶۲۹ء) میں خیبر کا مشہور شہر سر ہوا تو صحابہ

کے اصرار پر حضورؐ شہر میں بحیثیت ایک فاتح کے داخل ہوئے۔ لیکن ہیئت یہ تھی کہ گدھے پر سوار تھے اور لگام کی جگہ گدھے کے گلے میں کھجور کے پتے ڈال رکھے تھے۔

(مشکواۃ)

---

(۷) ایک دن حضرت عمرؓ نے خطبہ میں فرمایا۔ "ایک دن وہ تھا کہ سوکھی کھجوروں کے عوض اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

خطبہ کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے پوچھا۔ کہ خطبہ میں آپ نے اپنی تنقیص کیوں کی؟ فرمایا۔ آج تنہائی میں میرا نفس مجھے کہنے لگا کہ تم امیر المومنین اور نائب رسول ہو۔ تم سے بڑا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ سر محفل نفس کو اپنی حقیقت سے آگاہ کروں۔

(نزہتہ الابرار تذکرہ عمرؓ)

---

(۸) ایک دن حضرت عمرؓ کو زید بن ثابت سے کوئی کام پڑ گیا۔ اُن کے گھر آئے، تو حضرت زید نے کہا "آپ مجھے بلا بھیجتے، تکلیف کیوں فرمائی" کہا۔ "ضرورت تو مجھے تھی تمہیں کیوں بلاتا۔"

(ادب المفرد باب من کان لہ حاجۃ)

---

(۹) حضرت عثمانؓ اس قدر سادہ زندگی بسر کرتے کہ مسجد میں سر کے نیچے چادر رکھ کر لیٹ جاتے اور جب اُٹھتے تھے تو جسم پر کنکریوں کے نشان نظر آتے

تھے۔ اور لوگ کہا کرتے تھے، یہ ہیں ہمارے امیر المومنین۔

(۱۰) حضرت علیؓ مٹی پر لیٹنے کی وجہ سے بوتراب (مٹی کا باپ) کہلاتے تھے۔ وہ اپنا سودا سلف خود بازار سے خریدتے۔ عہد خلافت میں ایک دن بازار سے کھجوریں خرید کر آرہے تھے کہ ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین! لائیے میں پہنچادوں فرمانے لگے۔ بچوں کی خدمت کا حق باپ ہی کو پہنچتا ہے۔

(ادب المفرد۔ باب الکبر)

(۱۱) حضرت علیؓ نے زندگی میں کوئی گھر نہ بنایا۔ اور لب پر ہمیشہ یہی دعا رہتی تھی اے اللہ! مجھے دنیا پر فریفتہ نہ کرنا۔ بدن پر ہمیشہ گاڑھے کی پھٹی پرانی قمیص اور ویسا ہی تہ بند اور ایک موٹی چادر اوڑھی ہوتی تھی۔ اسی ہیئت میں وہ درہ لیے گلیوں اور بازاروں میں گشت فرماتے اور لوگوں کا محاسبہ کیا کرتے ایک مرتبہ تہ بند پھٹ گیا۔ تو آپ نے مسجد نبوی میں آکر اپنی تلوار نیلام کر کے تہ بند خریدا۔

(اسد الغابہ تذکرہ حضرت علیؓ)

(۱۲) حضرت ابوبکرؓ عہد خلافت میں باہر نکلتے تو چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں دوڑ کر پاس آتیں اور دامن تھام کر کہتیں۔ اے ہمارے بزرگوار باپ ہمیں دعا دیجئے۔ آپ محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ بسا اوقات بچیاں انھیں

کھینچ کر گھر لے جائیں اور کہتیں کہ ہماری بکریوں کا دودھ دوہ دیجیے۔ چنانچہ وہ ان معصوم فرمائشوں کو پورا فرماتے۔

(الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ ج ۲ ص۳)

---

(۱۳) مدینہ کے ایک گوشہ میں ایک بیکس بڑھیا رہتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ عہد خلافت میں رات کو چھپ کر اُس کے گھر جاتے صحن میں جھاڑو دیتے۔ گھڑوں میں پانی ڈالتے اور دیگر ضروریات پوری کر واپس آجاتے۔

(اسد الغابۃ تذکرہ حضرت ابوبکرؓ)

---

(۱۴) ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہا:۔ جعلنی اللہ فداک (مجھے اللہ آپ پر قربان کرے) آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا۔ اذا یھینک (اگر یہ ارادے ہیں تو خدا تمہیں ذلیل و خوار کریگا)

---

(۱۵) جب حضرت اُم سلمہ بنت ابی امیہ سرورِ دو عالم کے عقد میں آئیں۔ تو حضورؐ نے ان کو ایک چکی، ایک گھڑا اور ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ عنایت فرمایا اور یہی سامان باقی ازواج کو بھی عطا ہوا تھا۔

(مسند امام حنبل ج ۶ ص ۲۹۵)

---

(۱۶) جب سیدۃ النسا حضرت فاطمہؓ کی شادی ہوئی تو رسول اکرم صلعم نے ایک بان کی چارپائی - ایک چھاگل، دو مٹی کے گھڑے، ایک مشک، دو چکیاں اور چمڑے کا تکیہ جہیز میں دیا۔

---

(۱۷) ایک دن حضرت علیؓ گھر تشریف لائے، تو دیکھا کہ بھوک کی وجہ سے حضرت حسینؓ اور امام حسنؓ رو رہے ہیں۔ آپ سے برداشت نہ ہو سکا اور باہر چلے گئے، اتفاقاً زمین پر پڑی ہوئی ایک اشرفی مل گئی، اس کا آٹا اور گوشت خریدا لیکن محبتِ رسول کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ کو مدعو کئے بغیر کھانا نہ کھایا۔

(ابوداؤد کتاب اللقطہ)

---

(۱۸) حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ تمام عمر سرورِ کائنات کے کپڑوں کا صرف ایک ہی جوڑا رہا۔

(ترمذی)

---

(۱۹) حضورؐ کے گھر دو دو مہینے آگ نہ جلتی تھی اور گزارہ پانی اور کھجور پر ہوتا تمام عمر چپاتی نہیں کھائی اور نہ ہی ساری زندگی میں کوئی ایسا دن آیا کہ آپ کو دونوں وقت سیر ہو کر کھانا نصیب ہوا ہو۔

(بخاری ابنِ ماجہ ترمذی)

---

(۲۰) ایک دن سخت بھوک کی حالت میں رسول کریم صلعم ابوایوب انصاری کے ہاں گئے۔ حضرت انصاری نے فوراً ایک بکری ذبح کی جب تیار ہو گئی تو فرمایا کہ اس میں سے کچھ میری بیٹی کو بھی بھیج دو کہ وہ کئی روز سے بھوکی ہیں۔

(ترغیب و ترہیب ج ۲)

---

(۲۱) اسی طرح ایک دن حضرت علیؑ کو معلوم ہوا کہ سید کونین کئی روز سے بھوکے ہیں آپ ایک یہودی کے باغ میں گئے اور کہا کہ مجھ سے کوئی کام لیکر کھجوریں دو۔ یہودی نے کہا کہ کنوئیں سے ڈول نکال کر باغ کو پانی دو۔ ہر ڈول کے عوض ایک کھجور دونگا۔ چنانچہ آپ نے ڈول نکالے اور کھجوریں لاکر حضور کی خدمت میں پیش کیں۔

(سنن ابن ماجہ)

---

(۲۲) رسول اللہ چاشت کے وقت عبادت سے فارغ ہو کر گھر جاتے اور گھریلو کاموں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اپنے کپڑوں کو پیوند لگاتے تھے جوتے مرمت کرتے، دودھ دوہتے، آٹا گوندھتے اور صحن میں جھاڑو دیتے

(بخاری و ترمذی)

---

(۲۳) رسول اکرم کا ہمیشہ یہ شعار رہا کہ جب کوئی شخص راستے میں ملتا سلام میں پہل فرماتے۔

(۲۴) ایک مرتبہ خباب بن ارت کسی ضرورت کے لیے سفر پر گئے، چونکہ ان کے گھر میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ اس لیے رسول اکرمؐ خود جا کر ان کی بکریوں کا دودھ دوہتے۔ (بیہقی)

---

(۲۵) ایک دن حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ بدّو آکر کہنے لگا "محمدؐ! تم سے ایک ضروری کام ہے۔ ابھی آؤ" چنانچہ آپ نماز چھوڑ کر چلے گئے اور نماز واپس آکر مکمل کی۔ (ابوداؤد ترمذی)

---

(۲۶) حضورؐ ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے۔

اے اللہ! مجھے زندگی میں مسکین رکھ، مسکینی میں موت دے، اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر کر۔ اس لیے کہ مسکین چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (مشکوٰۃ)

---

# خدمت خلق

(۱) حضرت عمرؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ جن عورتوں کے شوہر سفر میں ہوتے۔ ان کے گھر جاتے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کہتے اور پھر پوچھتے تمہارا کیا حال ہے۔ کس چیز کی ضرورت ہے؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ پیسے دو کہ میں تمہیں سودا سلف بازار سے لا دوں۔ جن کے گھر دلی

میں غلام ہوتے وہ غلاموں کو ہمراہ بھیج دیتے اور جن کے پاس غلام نہ ہوتے اُن کا سودا خود خرید لاتے۔ شوہروں کے خطوط آتے تو خود گھروں پہ جاتے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر سُناتے اور عموماً جواب بھی خود ہی لکھتے۔ جب باہر سے قافلے آتے تو اُن کا حال پوچھنے جاتے۔ اگر کوئی بیمار یا لُولا لنگڑا مسافر نظر آتا تو اس کے لیے سواری کا انتظام کرتے۔ قافلہ روانہ ہوتا تو کوس بھر پیچھے پیچھے جاتے، قافلے کی کوئی چیز گر پڑتی تو دوڑ کر پہنچاتے۔

حضرت علی کا دستور تھا کہ وہ جنگلوں میں جا کر بھولے بھٹکے مسافروں کو راستے پر ڈالتے بازاروں میں قلیوں کو بوجھ اٹھواتے اور اگر کسی کے جُوتے کا تسمہ بھی گر جاتا تو اٹھا کر اُس کے حوالے کرتے۔

( الریاض النضرہ فی مناقب العشرہ ج ۲ ص ۔)

---

(۲) جب حضرت عمرؓ کو جنگ قادسیہ کی فتح و ظفر کی بشارت ملی تو آپ نے مجمع عام میں ایک پُر اثر تقریر کی جس کا آخری فقرہ یہ تھا:۔

میرے بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں۔ کہ تم کو غلام بنانا چاہوں۔ بلکہ میں تو اللہ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ چونکہ خلافت کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ اِس لیے میری نجات اِسی میں ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں اور آپ چین سے گھروں میں سوئیں۔ اگر خدانخواستہ مجھ میں یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ میں آرام کروں اور آپ لوگ میرے گھر کے سامنے دربانی کے فرائض انجام دیں تو سمجھ لیجئے کہ میرے ادبار و ہلاکت کے دن شروع ہو گئے۔ میں آپ لوگوں

کو ہدایت کی طرف بلاتا ہوں زبان سے نہیں بلکہ عمل سے۔

---

(۴۰) حضرت عمرؓ رات کو عموماً گلیوں میں پہرہ دیتے تھے۔ ایک رات آپ گشت کرتے ہوئے ایک خیمے کے پاس پہنچے۔ خیمے سے کراہنے کی آواز آئی۔ آپ نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟ ایک بدو باہر آیا اور کہنے لگا۔ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور مدد کرنیوالا کوئی نہیں۔ حضرت عمرؓ واپس آئے اور اپنی زوجہ حضرت اُم کلثوم کو ہمراہ لیا اور خیمے میں پہنچا دیا۔ خود خیمے سے باہر زمین پر بیٹھ کر بدو سے باتیں کرتے رہے۔ جب بچہ پیدا ہوا، تو ملکہ نے آواز دی۔

"امیر المومنین! اپنے دوست کو بچے کی مبارک باد دیجیے" امیر المومنین کا لفظ سن کر بدو چونکا اور مؤدب ہو کر معافی مانگنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا! بحیثیت خادم میرا یہ فرض تھا۔ کل تم میرے پاس آنا میں اس بچے کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔

(کنز العمال ج ۲ ص ۳۲۳)

---

(۴۱) ایک مرتبہ حضرت عمرؓ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ ایک شخص پر نظر پڑی جو بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ پوچھا دائیں ہاتھ میں کیا تکلیف ہے؟ کہنے لگا.... جنگ موتہ ۸ھ میں کٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ پر رقت طاری ہو گئی اشک آلود آنکھوں سے پوچھنے لگے۔ کہ تمہیں وضو کون کراتا ہو گا؟ سر کون دھلاتا ہو گا اور کپڑے کون پہناتا ہو گا؟ اس کے بعد آپ نے سرکاری خرچ پر ایک نوکر اس کے حوالے

کیا اور تمام چیزیں بھی ساتھ دیں :-

---

(۵) حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں زمینوں کے بندوبست کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں عثمان بن حنیف اور حذیفہ بن الیمان کو حکم دیا کہ وہ عراق کی زمینوں کی پیمائش کر کے لگان مقرر کریں چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے مندرجہ ذیل رپورٹ مرتب کی۔

"عراق لمبائی میں ۲۷۵، اور چوڑائی میں ۲۴۰، میل۔ ہے اور قابل زراعت زمین تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ہے۔ لاوارثوں اور مفروروں کی زمینیں ضبط کر لی گئی ہیں۔ اور باقی ماندہ پر حسب ذیل لگان عائد کیا گیا ہے۔

| | جنس | فی جریب یعنی پون بیگھہ پر لگان۔ |
|---|---|---|
| (۱) | گندم | دو درہم سالانہ (درہم ۴/۰ کا ہوتا ہے) |
| (۲) | جو | ایک " " |
| (۳) | گنا | چھ " " |
| (۴) | روئی | پانچ " " |
| (۵) | انگور | دس " " |
| (۶) | کھجوروں کے باغ | دس " " |
| (۷) | تل | آٹھ " " |
| (۸) | ترکاری | تین " " |

اس رپورٹ کو پڑھ کر حضرت عمرؓ کا چہرہ چمک اٹھا اور فرمانے لگے۔ خدا

کی قسم اگر میں چند سے اور زندہ رہا تو اپنے بعد بھی عراق کی بیواؤں اور بیکسوں کو کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہونے دوں گا۔

(بخاری کتب المناقب)

حضرت عمرؓ کا یہ جملہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ اسلامی حکومت کا نصب العین کیا تھا۔

---

# صدقہ ــــ ایثار ــــ فیاضی

(۱) حضرت ابو مسعود انصاری فرماتے ہیں کہ آیت صدقہ نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام بازاروں میں جا کر مزدوری کرتے اور جو کچھ کماتے صدقہ کر دیتے۔

(بخاری کتاب الزکوٰۃ)

---

(۲) حضرت اسماءؓ نے ایک لونڈی فروخت کی۔ شوہر نے آکر رقم مانگی تو بولیں میں تو اسے صدقہ میں دے چکی ہوں۔

(مُسلم)

---

(۳) قریش کی مشہور یادگار دارالندوۃ حضرت حکیم بن حزام کے قبضے میں تھی۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد حکومت میں اسے ایک لاکھ درہم پہ خریدا

اور حضرت حکیم نے یہ رقم غربا میں بانٹ دی۔

(اسد الغابہ)

---

(۴) حضرت سلمان فارسی مدائن کے گورنر تھے۔ اُن کی تنخواہ پانچہزار درہم تھی جب تنخواہ ملتی تو صدقہ کر دیتے اور خود مزدوری کر کے اپنا گذارہ چلاتے۔

(استیعاب)

---

(۵) جب یہ آیت نازل ہوئی :-

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (اللہ کو کون قرضِ حسنہ دینا چاہتا ہے) تو حضرت ابو الدحداح اپنے باغ میں گئے اور بیوی کو جو وہیں رہتی تھی آواز دی "اُمّ دحداح! باغ سے باہر نکلو۔ کہ میں نے یہ باغ خدا کو بطور قرضِ حسنہ دیدیا ہے۔

(استیعاب)

---

(۶) سرورِ کائنات کا وقتِ رحلت قریب آیا تو نہایت کمزور آواز میں حضرت عائشہ سے فرمایا۔ میرے سرہانے کے نیچے چند اشرفیاں پڑی ہوئی ہیں۔ انھیں فوراً غریبوں میں بانٹ ڈالو، ورنہ اللہ محمدؐ سے بدگمان ہو کر ملے گا۔

(سیرتِ نبوی۔ شبلی)

---

(۷) عہدِ رسالت میں حضرت مالک بن ثعلبہ ایک دولتمند صحابی تھے۔ ایک دن رسول اللہ صلعم یہ آیت پڑھ رہے تھے۔

| | |
| --- | --- |
| وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ۔ الخ | جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اُن کے ماتھے اور پہلوؤں کو انہی سے داغا جائیگا۔ |

کہ حضرت مالک پاس سے گزرے۔ یہ آیت سُن کر فرمانے لگے کہ انشاءاللہ آج شام تک مالک کے پاس ایک درہم بھی باقی نہ رہیگا۔ چنانچہ سب کچھ خیرات کر دیا

(اسد الغابہ)

---

(۸) ہجرت کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف مہاجر کو سعد بن ربیع کے ہاں مدینہ میں ٹھہرایا گیا تھا۔ آپ نے نہ صرف آدھی جائداد ابن عوف کو دیدی۔ بلکہ ایک بیوی بھی اُن کے حوالے کرنا چاہی۔ لیکن آپ نے اسے منظور نہ فرمایا۔

(کتاب المناقب)

---

(۹) حضرت سعید بن عاص کا یہ دستور تھا کہ اگر ان سے کوئی سائل کچھ مانگتا اور پاس کچھ نہ ہوتا۔ تو ایک معین رقم کا پرونوٹ لکھ دیتے۔ اور جب رقم ہاتھ آتی تو پہلے اس سائل کا قرض ادا کرتے۔

(اسد الغابہ)

---

(۱۰) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ آپ کے پاس کہیں سے ۲۰ ہزار درہم آ گئے آپ نے تقسیم کر دیئے اور جو حاجتمند ذرا دیر سے پہنچے انھیں اس طرح راضی کیا کہ پہلے حاجتمندوں سے کچھ رقم بطور قرض لے لی۔ ابن عمرؓ عموماً روزہ رکھا کرتے تھے اور جب کوئی مہمان آ جاتا تو روزہ توڑ دیتے تاکہ مہمان یہ نہ سمجھے کہ میزبانی سے کتراتے ہیں۔

(طبقات ابن سعد)

---

(۱۱) ایک مرتبہ ابن عمر بیمار ہو گئے اور انگوروں کی ضرورت محسوس ہوئی بڑی مشکل سے پانچ انگور دستیاب ہوئے۔ جب اُن کے سامنے لائے گئے تو اوپر سے ایک سائل آ گیا۔ آپ نے یہ انگور اس کو دیدیئے۔ دوستوں نے ہر چند کہا کہ آپ بیمار ہیں یہ فیاضی نہ کیجئے۔ لیکن آپ نہ مانے آخر احباب نے وہی انگور اُس سائل سے خرید کر دوبارہ آپ کو دیئے۔

(طبقات ابن سعد تذکرہ عبداللہ بن عمرؓ)

---

(۱۲) حضرت اسماء نے ایک جائداد حضرت عائشہؓ سے وراثتاً پائی تھی جسے امیر معاویہ نے ایک لاکھ درہم پہ خرید لیا۔ حضرت اسماء نے یہ رقم دو نادار صحابہ کو بخش دی۔

---

# ہمسایہ نوازی

ہمسایہ نوازی عربوں کا بہت بڑا وصف تھا۔ دورِ جہالت میں ایک شخص کو اس کی بیوی نے طعنہ دیا کہ تمہارا کنبہ بہت مختصر سا ہے۔ اس کے جواب میں شاعر نے کہا۔

تعیرنا انا قلیل وجارنا
عزیز وجار الاکثرین ذلیل

(مجھے میری بیوی طعنہ دیتی ہے کہ ہمارا کنبہ چھوٹا سا ہے۔ کیا وہ دیکھتی نہیں کہ ہم اپنے ہمسایوں سے اتنا اعلیٰ سلوک کرتے ہیں گویا وہ ہمارے کنبہ میں شامل ہیں حالانکہ بہت سے لوگ اپنے ہمسایوں کو بہت ذلیل رکھتے ہیں)

اسلام نے عربوں کے اس جوہر کو اور چمکا دیا۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا۔ جب گھر میں کوئی اچھی چیز آتی تو پڑوسی کو بھی شامل کر لیتے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک بکری ذبح کرائی اور گھر والے یہودی کو گوشت بھیجنا بھول گئے۔ اس پر حضرت عبداللہ سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے :-

" ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے جبریل نے ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے متعلق اس قدر تاکید کی کہ مجھے شک پڑ گیا کہ غالباً ہمسایوں کو شریکِ وراثت بنا دیا جائیگا " (ابوداؤد باب فی حق الجوار)

(۲) ایک بار حضرت عمرؓ نے حضرت جابرؓ کے پاس تھوڑا سا گوشت دیکھا تو فرمانے لگے: "تمہارا ہمسایہ بھوکا ہے اور تم کھانے کا انتظام کر رہے ہو۔ کیا تم اپنے ہمسایہ کی خاطر بھوکے بھی نہیں رہ سکتے۔" (موطائے امام مالک کتاب الجامع)

# غلاموں سے سلوک

صحابہ کرام اپنی اولاد اور غلاموں سے ایک جیسا سلوک کرتے تھے حضرت عبداللہ بن عمر جو زیور اپنی بیٹیوں کو دیتے تھے وہی لونڈیوں کو بھی پہناتے تھے ایک مرتبہ کچھ لوگ آپ سے ملنے کو آئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام کے گلے میں بھی سونے کا ہار ہے۔ وہ لوگ متعجب ہوئے تو آپ نے مزاحاً فرمایا! "تمہاری نگاہ برائیوں پر ہی پڑتی ہے۔" (ادب المفرد)

(۲) ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری نے اپنے غلام کو ڈانٹا تو رسول اللہؐ نے فرمایا "ابوذر! تم میں جاہلیت کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ یہ لوگ تمہارے بھائی ہیں۔ انھیں وہی کھلاؤ اور پہناؤ جو خود کھاتے اور استعمال کرتے ہو۔"

(بخاری کتاب الایمان)

(۳) حضرت عثمانؓ سحر کے وقت عبادت کے لیے جاگتے تو خود ہی وضو

کے لیے پانی تلاش کرتے ایک دن کسی نے کہا۔ آپ اندھیرے میں اتنی تکلیف کرتے ہیں غلام کو کیوں نہیں کہہ دیتے کہ وہ انتظام کر دیا کرے۔ فرمانے لگے اللہ نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔

( طبقاتِ ابنِ سعد ذکر عثمانؓ )

---

# رسولؐ اور اسلام سے محبّت

(۱) آنحضرت صلعم کا قاعدہ تھا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے سفر میں بھی روزہ افطار کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری رمضان میں سفر کو نکلے ابھی شہر کے در و دیوار اوجھل بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ نے روزہ کھول دیا۔ بعض ہمراہیوں نے اعتراض کیا تو فرمانے لگے تم لوگ رسول کریم کے اسوۂ حسنہ سے مُنہ موڑ رہے ہو۔

ابو داؤد

---

(۲) ایک بار حضرت دحیہ بن خلیفہ دمشق کے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے فاصلہ صرف تین میل کا تھا۔ آپ نے روزہ توڑ دیا لیکن ساتھیوں نے روزہ بھاری رکھا آپ فرمانے لگے۔ اے اللہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟ اُمّتِ رسولؐ اسوۂ رسول سے انحراف کر رہی ہے۔ خداوندا مجھے اب دنیا سے اٹھا لے۔

( ابو داؤد )

---

(۳) ایک مرتبہ حضرت سعید بن یسار عبداللہ بن عمر کے ہمراہ سفر میں تھے ایک موقعہ پر پیچھے رہ گئے ابن عمر نے وجہ پوچھی، تو کہنے لگے میں وتر پڑھ رہا تھا۔ فرمایا کیا تمہیں سرورِ دو عالم کا اسوہ پسند نہیں۔ وہ سفر میں اونٹ ہی پر وتر پڑھا کرتے تھے۔

(ابن ماجہ)

---

(۴) ایک مرتبہ ایک صحابی حضورؐ کی خدمت میں آیا۔ دیکھا کہ آپ کی قمیص کا تکمہ کھلا ہے۔ اس صحابی نے حُبِّ رسول کی بنا پر عمر بھر اپنا تکمہ کھلا رکھا

(ابوداؤد)

---

(۵) مدینہ میں حویصہ اور محیصہ دو بھائی تھے۔ حویصہ چھوٹا تھا اور محیصہ بڑا ایک مرتبہ رسول کریم نے یہودیوں کی عہد شکنی، اسلام دشمنی اور مسلسل ایذا رسانی سے تنگ آ کر اُن کے قتل کا حکم دیدیا۔ اس وقت حویصہ اسلام لاچکا تھا اور محیصہ بدستور کافر تھا۔ حویصہ نے اپنے بڑے بھائی کے ایک گہرے دوست کو جو یہودی تھا قتل کر دیا۔ اس پر محیصہ سخت ناراض ہوا اور حویصہ کو پیٹنا شروع کر دیا حویصہ نے اپنے بھائی کے غصّے اور مار پیٹ کا صرف ایک جواب دیا کہ جس ہستی نے مجھے یہودیوں کے قتل کا حکم دیا ہے اگر تمہارے قتل کا بھی اشارہ کر دے تو میں تمہیں بھی موت کی گھاٹ اُتار دوں۔ محیصہ حیرت سے پوچھنے لگا کیا واقعی تم بڑے بھائی کی جان لینے سے دریغ نہیں کرو گے؟ حویصہ نے کہا خدا کی قسم میں یقیناً تمہیں مار ڈالوں گا۔ محیصہ کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا جس مذہب نے تم میں اتنا

بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا"۔ اور فوراً مسلمان ہو گیا۔

(اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۳۷)

---

(۶) جب ابو طلحہ انصاری نے حضرت اُمّ سلیم کو نکاح کا پیغام بھیجا تو اُمّ سلیم نے جواب دیا کہ میں مسلمان ہوں اور تم کافر۔ اس لیے یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تم اسلام قبول کر لو تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

چنانچہ ابو طلحہ مسلمان ہو گئے۔ جب مہر معین کرنے کا وقت آیا تو اُمّ سلیم نے فرمایا ابو طلحہ کا اسلام ہی میرا مہر ہے۔ حضرت ثابت کہا کرتے تھے کہ کوئی عورت اُمّ سلیم سے بہتر مہر مقرر نہ کرا سکی۔

---

(۷) سمیہ بنت خیاط، یاسر عبسی کی زوجہ تھیں۔ بڑھاپے میں اسلام لائیں۔ اسلام لانے والوں میں آپ کا نمبر ساتواں تھا۔ قریش نے بے شمار مظالم کیے لیکن آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ یہاں تک کہ ایک دن ابو جہل نے برچھی سے آپ کو ہلاک کر ڈالا۔ آپ اسلامی تاریخ میں پہلی شہیدہ تھیں۔

(استیعاب ج ۲ ص ۷۶۰)

---

(۸) آغازِ اسلام میں اِن حضرات پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ لیکن یہ لوگ جادۂ حقانیت سے منحرف نہ ہوئے۔

(۱) حضرت عمر کی بہن اسلام لائیں تو حضرت عمر نے انھیں مار مار کر لہو لہان کر دیا۔

(۲) جب ابوذر غفاری اسلام لائے تو کفار نے انھیں کعبہ میں لٹا کر سخت سزا دی۔

(۳) یہی حال بلالؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا ہوا تھا۔

(۴) حضرت عثمانؓ کو اُن کے چچا نے کئی روز رسیوں سے باندھے رکھا۔

(۵) زبیر بن عوام کو اُن کا چچا چھت سے لٹکا کر ناک میں دھواں دیا کرتا تھا۔

(۶) جب حضرت ابوبکرؓ نے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے انھیں اتنا پیٹا کہ وہ مُردہ سمجھ لیے گئے اور لوگ انھیں کپڑوں میں لپیٹ کر گھر پھینک آئے لیکن کچھ دیر بعد ہوش میں آگئے اور پہلا سوال یہ پوچھا کہ رسول اللہ کا کیا حال ہے۔

(۷) سعید بن اسلام، عیاش بن ابی ربیعہ، حضرت سلمہ بن ہشام اور کئی دوسرے صحابہ کو بے اندازہ اذیتیں دی گئیں۔ مثلاً پیٹ پر لوہا باندھ کر گرم ریت پر پھینک دیا۔ گلیوں میں گھسیٹا۔ دیواروں سے پٹخا۔ لاٹھیوں اور گھونسوں سے مارا۔ لیکن انھوں نے اللہ اور رسول کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑا۔

---

(۹) حضور پر نور کبھی کبھی حضرت اُمّ سلیم کے گھر تشریف لے جاتے اور دوپہر کو وہیں آرام فرماتے۔ جب آپ بستر سے اٹھتے تو اُم سلیم آپ کے ٹوٹے ہوئے بالوں اور پسینے کے قطروں کو بوتلوں میں جمع کر لیتیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے ان کی مشک سے پانی منہ لگا کر پیا تو آپ نے مشک کا مُنہ کاٹ کر

اپنے پاس رکھ لیا۔ مسند، جلد ۱، ص ۳۷۶

# مساوات

(۱) حضرت ابو عبیدہ شامی فوج کے سپہ سالار تھے، ایک مرتبہ چند شامی رؤسا نے پُر تکلف کھانے ابو عبیدہ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے پوچھا کہ کیا میری فوج کو بھی یہی کھانا بھیجا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ فرمایا۔ تو سب واپس لے جاؤ ابو عبیدہ اپنے آپ کو اُن لوگوں سے افضل نہیں سمجھ سکتا جو اسلام کے لیے خون بہا رہے ہوں میں وہی کھاؤں گا جو میری فوج کو ملتا ہے

(طبری ص ۲۱۶۱)

(۲) ایک موقعہ پر رومیوں نے ایک جاسوس بھیجا کہ وہ عربی فوج کے حالات معلوم کرے۔ اُس نے پلٹ کر خبر دی کہ یہ لوگ رات کو زاہد و عابد اور دن کو شہسوار بن جاتے ہیں۔ اگر ان کا بادشاہ بھی کوئی چیز چُرا لے تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالتے ہیں۔ اگر وہ جرم زنا کا ارتکاب کرے تو اُسے سنگسار کر ڈالتے ہیں۔ رُومی سپہ سالار نے یہ سُن کر کہا "اس قوم کے خلاف لڑنے سے خودکشی ہزار درجے بہتر ہے۔"

طبری ص ۲۱۲۶

(۳) جنگ منحل (۱۴ھ) میں رومیوں کی درخواست پر حضرت معاذ بن جبل کو شرائط صلح طے کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

**رومی:** آپ قالینوں کو الٹ کر زمین پر بیٹھ گئے؟

**معاذ:** میں اس فرش پر نہیں بیٹھنا چاہتا جو غریبوں کا حق چھین کر تیار کیا گیا ہو۔

ر: ہم تمھاری عزت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ تمھیں اپنی عزت کا خیال نہیں۔

م: جسے تم عزت سمجھتے ہو، میرے ہاں وہ ذلت ہے۔

ر: لیکن زمین پر غلام بیٹھا کرتے ہیں

م: مجھ سے بڑا خدا کا غلام کون ہو سکتا ہے؟

ر: کیا مسلمانوں میں تم سے بڑا کوئی اور آدمی بھی موجود ہے

م: یہ فخر کیا کم ہے کہ میں سب سے چھوٹا ہوں۔

ر: تم ہمارے لیے کیا پیغام لائے ہو۔

م: پیغام یہ ہے کہ اسلام لاؤ، شراب چھوڑ دو، سؤر کا گوشت ترک کر دو۔ تمام بدکاریوں سے بچو۔ اس صورت میں ہم تم بھائی بن جائیں گے۔ اگر یہ نامنظور ہو تو جزیہ ادا کرو۔ ورنہ کل میدان میں تلوار ہمارا تمھارا فیصلہ کرے گی۔

ر: کیا تمھیں علم نہیں کہ ہماری فوج آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہے پھر تم کس برتے پر ہمارے منہ آ رہے ہو

م: فتح و شکست کا انحصار کثرت و قلت پر نہیں بلکہ سچائی پہ ہے

ر:۔ ہمارا شہنشاہ اتنا طاقتور ہے کہ کروڑوں انسانوں کی زندگی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے بادشاہ سے لڑنا کوئی دانائی نہیں۔

م:۔ تمھارے بادشاہ کو تمھارے جان و مال پہ اختیار ہوگا۔ لیکن جسے ہم نے اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں بھی ہم سے بڑا نہیں۔ اگر وہ زنا کریگا تو اُس کو دُرّے لگائے جائیں گے اور اگر وہ چوری کرے تو اُس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ وہ حاجتمندوں سے گھبرا کر پردوں میں چھپ کر نہیں بیٹھتا اور اس کا کام ہماری خدمت ہے۔

ر:۔ ہم بلقا کا ضلع اور اردن کا حصہ جو تمھاری قلمرو سے ملا ہوا ہے دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تم جنگ کے ارادے سے باز آجاؤ۔

م۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ ہمارا مقصد ملک گیری نہیں بلکہ گناہ کے خلاف لڑنا ہے معاذ واپس آگئے اور پیچھے پیچھے رومیوں کا ایک قاصد بھی آن پہنچا۔ اس نے ہر طرف دیکھا کہ شاید کوئی سجا سجایا خیمہ نظر آئے جس کے باہر پہرہ لگا ہوا ہو اور اندر سپہ سالار بیٹھا ہوا ہو۔ لیکن اُسے مایوسی ہوئی یہاں سب ہر لحاظ سے برابر تھے۔ اُس نے گھبرا کر کسی سے پوچھا کہ سپہ سالار کہاں ہے۔ چنانچہ وہ ابو عبیدہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہا کہ اگر آپ واپس جانے پر رضامند ہو جائیں تو ہم فی سپاہی دو دو اشرفیاں دینے کو تیار ہیں۔ جواب میں حضرت ابو عبیدہ نے فوج کی کمر بندی کا حکم دیا اور چند روز بعد سارا میدان رومیوں کے لہو سے رنگین ہو گیا۔ (فتوح الشام۔ ازدی)

(۴) جنگِ یرموک (۱۵ھ) میں حضرت خالد سفیر بن کر رومیوں کے ہاں گئے جب وہاں پہنچے تو رومی سپہ سالار ہامان نے اپنی تقریر میں پہلے حضرت عیسیٰ کا نام لیا اور پھر قیصر کا، اور فخراً کہا ہمارا قیصر شاہوں کا بادشاہ ہے حضرت خالد نے بات کاٹ کر فرمایا "تمہارا بادشاہ ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ہمارے سردار کو ایک لمحہ کے لیے بھی بادشاہی کا خیال آجائے تو ہم فوراً اُسے معزول کر دیں۔"

---

# ایفائے عہد

(۱) اُمیہ بن خلف مکہ کا ایک کافر تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اُسے کہہ بیٹھے کہ اگر تم کسی وقت مدینہ میں آئے تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ جب کفارِ مکہ جنگ بدر میں مدینہ کی طرف بڑھے تو اُمیہ بھی اُن میں شامل ہوگیا دوسری طرف اسلامی فوج میں عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے۔ ایک طرف ایفائے عہد دوسری طرف اپنے فرض کا تقاضا۔ چنانچہ جب چند اسلامی سپاہی اُمیہ کی طرف بڑھے تو عبدالرحمٰن آڑے آگئے۔ جس طرف سے تلوار آتی آپ سامنے آجاتے۔ اس اثنا میں اُمیہ زمین پر گر گیا۔ عبدالرحمٰن اس پر لیٹ گئے اور اُس کے جسم کو ہر طرف سے ڈھانپ لیا۔ لیکن ایک منچلے مسلمان نے ایک طرف سے تلوار داخل کر کے اُمیہ کا کام تمام کر ڈالا۔

---

(۲) جب اسلامی افواج رومیوں کے خلاف صف آرا تھیں تو ایک

رومی قیدی نظر بچا کر نکل گیا اور ہرقل قیصر روم کے پاس جا پہنچا قیصر نے اُس سے مسلمانوں کے حالات دریافت کئے تو اُس نے کہا۔

"وہ لوگ رات کو زاہد اور دن کو شہ سوار ہوتے ہیں۔ کسی قوم سے معاہدہ کرتے ہیں تو اُن سے ہر چیز بہ قیمت لیکر کھاتے ہیں اور جس شہر میں داخل ہوتے ہیں کسی کو قطعاً کوئی تکلیف نہیں دیتے۔"

یہ سُن کر ہرقل کہنے لگا۔

"اگر یہ سچ ہے تو یہ لوگ بہت جلد اس زمین کے مالک بن جائیں گے جو آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ (طبری صـ ۲۳۹۵)

---

(۳) ایک مرتبہ حضرت منکدر بن عبداللہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اثنائے گفتگو میں حضرت عائشہ نے فرمایا کہ مجھے تم سے اسقدر ہمدردی ہے کہ اگر میرے پاس دس ہزار درہم بھی ہوتے تو تمھیں دیدیتی۔ خدا کی شان اُسی دن امیر معاویہ نے دس ہزار درہم حضرت عائشہ کو بھیجے اور آپ نے فوراً وہ رقم منکدر کے ہاں بھیج دی۔ (طبقات ابن سعد تذکرہ منکدر بن عبداللہ)

---

# عفو و درگذر

(۱) جنگ حُنین میں جب صحابہ کے پاؤں اُکھڑ گئے اور کفار کی بے پناہ تیراندازی

نے قیامت کا سماں باندھ دیا، تو رحمۃ اللعالمین نے ہجوم مصائب میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ لوگ یہ سمجھے کہ آپ کفار کیلئے کسی فوری عذاب کی دعا مانگیں گے۔ لیکن اس رحمت مجسم کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ

[اے خدائے تبارک و تعالیٰ میری قوم کو سیدھے راستے پر ڈال کہ یہ غریب جہالت کی وجہ سے بھٹک رہے ہیں] (طبری)

---

(۲)، عہد خلافت میں حضرت علیؓ کا ایک مقام سے گذر ہوا دور سے ایک خارجی نے دیکھ لیا اور لگا منہ سے اناپ شناپ بکنے۔ ساتھیوں نے کہا "حضور یہ گستاخ بدزبانی سے کام لے رہا ہے" مدینۃ العلم نے جواب دیا علی نام کے کئی اور آدمی بھی موجود ہیں کسی اور کو کوس رہا ہوگا" بعد میں اس واقعہ کو آپ نے یوں نظم فرمایا۔

وَلَقَدْ مَرَرْتُ عَلَی اللَّئِیْمِ یَسُبُّنِیْ

فَمَرَرْتُ ثُمَّ قُلْتُ لَا یَعْنِیْنِیْ

(میں ایک بدبخت کے پاس سے گذرا جو مجھے گالیاں دے رہا تھا میں یہ کہہ کر وہاں سے گذر گیا کہ کسی اور کو کوس رہا ہوگا۔)۔

---

(۳)، کعب بن زہیر عرب کا ایک مشہور شاعر تھا۔ جو دیہات میں پھر کر اپنی آتش بیانی سے قبائل کو بھڑکاتا۔ اور اسلام کے لیے پریشانیوں کے اسباب

مہیا کرتا تھا۔ اِس کی ان فتنہ سامانیوں سے تنگ آکر حضورؐ نے اس کی موت کے حکم صادر فرما دیئے۔ احکام کا نکلنا تھا۔ کہ ہر چہار طرف اسکی تلاش شروع ہو گئی جب وہ خطروں میں محصور ہو گیا تو ایک شام بھیس بدل کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاں پہنچا اور دوسرے روز بزم رسولؐ میں حاضر ہوا۔ اتفاقاً اسوقت حضورؐ فرما رہے تھے جو شخص اسلام لے آئے وہ ہمارا بھائی بن جاتا ہے۔ کعب نے اٹھ کر کہا یہ خواہ وہ کعب بن زہیر ہی کیوں نہ ہو؟ فرمایا "بیشک" کعب نے منہ سے چادر اٹھالی۔ حضرت عمرؓ بپھرے ہوئے شیر کی طرح تلوار سونت کر آگے بڑھے، لیکن اُس عفوِ مجسم نے روک لیا۔ اس پر کعب نے ۵۲ اشعار کا وہ قصیدہ فی البدیہہ کہا۔ جو قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور جسے بعض لوگ صبح کی تلاوت کے بعد بطور تبرک پڑھا کرتے ہیں۔ اس قصیدے کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

نبئت ان رسول اللہ اوعدنی
والعفو عند رسول اللہ مامول

(مجھے بتایا گیا تھا کہ رسولِ خدا نے مجھے دھمکی دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ حضورؐ معاف فرما دیں گے۔)

لقد اتیت رسول اللہ معتذرا
والعذر عند رسول اللہ مقبول

(میں رسول کریم کی خدمت میں معذرت کے لیے حاضر ہوا ہوں اور آپ گنہگار کا عذر سن ہی لیا کرتے ہیں)

جب کعب اس شعر پر پہنچا:

ان الرسول لسیف یستضاء بہ
مھند من سیوف الہند مسلول

(رسولِ خدا ہندوستان کی وہ فولادی تلوار ہیں جن سے تجلیاں حاصل کی جاتی ہیں -)

تو حضورؐ نے اپنی چادر مبارک بطور انعام کعب کی طرف پھینک دی اور ساتھ ہی فرمایا کہ دوسرے مصرعہ میں "ہند کی جگہ اللہ کر دو کہ میں ہندوستانی نہیں بلکہ خدائی تلوار ہوں -

مذکور ہے کہ امیر معاویہ نے اپنے عہدِ امارت میں یہ چادر ۲۰ ہزار درہم میں خرید لی تھی -

---

# عیاشی و لہو لعب سے احتراز

(۱) جب رومیوں کو دمشق و حمص میں ہیم شکستیں ہوئیں تو قیصر نے چند فوجی سرداروں کو پایۂ تخت (انطاکیہ) میں طلب کر کے پوچھا کہ "عرب تم سے طاقت تعداد اور سامانِ جنگ میں کم تھے - پھر وہ جیت کیسے گئے؟ اس پر ایک بوڑھے سردار نے کہا -

"اصلی طاقت - اخلاق کی طاقت ہے - جو عربوں کے پاس موجود ہے اور ہمارے پاس نہیں ، عرب رات کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزے رکھتے ہیں - وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے - اور ان میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں اور زنا کرتے ہیں۔ وعدوں کی پابندی نہیں کرتے۔ اور خلق خدا پہ ظلم توڑتے ہیں۔"

---

(۲) حضرت عمرؓ نے نعمان بن عدی کو میسان کا حاکم مقرر کیا تھا نعمان عیش و عشرت میں پڑ گئے ایک مرتبہ اپنی بیوی کو خط لکھا جس میں یہ شعر بھی تھا۔

لعل امیر المومنین تسوءہ

تنادمنا بالجوسق المتهدم

(امیر المومنین کو یہ خبر یقیناً ناگوار گذرے گی کہ ہم لوگ محلوں میں عیش اڑا رہے ہیں)

یہ خط امیر المومنین کے ہاتھ آگیا۔ آپ نے فوراً نعمان کی معزولی کے احکام صادر فرمائے اور ساتھ ہی لکھا۔ واقعی یہ خبر ہمیں نہایت ناگوار گذری ہے۔

(اسد الغابہ۔ ذکر نعمان بن عدی)

---

(۳) حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

"میں مُردار کی بدبو برداشت کر لوں گا۔ لیکن غیر عورت کی خوشبو کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ (طبقات ابن سعد ذکر موسیٰ اشعری)

---

(۴) مسجد نبوی میں ایک جوان صحابیہ بھی شریک نماز ہوا کرتی تھیں تمام صحابہ اگلی صفوں میں کھڑے ہوتے تھے تاکہ اس کے کسی حصہ جسم پر نظر نہ پڑ جائے

(سنن ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ)

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ ڈھول اور باجے کی آواز سُن کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے اور فرماتے کہ رسولِ خدا بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (ابن ماجہ۔ باب الغناء)

---

(۶) کسی گھر میں کوئی تقریب تھی۔ اور حضرت عائشہؓ بھی مدعو تھیں وہاں ایک شخص نے گردن ہلا ہلا کے گانا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا یہ شیطان ہے اِسے باہر نکالو۔ (ادب المفرد۔ باب اللہو)

---

(۷) حضرت عائشہؓ کے گھر میں کچھ لوگ رہتے تھے۔ جب اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ نرد کھیلتے ہیں۔ تو آپ نے انھیں کہلا بھیجا کہ اگر تم نے آئندہ یہ حرکت کی تو اس گھر میں نہیں رہ سکو گے۔

عبداللہ بن عمر کسی کو نرد کھیلتے دیکھتے تو اُسے مارتے اور نرد توڑ ڈالتے

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے دو آدمیوں کو شطرنج کھیلتے دیکھا۔ تو یہ آیت پڑھی

| | |
|---|---|
| مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔ | یہ تصویریں کیا ہیں جن کے سامنے تم نے سر جھکایا ہوا ہے |

نوٹ:۔ یہ آیت دراصل بتوں کے متعلق ہے۔ لیکن الفاظ کچھ ایسے ہیں کہ شطرنج باز بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ (طبقات ابن سعد۔ ذکر میسرہ بن حبیب)

---

(۸) ایک مرتبہ دو شخصوں نے مرغوں کی بازی لگائی حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے غصے میں آکر مرغوں کو مار ڈالنا چاہا۔ لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ آخر

ان پرندوں کا کیا قصور ہے۔ (ادب المفرد۔ باب قمار الدیک)

(۹) ایک مرتبہ حضرت نصار بن عبیدہ کو معلوم ہوا کہ کچھ لوگ نرد کھیل رہے ہیں۔ برہم ہو کر اُٹھے اور فرمایا جو لوگ نرد کی کمائی کھاتے ہیں۔ وہ سُؤر کا گوشت کھاتے ہیں اور خون سے وضو کرتے ہیں۔ (ادب المفرد باب اللہو)

# صبر و ثبات

(۱) اموی خلیفہ عبد الملک کا زمانہ تھا۔ اہل مکہ نے عبد اللہ بن زبیر کو اپنا امیر مقرر کر کے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ عبد الملک نے حجاج بن یوسف (عراق کا مشہور ظالم گورنر) کو عبد اللہ بن زبیر کے خلاف فوج دے کر بھیجا۔ جب عبد اللہ گرفتار ہونے کے بعد پھانسی پہ لٹکا دیئے گئے تو حجاج نے ایک آدمی بھیجا کہ جاؤ اور عبد اللہ کی والدہ حضرت اسماء کو بلا لاؤ۔ اسماء نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس نے دوبارہ آدمی بھیجے کہ بالوں سے گھسیٹ کر لاؤ۔ لیکن اتنی گستاخی نہ کر سکے۔ اس پر حجاج خود آیا اور کہنے لگا۔ دیکھا تم نے کہ میں نے اللہ کے دشمن یعنی تمہارے بیٹے سے کیا سلوک کیا ہے۔ اسماء نے کہا۔ اور یہ بھی دیکھا میرے بیٹے نے تمہاری کیا درگت بنائی ہے۔ حجاج نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ اسماء نے فرمایا۔ تم نے اس کی دنیا خراب کی اور

اس نے تمھاری آخرت تباہ کر دی۔ میں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا تھا کہ ثقیف میں ایک سیاہ کار ظالم و کذاب پیدا ہوگا اور وہ یقیناً تو ہے۔ حجاج اٹھ کر چل دیا بعد میں حضرت اسماء بھی باہر گئیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی لاش صلیب کے ساتھ لٹک رہی ہے۔ آپ نے یہ منظر دیکھا تو نہ آنسو بہائے اور نہ آہ و فغاں کی۔ بلکہ حجاج کو مخاطب کر کے نہایت بے اعتنائی سے فرمانے لگیں "کیا اس سوار کے اترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟

(استیعاب ذکر عبداللہ بن زبیر)

# راست گوئی

(۱) جب سرورِ کائنات مکہ سے نکلے تو کفار مکہ نے حضور کی گرفتاری یا قتل کے لیے بھاری انعام مقرر کیا۔ اور لوگ ہر طرف آپ کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایک دن ایک مسلح کافر سامنے آگیا۔ وہ حضرت ابو بکرؓ کو جانتا تھا اور رسولِ کریم سے ناواقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ کسی حالت میں بھی جھوٹ نہیں بولتے چنانچہ اس نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا۔ من ھٰذا (یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟) حضرت ابو بکرؓ بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ جھوٹ کہیں تو آن جاتی ہے۔ اور سچ بولیں تو جان۔ اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا کہ آن اور جان دونوں بچ گئیں فرمایا: رجل یھدینی السبیل۔ (یہ ایک ایسا آدمی ہے۔ جو مجھے راستہ

دکھار ہا ہے ، نبی سے بڑھ کر راستہ دکھانے والا اور کون ہوتا ہے ، یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ عرب کے ریگستانوں میں رہبر کے بغیر سفر ناممکن تھا۔

---

(۲) ایک سفر میں مدینہ کے منافق اعظم عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ہم واپس جاکر ان ذلیل مسلمانوں کو مدینہ سے نکال دیں گے ۔ حضرت زید بن ارقم نے یہ بات سُن لی ۔ آپ نے اپنے چچا سے کہہ دی اور چچا نے رسولِ خدا سے کہہ دی حضور نے ابنِ ابی کو بلا کر پوچھا ۔ تو اس نے قسم کھا کر کہا کہ یہ خبر غلط ہے ۔ چنانچہ رسول صلعم نے باور کر لیا اور زید بن ارقم کو جھوٹا قرار دیدیا ۔ زید کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ فرطِ غم سے ۔ آپ کی گردن جھک گئی ۔ گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ۔ اور اس وقت تک مسلمانوں کے سامنے نہ آئے جب تک وحی نے ان کی صداقت کا اعلان نہ کر دیا ۔

( ترمذی تفسیر سورۃ المنافقین )

---

# خوفِ قیامت

(۱) ایک مرتبہ دو صحابہ میں جائیداد کے متعلق اختلاف ہوگیا ۔ دونوں حضورؐ کی خدمت میں آئے ۔ گواہ کسی کے پاس نہیں تھا ۔ حضور نے فرمایا یاد رکھو کہ میں انسان ہوں عالم الغیب نہیں ۔ ممکن ہے ۔ کہ تم میں سے کوئی

اپنی چرب زبانی اور لسّانی کی بدولت مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہوجائے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایسا شخص جائداد کے ساتھ اپنے گلے میں آگ کا طوق بھی ڈال رہا ہوگا۔

یہ سُن کر دونوں بزرگ خوف سے لرزنے لگے۔ اور ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو وہ جائداد دینا چاہی۔ (ترمذی تفسیر سورہ حج)

---

# والدین سے محبت

حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد حضرت امام حسنؓ خلیفہ بنے تو آپ کی زوجہ محترمہ جنابہ عائشہ نے کہا۔ خلافت مبارک ہو، آپ کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہوگئیں اور برہم ہوکر فرمایا کہ تم مجھے میرے والد محترم قبلہ کی وفات پر مبارکباد دے رہی ہو۔ دُور ہوجا میری نظروں سے اور ساتھ ہی طلاق دیدی حضرت عائشہ کو بڑا صدمہ ہوا اور کچھ دیر بعد جب حضرت امام حسن نے مہر کی رقم بھیجی تو جناب عائشہ نے آہ بھر کر فرمایا۔ جُدا ہونے والے دوست کے مقابلے میں یہ رقم نہایت حقیر ہے۔

(دار قطنی۔ کتاب الطلاق)

---

# کنبہ پروری

حکومت کے کسی منصب پر ایک نااہل شخص کو محض اس لیے مقرر کرنا کہ وہ حاکم کا رشتہ دار ہے، ایک ایسی ناانصافی ہے کہ سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابل لوگ دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور حکومت نالائقوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ نالائق نہ نظم و ضبط قائم رکھ سکتے ہیں اور نہ حکومت کے کام آ سکتے ہیں، دوسری طرف قابل لوگ حکومت کے خلاف بے اطمینانی کا زہر پھیلاتے رہتے ہیں یعنی حکومت دو قسم کے دشمنوں میں گھر جاتی ہے۔ نالائق حکومت کے اندر رہ کر اس کی بنیادیں کھوکھلی کرتے ہیں اور قابل باہر رہ کر۔

(۱) حضرت عمرؓ نے وفات سے پہلے چند ایک قابل صحابہ کو خلافت کے لیے منتخب فرمایا اور ساتھ ہی وصیت فرمائی کہ میرے بیٹے عبداللہ کا خلافت میں کوئی حق نہیں۔ اس لیے کہ وہ اس کار عظیم کے لیے موزوں نہیں۔ (بخاری)

سبحان اللہ۔ انصاف و دیانت کی کتنی تابناک مثال ہے

---

(۲) حضرت عمر بڑے جوہر شناس تھے، ایک مرتبہ فرمایا۔ کاش کہ ابوعبیدہ۔ معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان جیسے آدمی مل جائیں۔ تاکہ میں انھیں سلطنت کے اہم مناصب پر مقرر کروں۔ (اسدالغابہ ج ا ص ۳۹۱)

# اولوالعزمی

اسلام کی ساری تاریخ ہماری اُلوالعزمی کی داستانوں سے لبریز ہے۔ یہاں صرف ایک خاتون کی حکایت درج کی جاتی ہے۔

(۱) جب حجاج بن یُوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف فوج کشی کی اور حضرت عبداللہ کو بچ نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ تو اپنی والدہ اسماء سے کہا کہ میں حجاج سے صُلح کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت اسمار کا چہرہ غصّے سے سرخ ہوگیا اور کڑک کر فرمانے لگیں۔

یاد رکھو عبداللہ۔ کہ عزّت کی حفاظت میں تلوار چلانا ذلّت میں کوڑے کھانے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اس بلند عزم خاتون کے اس جُملے کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عبداللہ آخری دم تک لڑتے رہے اور آخر سولی پہ چڑھ گئے۔ (استیعاب ج ا ص ۳۶۶)

---

# خواتین کا جذبہ تبلیغ واشاعت علم

اشاعت اسلام میں ہمارے آباؤ اجداد نے جو حصّہ لیا۔ اُس سے ہر لکھا پڑھا آگاہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ عہد نبوی میں ہماری مائیں بھی بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے چکی ہیں۔ یہ ایک خاتون

فاطمہ بنت خطاب کا کمال تھا کہ فاروق اعظم حلقہ بگوش اسلام بنے۔ یہ سعدی بنت کریز کی برکت تھی کہ حضرت عثمان داخل اسلام ہوئے۔ یہ حضرت اُم سلیم کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوطلحہ نے دہلیز نبوت پر سر جھکا دیا تھا۔ یہ حضرت اُم حکیم کا جذبۂ ایمانی اور حضرت اُم شریک کی مسلسل مساعی تھیں جنھوں نے سینکڑوں خواتین قریش کے سینوں میں چراغ ایمان روشن کیا تھا۔

تبلیغ کے علاوہ ہماری ماؤں کے علمی کارنامے بھی کچھ کم قابل فخر نہیں تھے حضرت عائشہ، اُم سعد، اُم سلمہ، حضرت حفصہ، اُم ہشام، اور ہند بنت اسید کو پورا قرآن شریف یاد تھا۔ بعض خواتین تفسیر قرآن کا درس دیا کرتی تھیں، حدیث کی اشاعت میں بھی صحابیات نے ممتاز حصہ لیا تھا۔ حضرت عائشہ سے ۲۲۱۰ اور اُم سلمہ سے ۳۷۸ احادیث مروی ہیں۔ اسی طرح اُم عطیہ، اسماء بنت ابوبکر، اُم ہانی اور فاطمہ بنت قیس سے کافی احادیث منقول ہیں۔

فقہی مسائل پر حضرت عائشہ کے فتووں سے کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ اُم سلمہ، حضرت حفصہ، اُم حبیبہ، حضرت فاطمہ، اُم الدرداء، عاتکہ، سہلہ، اُم شریک اور درجنوں دیگر صحابیات کے فتوے کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں۔

---

## بدگوئی سے احتراز

گذشتہ ۴۷ برس میں مجھے مسلمانوں کی ہر سوسائٹی میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا ہر جگہ میں نے تین چیزوں کو بہت بدلگام پایا۔ یعنی دل، نگاہ اور

زبان۔ یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ تہذیبِ نفس نام ہے ان تین چیزوں پر ضبط رکھنے کا، اگر دل خواہشاتِ بد سے لبریز ہو، نگاہ بد بین ہو، اور زبان بد گو ہو تو انسان اور ابلیس میں کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہتی۔ اتسنر شاہ خوارزم کے دربار میں ایک شاعر رشید وطواط رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شاعر قصیدہ پڑھ رہا تھا اور بادشاہ کے سامنے میز پر ایک دوات رکھی ہوئی تھی، چوں کہ شاعر بہت پست قد تھا اس لیے بادشاہ نے مزاحاً کہا کہ دوات ہٹا دو تاکہ شاعر نظر آتا رہے۔ رشید وطواط نے فوراً کہا: المرء باصغریہ قلبہ ولسانہ (انسان دو چھوٹی چیزوں سے بنتا ہے یعنی دل اور زبان)

سرورِ کائنات کا ارشاد ہے:

من وقاہ اللہ شر اثنتین ولج الجنۃ مابین شفتیہ ومابین رجلیہ ( موطا امام مالک )

(جس شخص کو اللہ نے دو چیزوں کے شر سے بچا دیا وہ جنت میں پہنچ گیا۔ وہ ہیں شرمگاہ اور زبان)

(۱) ایک بار رسول اللہ صلعم نے حضرت جابر بن سلیم کو چند نصیحتیں کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کسی کو برا بھلا نہ کہا کرو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد انسان تو ایک طرف میں نے اونٹ اور بکری کی نسبت بھی نا ملائم الفاظ استعمال نہیں کیے (استیعاب۔ ذکر جابر بن سلیم)

---

(۲) ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے ربیعہ اسلمی کو سخت سست کہا اور پھر

ندامت کی حالت میں ربیعہ کے پاس گئے اور فرمانے لگے کہ میں نے جو الفاظ تمھارے حق میں استعمال کیے ہیں وہی تم میرے لیے استعمال کرو۔ ربیعہ نے انکار کیا تو آپ رسول اللہ صلعم کے پاس شکایت لے گئے۔ حضور نے فرمایا کہ ربیعہ! تم نے اچھا کیا۔ اب تم ابوبکر کے لیے دعا کرو۔ جب ربیعہ نے دعا کی تو حضرت ابوبکر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

(مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۵۸)

---

(۳) کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو زبان پر مکمل قابو حاصل نہیں تھا جب کبھی کوئی ناگوار بات منہ سے نکل جاتی تو پہروں پشیمان رہتے۔ ایک مرتبہ زبان کو پکڑ کر توڑ مروڑ رہے تھے کہ اوپر سے حضرت عمرؓ آ گئے۔ پوچھا ابوبکرؓ یہ کیا کر رہے ہو فرمانے لگے کہ مجھے اس کی خبر لینے دو کہ اسی نے مجھے خراب کر رکھا ہے۔

(موطائے امام مالک کتاب الجامع)

---

# مہاجرین کیلئے انصار کا ایثار

(۱) ہجرت کے پانچ ماہ بعد حضور نے حضرت انسؓ کے مکان پر ایک میٹنگ طلب کی اور مہاجرین و انصار میں برادری قائم کر دی۔ یعنی بعض مہاجروں کو بعض انصار کا بھائی بنا دیا۔ مثلاً

(۱) حضرت جعفر ایاز (مہاجر) کو معاذ بن جبل (از انصار) کا بھائی قرار دیا
(۲) حضرت ابوبکر صدیق (مہاجر) کو خارجہ بن زبیر کا بھائی بنا دیا۔
(۳) " عمر بن خطاب " " عتبان بن مالک " " " "
(۴) " ابو عبیدہ " " سعد بن معاذ " " " "
(۵) " عبدالرحمن بن عوف " " سعد بن ربیع " " " "
(۶) " عثمان بن عفان " " اوس بن ثابت " " " "
(۷) " طلحہ بن عبیداللہ " " کعب بن مالک " " " "
(۸) " ابوذر غفاری " " منذر بن عمر " " " "
(۹) " عمار بن یاسر " " حذیفہ بن یمان " " " "
(۱۰) " سلمان فارسی " " ابوالدردا " " " "
(۱۱) " بلال حبشی " " ابورویحہ " " " وغیرہ وغیرہ

انصار نے اپنی نصف جائدادیں مہاجرین کے حوالے کرنے کا اعلان کیا لیکن رسول مقبول نے اس اسکیم سے اتفاق نہ فرمایا۔ اور فیصلہ کیا کہ مہاجرین بحیثیت مزارعین انصار کی زمینیں کاشت کریں اور پیداوار آدھی آدھی بانٹ لیں۔

(صحیح مسلم)

---

(۲) انصار نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اُن کی وفات کے بعد مہاجرین ان کی جائداد کے وارث ہوں گے چنانچہ یہ طریقہ کچھ مدت تک چلتا رہا اور جب یہ آیہ (ولکل جعلنا موالی) نازل ہوئی تو یہ طریقہ منسوخ ہوگیا۔ (صحیح بخاری)